شہید
مشرق
مظہر برلاس

میرے لئے یہ امر انتہائی مسرت انگیز اور قابلِ اطمینان ہے کہ ممتاز صحافی جناب مظہر برلاس نے ''شہید مشرق'' کے عنوان سے محترمہ بینظیر بھٹو شہید کی شخصیت اور خدمات پر مبنی ایک کتاب مرتب کی ہے۔ میں اس کتاب کی اشاعت پر جناب مظہر برلاس کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

یہ حقیقت ہماری قومی تاریخ کا نہایت شاندار اور معتبر حوالہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن اور وطن عزیز کی مقبول ترین سیاسی لیڈر محترمہ بینظیر بھٹو کو اپنی زندگی اور شہادت کے بعد ملکی اور بین الاقوامی سیاسی حلقوں میں یکساں مقبولیت اور پذیرائی حاصل رہی۔ وہ اپنی اعتدال پسندی، عوام دوستی اور حق گوئی کے باعث اپنی زندگی میں ہی دنیا بھر میں دانش، امن، جمہوریت اور مفاہمت کی علامت بن چکی تھیں۔ ان کے منفرد طرزِ احساس، اندازِ سیاست اور دُور اندیشی پر مبنی فکرِ امروز نے ایک زمانے کو متاثر کیا۔ وطنِ عزیز میں جمہوریت اور انسانی حقوق کی بحالی اور بازیابی کے لئے شہید قائد نے جو قربانیاں دیں وہ اب سیاسی حوالے سے مشعل راہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔

میں بجا طور پر توقع کرتا ہوں کہ جناب مظہر برلاس کی کتابی شکل میں یہ کاوش شہید قائد کے حوالے سے قومی و سیاسی امور کے متعدد پہلوؤں کو نمایاں اور اُجاگر کرے گی۔ اِس کتاب کی علمی افادیت کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے قارئین کے لئے نہایت فکر انگیز اور معلومات افزاء ثابت ہوگی۔ میں جناب مظہر برلاس کی مستقبل میں مزید کامیابیوں کے لئے دعا گو ہوں۔

سید یوسف رضا گیلانی

وزیر اعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان

مجھے یہ جان کر ازحد مسرت ہوئی ہے کہ شہید جمہوریت اور دختر مشرق محترمہ بے نظیر بھٹو کی حیات و شخصیت پر پاکستان کے مایہ ناز صحافی جناب مظہر برلاس کی کتاب شہیدِ مشرق منظر پر آ رہی ہے۔ تین دہائیوں پر محیط اپنی سیاسی زندگی میں محترمہ نے عوام کے حقوق، جمہوریت، آئین کی حکمرانی اور مملکت پاکستان کے وقار و خود مختاری کے لیے بیش بہا قربانیاں دیں۔ قید و بند سے لے کر جلاوطنی تک کی صعوبتیں برداشت کیں اور بالآخر اسی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ بلاشبہ دنیا کی تاریخ میں کسی ایک شخصیت نے مٹی کی محبت میں اتنا خراج کبھی ادا نہیں کیا۔ یوں محترمہ اپنی شہادت میں امر ہو کر پاکستان کی داستان کا ایک درخشاں باب بن چکی ہیں۔ اس باب کو ضبط تحریر میں لا کر آنے والی نسلوں تک بطریق احسن پہنچانا ایک قومی فریضہ اور وقت کا قرض ہے۔

جناب مظہر برلاس عہد حاضر کی صحافت کا نمایاں نام ہیں اور ملکی سیاست کے کئی اہم واقعات کے گواہ بھی۔ اس لیے ان کی تصنیف سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب شعبہ درس و تدریس اور تحقیق سے وابستہ افراد اور نئی نسل کے لیے معلومات کا مفید اور مستند ذریعہ ثابت ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ راہ حق میں دی جانے والی قربانیوں کی یہ داستان پڑھنے والوں کے لیے چشم کشا ثابت ہوگی اور وطن عزیز میں جمہوریت کے استحکام اور فروغ کے لیے انتہائی معاون اور مفید ہوگی۔

ڈاکٹر فہمیدہ مرزا

سپیکر قومی اسمبلی

ساگر پبلشرز

فرسٹ فلور 30 الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ 40 اردو بازار لاہور۔ Ph:042-7230423

برادرم

اسد اللہ غالب

کی خدمت اقدس

میں،

بڑے خلوص کے ساتھ

20-6-2009

شہید مشرق

مظہر برلاس

ساگر پبلشرز

فرسٹ فلور 30 الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ 40 / اردو بازار، لاہور

فون:۔ 042-7230423

انتساب

بلاول بھٹو زرداری کے نام

جو پاکستان کے مستقبل کی آس ہے

اے عظیم کبریا
سن غریب کی دعا
سازشوں میں گھِر گئی
بنت ارض ایشیاء
لشکر یزید میں
اک کنیز کربلا
فیصلے کی منتظر
اک یتیم بے خطا
ٹال سب مصیبتیں
ہے دعا ترے حضور
واسطہ حسینؓ کا
توڑ ظلم کا غرور
یا اللہ یا رسولؐ
بے نظیر بے قصور

محسن نقوی

فہرست

عرض ناشر 13

شہید مشرق ہی کیوں؟ 15

قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو 19

محترمہ بے نظیر بھٹو 33

ایم آر ڈی کی تشکیل 55

وطن واپسی 67

شہید بے نظیر بھٹو کی سوانح حیات ''دختر مشرق'' سے چند اقتباسات

جنرل ضیاء مودودی کے بہت قریب تھے 84

پھولوں کے گملے میں بم 87

مجھے نئی انٹیلی جنس بنانے کی تجویز دی گئی 87

جب رمزی کو مجھے قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا 90

جنرل مشرف میرے سوالوں سے گھبرا گئے 93

میر مرتضیٰ کو پولیس فائرنگ کے ذریعے قتل کیا 96

ہمارا خاندان دنیا میں قربانیاں دینے کے لیے آیا 101

محترمہ غیر سیاسی انداز میں 102

محترمہ شہید سے طویل ترین ملاقات 110

بی بی کی اہل فکر وفن سے محبت 112

نوابزادہ کا حقہ اور حکومتی پریشانی! 112

شگفتہ جمانی کی زبانی 114

''ہنسی مذاق''	116
قمر زمان کائرہ کا کمرہ	117
حاکم علی زرداری کا حوصلہ	117
مشکل حالات اور سینٹرل انفارمیشن بیورو	118
محترمہ بے نظیر بھٹو اور سیاسی خواتین	119
تین خواتین سیکرٹری اطلاعات	120
فوزیہ وہاب اور یوسف رضا گیلانی	120
۔۔۔اور شاہراہ دستور میدان جنگ بن گئی	121
پولی کلینک میں خفیہ ملاقاتیں	123
عوامی رنگ اور محترمہ کی بہادری	124
صرف ایک کیمرہ	125
پارلیمنٹ ہاؤس کی یادگار تقریب	125
محترمہ کا سٹنگ پلان	127
قصہ بہن بھائی کا......!	127
بے نظیر بھٹو شہید اور امام ضامن	128
توقیر کائرہ سے آخری ملاقات	129
خون میں ڈوبا ہوا پاکستان!	129
مسافتِ زیست کے دکھ	132
تجھ کو گلاب جیسا کفن کون دے گیا	133
قاتل کون؟	137
یوسف رضا گیلانی وزیراعظم کیسے بنے......؟	141

''وہ رات'' 143
سیاست کا پی ایچ ڈی۔ آصف علی زرداری 143

شہادت پر لکھے گئے کالموں سے انتخاب

محترمہ سے مرحومہ تک!: اسد اللہ غالب 147
نوحہ: اسد مصطفیٰ 151
جمہوریت کی شام غریباں: اسلم کھوکھر 153
اناللہ وانا الیہ راجعون اطہر مسعود 156
وہ ایک ماں بھی تھی: آسناتھ کنول 161
بھٹو خاندان اور مرنے کی خواہش! آفتاب اقبال 165
ایک عہد کا خاتمہ: امتیاز عالم 169
شہید جمہوریت......الوداع: برانوین میڈوکس 173
جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے: بشریٰ اعجاز 177
سر دادنہ داد دست در دست یزید تنویر قیصر شاہد 184
آخری موقع: جاوید چوہدری 185
آخری ملاقات: حامد میر 190
جانشین؟: حسن نثار 194
بے نظیر اور ان کے بدخواہ: خالد حسن 197
ENOUGE IS ENOUGH خالد مسعود خان 201
پاکستان کی بیٹی: خورشید ندیم 206
شہادت کا سرخ دوشالہ: زاہدہ حنا 210
بے نظیر کی المناک موت، نئے چیلنج اور

سیاسی قیادت کی ذمہ داریاں:	ڈاکٹر صفدر محمود	215
بھٹو ہاؤس سے بینظیر کی رخصتی:	صوفیہ بیدار	220
عسکری قیادت کا اظہار تعزیت:	صولت رضا بریگیڈیئر (ر)	224
ایک اور بھٹو:	طاہر سرور میر	229
عجب اک سانحہ یاں ہو گیا ہے!:	ظفر اقبال	232
شہید کو گلاب پسند تھے۔ آؤ باغ کی حفاظت کریں	عامر لیاقت حسین (ڈاکٹر)	235
کہانی ختم:	عباس اطہر	239
جو چلے تو جاں سے گزر گئے:	عبدالقادر حسن	242
کس کی زنجیر ہلائیں......!	عرفان صدیقی	245
محترمہ کی شہادت کا خون بہا:	عطاالحق قاسمی	249
بے نظیر زندگی بے نظیر موت:	فاطمہ احمد	252
وفاق پاکستان کی ''بے نظیر علامت''	مجیب الرحمٰن شامی	254
شہید بے نظیر بھٹو	محمد اجمل نیازی (ڈاکٹر)	257
الوداع گلاب پوش بی بی:	کشور ناہید	261
اور زنجیر ٹوٹ گئی:	محمد عامر خاکوانی	264
بہادر خاتون ایک عظیم لیڈر:	محمد یٰسین وٹو	268
بے نظیر بھٹو 1970 سے 2007 تک کچھ یادیں:	محمود شام	272
دختر مشرق کی ناگہانی موت:	مرزا اسلم بیگ، جنرل (ر)	277
بینظیر بھٹو کو کس نے مارا؟	مسعود اشعر	280
کیا ہم افورڈ کر سکتے ہیں۔	ملک ریاض حسین	284
موت کا معمہ:	منصور آفاق	288

ہاں یہ تو میں جانتی ہوں	منو بھائی	292
بے نظیر کے بعد:	نجم سیٹھی	295
کچھ سوکھے ہوئے آنسو:	نذیر ناجی	298
حادثہ:	ہارون الرشید	302

شہادت پر کہی گئی نظموں سے انتخاب

وہ جی رہی ہے۔	رخسانہ نور	305
عروسِ جمہور	ریاض الرحمٰن ساغر	306
یہ چراغ کس نے بجھا دیا:	شاہدہ حسن	308
بے نظیر کی نذر۔	صفدر سلیم سیال	310
وہ ماں تھی، بہن اور بیٹی تھی۔	عمرانہ مشتاق	312
ایسے بہنوں کو تو رخصت نہیں کرتے بھائی:	محمود شام	316
سانحہ:	نورین طلعت عروبہ	318
ہم ایسے لوگ ہیں۔	نیلما ناہید درانی	319

عرضِ ناشر

کسی ملک کی ترقی اس کے سیاسی استحکام میں ہوتی ہے جس کے لیے عوام میں سیاسی شعور اور بصیرت کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ایسا علمی مواد جو عوام میں یہ شعور بیدار کرے ان میں سیاسی سوچ اور سوجھ بوجھ پیدا کرے تاکہ وہ اپنے لیے صحیح لیڈر شپ کا انتخاب کر سکیں ادارہ ساگر پبلشرز کا ہمیشہ سے مطمع نظر رہا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''شہید مشرق'' اسی سلسلے کی کڑی ہے اسے محترم جناب مظہر برلاس صاحب نے ترتیب دیا ہے جو کہنہ مشق صحافی، صاحب طرز قلمکار اور معروف ٹی وی اینکر پرسن ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے لیے ان کی بڑی قربانیاں ہیں اپنی پارٹی سے ان کی محبت اور قائد سے عقیدت کا اندازہ اس کتاب کو پڑھنے سے ہوگا۔

یہ کتاب محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت پر لکھی گئی نظموں اور کالموں کا بہترین انتخاب ہے۔ ساتھ ساتھ مصنف نے اپنے احساسات جذبات، مشاہدات اور تجربات کو بھی لفظوں کا روپ دیا ہے بلاشبہ یہ محترمہ بینظیر بھٹو کی زندگی پر ایک تاریخی دستاویز ہے۔

امید ہے پہلے کی طرح ہماری یہ تازہ کاوش بھی آپ کو پسند آئے گی۔ آپ کی توجہ حاصل کرے گی اور آپ اسے سراہیں گے اللہ تعالیٰ پاکستان اور ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

ادارہ

شہید مشرق ہی کیوں؟

مجھے اپنے بارے میں باتیں کرنا کبھی بھی اچھا نہیں لگا آج مجبوریوں کی مسافت میں کچھ کہنے لگا ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میں اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور فیض کی دھرتی پر پیدا ہوا۔ سو میں اپنے جنم کے ساتھ ہی لفظوں کے ساتھ جڑ گیا۔ میری زندگی کی کئی بارشیں شہر اقبال میں برسیں۔ میری ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ میٹرک کے بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا اور پھر یہیں چھ برس گزر گئے۔

میں بچپن میں بہت شرارتی تھا بلکہ میرے بزرگ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں شرارتی بچوں کا استاد ہوں۔ میں کھیلتا بھی بہت تھا سکول کے زمانے میں بزمِ ادب کا ہمیشہ سیکرٹری یا صدر بنتا۔ میں نے بچپن میں اپنی والدہ کی بہت خدمت کی اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اب بھی میری والدہ مرحومہ کی دعائیں میرے ارد گرد رہتی ہیں کہ

خوف آیا نہیں سانپوں کے گھنے جنگل میں
مجھ کو محفوظ مری ماں کی دعا نے رکھا

چونکہ میں تیموری النسل ہوں اور میرا تعلق مغلوں کے شاہی قبیلے برلاس سے ہے لہٰذا مجھے فارسی اور اردو سے خاص رغبت تھی اگرچہ میری مادری زبان پنجابی ہے مگر میں سرائیکی روانی سے بولتا ہوں، انگریزی بولتا ہوں۔ سندھی اور پشتو میں حال چال پوچھ لیتا ہوں۔

میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں چھ سال بہت متحرک گزارے۔ وہاں مختلف سوسائٹیوں کا عہدیدار رہا۔ خاص طور پر مجلس اقبالؒ، مجلس صوفی تبسم اور پنجابی مجلس قابل

ذکر ہیں ''راوی'' کی مجلس ادارت میں شمولیت اور گورنمنٹ کالج گزٹ میں کالم لکھنا میرے لیے اعزاز سے کم نہیں۔ اس دوران شاعری بھی ہوتی رہی اور میں لاہور ریڈیو سے نوجوانوں کا پروگرام بزم طلبا بھی کرتا رہا۔ سچ پوچھئے تو گورنمنٹ کالج لاہور نے میری زندگی میں نہ صرف اعتماد بلکہ نکھار پیدا کیا۔ آج میں جس مقام پر ہوں اس میں گورنمنٹ کالج لاہور کی تربیت کا بڑا ثر ہے مجھے ''راوین'' ہونے پر فخر ہے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے روزنامہ مشرق لاہور سے صحافت کا آغاز کیا۔ مجھے راتوں کو جاگنے کی عادت کالج ہوسٹل سے تھی سو مجھے اخباری دنیا میں بڑا لطف آیا۔ ویسے بھی لاہور کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں سے میری دوستیاں زمانہ طالبعلمی سے قائم ہوگئی تھیں سو مجھے صحافت میں زیادہ مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں لاہور میں بہت مصروف رہتا تھا چونکہ میں صوفی ازم کا ماننے والا ہوں اس لئے میرا اکثر صاحب دل درویشوں کے پاس جانا ہوتا ہے میں نے اسلام آباد کا رخ ایک صاحب دل کے کہنے پر ہی کیا یہاں آ کر سب سے پہلے امام بری رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی اور میں ہنوز اسی صاحب ثروت ولی کی نگری میں آباد ہوں۔ اسلام آباد میں روزنامہ اساس، روزنامہ جنگ اور پھر روزنامہ اوصاف

میں نے ان تمام مصروفیات کے باوجود اپنے ادبی ذوق کو نہیں چھوڑا۔اب بھی ریڈیو ٹی وی پر مشاعرے پڑھتا ہوں۔کئی گلوکاروں کے لیے گیت لکھتا ہوں۔کچھ عرصہ پہلے تک میں ہر ہفتے اڈیالہ جیل جا کر مخدوم جاوید ہاشمی اور سید یوسف رضا گیلانی کی کتابوں کی نوک پلک درست کرتا تھا۔سید یوسف رضا گیلانی نے اپنی کتاب ''چاہ یوسف سے صدا'' میں میرا تذکرہ بھی کیا ہے۔محترمہ بے نظیر بھٹو سے میری خاص عقیدت ہے بھٹو کی سیاست سے محبت ہے آصف علی زرداری کی بہادری کا قائل ہوں اور بلاول بھٹو زرداری کی صورت میں خوبصورت مستقبل دیکھ رہا ہوں۔میں نے ہمیشہ محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی جدوجہد کو سلام کیا ہے ان سے میری ملاقاتیں بھی تھیں۔

میری زیادہ دوستیاں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کے اندر ہیں اگر چہ جمہوریت کی جدوجہد میں مسلم لیگ (ن) کا بھی ساتھ تھا مگر بے نظیر بھٹو کی قربانی نے اس جمہوری جدوجہد کو لازوال روپ عطا کیا۔ان کی شہادت پر ہر طرف سے آنسوؤں کی بارش ہوئی، ان کی قربانی نے انہیں امر کر دیا۔ان کی موت پر ایسے لگا جیسے دنیا اجڑ گئی ہو۔دنیا بھر کے لکھنے والوں نے انہیں لفظوں کے ذریعے خراج عقیدت پیش کیا میں آپ کی خدمت میں ان لکھنے والوں کی نظمیں، کالم، کچھ اپنے تجربات اور کچھ اپنی طرف سے لفظوں کا گلدستہ ''شہید مشرق'' کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔چونکہ محترمہ دختر مشرق تھیں میں سمجھتا ہوں کہ شہادت کے بعد وہ ''شہید مشرق'' ہیں۔

اس کتاب کے آغازِ سفر سے اب تک میں اپنے دوستوں محمد منصور آفاق، اسد مصطفیٰ، ظفر شاہد، فرخ نواز، رضوان منصور اور طارق عزیز کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ہر مرحلے پر میرا ساتھ نبھایا۔خاص طور پر اسد مصطفیٰ نے بہت کام کیا۔

میں اپنے دوست اور دکھ سکھ کے ساتھی ڈاکٹر قیوم سومرو کا خصوصی طور پر شکر گزار ہوں، ہم دونوں کم سونے والے جب جی چاہے ایک دوسرے سے مل لیتے ہیں ویسے بھی ڈاکٹر قیوم سومرو ''وفا'' کی علامت ہے۔

میں سید عمران گردیزی، فوزیہ حبیب اور طالب جاوید حسین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے بہت تعاون کیا۔

پچھلے برس دو دوستوں صغریٰ صدف اور نواز کھرل کی کتابیں نظر سے گزری تھیں، اب کے برس میں بی بی کی سالگرہ پر لفظوں کے تازہ پھول سرخ گلابوں کی صورت میں لا رہا ہوں، میرے گلدستے پہ لکھا ہے ''شہید مشرق'' میں اپنی دو صحافی دوستوں ناصرہ زبیری اور نغمہ شعیب کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں ان کا تعاون میرے شامل حال رہا۔

اس کتاب کا نصف سے زیادہ پروف میری ہمشیرہ فرحانہ برلاس نے پڑھا جو محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی پیروکار ہیں باقی پروف میرے دوست اور شاگردِ عزیز آفتاب چوہدری نے پڑھا میں ان کا شکر گزار ہوں۔

برادر عزیز عمار برلاس اور میرے پی ایس محمد شہباز نے دن رات جاگ کر چیزوں کی فراہمی کو یقینی بنایا اور سب سے بڑھ کر مجھے سید عثمان ہاشمی کی رہنمائی حاصل رہی۔

کتاب کی اشاعت کو ممکن بنانے کے لیے پیر محمد امین الحسنات شاہ آف بھیرہ شریف کے بھائی پیرزادہ محمد ابراہیم شاہ کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ میں زندگی کے ان تمام ساتھیوں کا شکر گزار ہوں جو زندگی کی بھیگتی بارش میں، کبھی ساحلوں پر تیز آندھیوں میں، کبھی تاریک راہوں میں، کبھی روشنیوں کے سفیر بن کر اور کبھی زندگی کے کٹھن مراحل میں میرے ساتھ رہے، شکریہ ان کا بھی جن کا تذکرہ یہاں نہیں ہو سکا ''شہید مشرق'' کی صورت میں لفظوں کا خراج پیش خدمت ہے کہ

یہ الگ بات کہ کچھ بھی نہیں لکھا میں نے
لفظ لکھوں تو زمانہ مرے درشن مانگے

مظہر برلاس

رات کے اختتام پر نئی صبح کے ساتھ

فون نمبر: 0300-8550186, 0321-8550186 24 مئی 2009

قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو

بڑے القابات کے بانسوں پر چڑھا رکھا تھا مگر ان کی حیثیت یہ تھی کہ منصفانہ انتخابات میں بمشکل اپنی ایک سیٹ حاصل کر سکتے تھے۔ حالانکہ حقیقی لیڈر وہ ہوتا ہے۔ جو قوم کا اجتماعی ضمیر ہو اور اس کی پارٹی اتنی مقبول ہوتی ہے کہ وہ جس آدمی کو ٹکٹ دے دے، عوام اس آدمی کو نہیں دیکھتے۔ اس کے ٹکٹ کو دیکھتے ہیں اور اس کے سر پر کامرانی اور فیروزمندی کا تاج رکھ دیتے ہیں جن لوگوں نے تحریک پاکستان کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ مسلم لیگ نے جب قائداعظم کی مسلم لیگ کا نام پایا تو یہ صورتِ حال ہوگئی کہ اخبارات نے سرخیاں جمائیں ''قائداعظم نے اگر بجلی کے کھمبے کو بھی ٹکٹ دے دیا تو وہ بھی کامیاب ہو گیا'' اور یہ صرف اخبارات کی سرخیاں نہیں تھیں عملاً بھی ایسا ہوا تھا۔ بالکل یہی صورت پاکستان پیپلز پارٹی کی تھی۔ بھٹو نے جسے ٹکٹ دے دیا وہ کامیاب ہو گیا۔ میاں عطاء اللہ سہگلوں کی ملوں کا ایک مزدور تھا۔ اسے ملوں کے مالک رفیق سہگل کے مقابلے میں پیپلز پارٹی نے ٹکٹ دے دیا۔ سہگل کے ساتھ دولت کی ریل پیل تھی، امارت کی چمک دمک تھی اس پر مستزاد یہ کہ بہت سے علماء اور مشائخ اس کے ساتھ تھے، یہ وہ لوگ تھے جو پیپلز پارٹی کو کافروں کی پارٹی کہتے تھے مگر عوام نے یہ سب کچھ مسترد کر دیا اور میاں عطاء اللہ کو کامیاب کرایا۔ یہ مقبولیت کی ایک خاص حد تک اور قائداعظم کی مسلم لیگ کے ایک مخصوص وقت تک کی مماثلت ہم نے بیان کی ہے ورنہ مسلم لیگ کا پیپلز پارٹی سے کیا مقابلہ؟ مسلم لیگ جاگیرداروں کی جماعت تھی جس کے متعلق خود قائداعظم کو بڑے افسوس سے کہنا پڑا تھا ''میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں'' اور دنیا نے دیکھ لیا کہ قائداعظم کے آنکھیں بند کرنے کی دیر تھی کہ مسلم لیگ کے جاگیرداروں میں جنگِ زرگری شروع ہوگئی اور یہ ٹکڑوں میں بٹتی چلی گئی اور اتنے ٹکڑوں میں بٹی کہ حروف تہجی کم پڑنے لگے۔ اس کے مقابلے میں پیپلز پارٹی بنیادی طور پر مزدوروں، کسانوں غریب ریڑھی بانوں، تانگے والوں، چھابڑی والوں، ٹرانسپورٹ ڈرائیوروں، دانشوروں اور ہوشمند طالب علموں کی جماعت تھی اس لیے وہ آج بھی زندہ و پائندہ ہے۔ جو اس سے الگ ہوا وہ بے نام ونشان ہو گیا۔ اس کے اندر تھا تو کوئی پہاڑ تھا مگر وہ اپنی جسامت

کے زعمِ باطل میں مبتلا ہو کر الگ ہوا تو ذرہ ءِ بے مقدار ہو گیا۔ کتنے ممتاز بھٹو، کتنے جتوئی اور کتنے غلام مصطفیٰ کھر ابتلاء کے زمانے میں پیپلز پارٹی چھوڑ گئے اور اسٹیبلشمنٹ کی ملی بھگت سے اپنی پارٹی بنانے کی کوشش کی۔ انہیں وہم تھا اور اسٹیبلشمنٹ بھی اسی گمانِ باطل میں مبتلا تھی کہ ان لوگوں کے الگ ہو جانے سے پیپلز پارٹی ختم ہو جائے گی مگر پیپلز پارٹی اور زیادہ مضبوط و مستحکم ہوئی اور الگ ہونے والے زعماء کو تاریخ نے لپیٹ کر طاقِ نسیاں میں پھینک دیا۔ اس طرح اقبال کی وہ بات پوری ہوئی کہ

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

غرض یہ کہ قائدِ عوام کی بنائی ہوئی پارٹی ہر لحاظ سے ایک منفرد پارٹی ہے جس کی جڑیں عوام میں ہیں اور عوام ہی کو اس نے قوت کا سرچشمہ قرار دے رکھا ہے۔ عوام پیپلز پارٹی کے منشور کے دلدادہ ہیں اور عوام ہی کے پاس وہ دل ہوتے ہیں جن میں بے وفائی کے جذبات کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ پیپلز پارٹی کی جڑیں چاروں صوبوں میں ہیں اور یہ پاکستان کو متحد رکھنے کی ضامن جماعت ہے۔

بہر حال عوام قائدِ عوام کی قیادت میں متحد ہوئے اور یحییٰ دور میں الیکشن ہوئے۔ ان میں مغربی پاکستان کی حد تک پیپلز پارٹی کو بھرپور پذیرائی ملی۔ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ تمام سیٹیں لے گئی۔ فوجی حکومت نے غلط فیصلہ کیا اور مشرقی پاکستان میں فوج بھیج دی بڑی تباہی ہوئی ہندوستان نے بھی تمام بین الاقوامی قوانین کو نظر انداز کرتے ہوئے جارحیت کی۔ پاکستان کے اندرونی معاملات میں ننگی مداخلت کی اور اپنی فوجیں بھیج دیں۔ پاکستان کو شرمناک حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستانی فوج نے بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ پاکستان کے 90 ہزار فوجی اور دیگر اہل کار جنگی قیدی بنا کر بھارتی افواج بھارت لے گئیں۔ اب پاکستان ٹوٹا پھوٹا ڈھانچہ تھا۔ اس کے نوے ہزار افراد جنگی قیدی بنے بھارت میں پڑے تھے اور مصائب کی زد میں

تھے ان کے خاندان کے افراد یہاں کرب کی زندگی گزار رہے تھے اور تڑپ رہے تھے۔ پاکستان کی معیشت تباہ ہو چکی تھی اس کا کوئی ادارہ مکمل حالت میں نہیں تھا اور اس کا نظم ونسق برقرار نہیں تھا۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں ملک کی باگ ڈور قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کو تھمادی اور پیپلز پارٹی کو ایک خستہ، شکستہ، درماندہ اور شکست خوردہ پاکستان کی حکومت ملی جس میں حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے اور ادارے اس حد تک برباد ہو چکے تھے کہ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں پولیس نے ہڑتال کر دی، حالانکہ پولیس لازمی سروس ہوتی ہے۔ یہ لوگ چوبیس گھنٹے کے ملازم ہوتے ہیں جب یہی لوگ کام چھوڑ دیں تو امن وامان کی کیا حالت ہوگی۔ اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ کوئی اور پارٹی ہوتی تو شاید فوج بلالیتی مگر فوج بھی کیا کرتی؟ عوام تو فوج کی مشرقی پاکستان میں شرمناک شکست پر فوج سے بددل تھے وہ یہاں فوج کو پاتے تو شاید اس پر ٹوٹ پڑتے۔ اس طرح خانہ جنگی شروع ہو جاتی پھر یہ کہ وہ فوج جس کے حوصلے ٹوٹے ہوئے تھے۔ وہ آتی ہی کیوں؟ اس موقع پر جب حالات کی سنگینی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی عوام کی قوت ہی کام آسکتی تھی اور پنجاب کے گورنر غلام مصطفیٰ کھر نے قائد عوام سے مشورہ کر کے ریڈیو پر تقریر کی کہ اگر چوبیس گھنٹوں تک ہڑتالی ملازمین کام پر واپس نہ آئے تو پیپلز پارٹی کے ورکر آگے بڑھ کر ان کی ڈیوٹیاں سنبھال لیں گے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کی ضلعی تنظیموں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے کارکنوں کو تیار رکھیں تاکہ وہ حکم ملتے ہی اپنے فرائض سنبھال لیں۔ یہ تقریر بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ پولیس والوں کو اچھی طرح علم تھا کہ یہ صرف دھمکی نہیں بلکہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں میں بلا کا نظم وضبط ہے اور ان میں بہت زیادہ صلاحیتیں ہیں۔ وہ یقیناً ایسا کر گزریں گے، اس لیے پنجاب بھر میں پولیس نے ہڑتال ختم کر دی۔ قائد عوام کے لیے بہت بڑا مسئلہ جنگی قیدیوں کی واپسی تھا۔ ساری دنیا سمجھتی تھی کہ بھارتی حکومت، اگر قیدی واپس کرنے پر تیار ہو بھی گئی تو وہ تقریباً تین سال تک پاکستانی جنگی قیدیوں کے خوراک لباس اور صحت کے اخراجات برداشت کرتی رہی ہے اور یہ اخراجات طلب کرے گی اور اس کا یہ مطالبہ بین الاقوامی جنگی قوانین کے

مطابق بالکل درست ہوگا۔ وہ پاکستان جو پہلے ہی خستہ ہے اور جس کی معیشت دیوالیہ ہو رہی ہے وہ یہ اخراجات پورے نہیں کر سکے گا اور پیپلز پارٹی کی حکومت اپنی تشکیل و تعمیر کے ابتدائی دنوں میں ہی اپنی شکست کی صدائے شکستگی بن جائے گی مگر دنیا کے لوگوں کو قائدعوام کے تدبر اور دانش کا اندازہ نہیں تھا۔ قائدعوام اپنے ذہن میں پروگرام ترتیب دے چکے تھے اور تمام تدبیریں سوچ چکے تھے وہ اپنے چند احباب کو ساتھ لے کر بھارت پہنچے۔ اس سفر میں ان کی پیاری بیٹی بے نظیر بھٹو بھی ان کے ہمراہ تھیں قائدعوام کی بھارت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملاقات ہوئی اور قائدعوام نے مذاکرات کی میز پر اپنی جنگ جیت لی ان کی گفتگو منطق اور دلیل و برہان سے آراستہ تھی۔ انہوں نے اندرا گاندھی کو قائل کر لیا اور وہ کسی طرح کے اخراجات کا مطالبہ کئے بغیر تمام جنگی قیدیوں کو رہا کرنے پر آمادہ ہو گئیں یوں قائدعوام اس سفر سے مظفر و کامران واپس آئے اور ان کی مدبرانہ کوششوں کے نتیجہ میں نوے ہزار جنگی قیدی بھی اپنے ملک میں لوٹ آئے اور ان کے خاندان شاد ہو گئے اور مدت سے اجڑے ہوئے ویران گھر آباد ہو گئے۔ معیشت بھی تباہ حال تھی اسے بھی سہارا دیا گیا فوج کے ٹوٹے ہوئے حوصلے کی از سرِ نو تعمیر ہوئی اور دنیا میں پاکستان کا ایک آزاد، خود مختار اور عظمت مآب ملک کی حیثیت سے وقار بحال ہوا۔

پاکستان اس وقت مسائلستان تھا۔ اندرونی اور بیرونی طور پر کئی خوفناک مسائل سر اٹھائے کھڑے تھے۔ قائدعوام ان سب مسائل سے چومکھی لڑائی لڑتے رہے اور ان پر قابو پاتے رہے۔ ایک شکست خوردہ فوج اور ایک ہاری ہوئی قوم کو اس کی کھوئی ہوئی عظمتیں واپس دلانا بجائے خویش بہت بڑے مسائل تھے مگر قائدعوام نے اپنی انتھک جدوجہد سے یہ سب کچھ ممکن بنا دیا۔ پاکستان پر ہر طرح سے امریکہ کا تسلط تھا اس کی معیشت اور اس کی سیاست حکمرانوں نے امریکہ کے ہاں گروی رکھی ہوئی تھی یہ اپنی ترقی کا کوئی پلان امریکہ کی منظوری کے بغیر سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اس طرف بھی توجہ دی اور اسلامی سربراہی کانفرس لاہور کے تاریخی شہر میں منعقد کرائی۔ یہ شہر بھی تاریخی تھا اور یہ

کانفرنس بھی تاریخی تھی کیونکہ اس میں شاہ فیصل، کرنل معمر قذافی اور دوسرے تمام اسلامی ملکوں کے وہ سربراہ شریک ہوئے جن کی شخصیتیں تاریخ ساز تھیں۔ اس کانفرنس میں قائد عوام نے سامراج مخالف موضوعات پر فوکس رکھا اور ایسی شاندار تجاویز پیش کیں جو اسلامی ممالک کے لیے مقدر ساز تھیں۔ اسی کانفرنس میں طے پایا کہ اسلامی بلاک بنایا جائے تاکہ ہم میں سے کوئی ملک سامراجی ممالک کا محتاج نہ رہے اور اگر کسی اسلامی ملک پر کوئی مشکل وقت آ پڑے تو تمام اسلامی ممالک کا متحدہ بلاک اس کی مدد کو دوڑ پڑے۔ ایسی تجاویز بھی پاس ہوئیں جن میں طے کیا گیا کہ اسلامی بلاک موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق زیادہ سے زیادہ طاقتور ہو تاکہ بین الاقوامی سپر پاورز کسی اسلامی ملک کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکیں۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی عظیم تجاویز پاس ہوئیں اور تمام اسلامی ممالک اس نتیجہ پر پہنچے کہ پاکستان ہی کو اسلامی بلاک کا قلعہ سمجھا جائے اور اسلامی بلاک کی قیادت ذوالفقار علی بھٹو کے سپرد کی جائے۔ وہ ملک جس کو ابھی ماضی قریب میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اور جس کا آدھا دھڑ کاٹ دیا گیا تھا اسے چند ہی مہینوں میں اس قابل بنا دینا کہ وہ عالم اسلام کی قیادت کا اہل سمجھا جائے۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کی معجزہ نمائی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے وضاحت کی کہ مسلمان ممالک میں تیل کی صورت میں سیال سونے کے سمندر ہیں۔ سامراجی ممالک کے بینک مسلمانوں کی جمع کردہ دولت سے ہی چل رہے ہیں۔ اس لیے اسلامی بلاک کے لیے الگ سے اسلامی بینک ہو یہ اور اس طرح کی کئی تجاویز طے ہوئیں۔ یہ اسلامی سربراہی کانفرنس فی الواقع ایک بڑا دھماکہ تھا۔ اس سے سامراجی ممالک کے دل دہل گئے۔ اسلامی سربراہی کانفرنس اس سے پہلے بھی ہوئی تھی اور قائد عوام کے بعد بھی ہوتی رہیں مگر وہ سب ''نشستند و گفتند و برخاستند'' تک محدود رہیں۔ انہیں بین الاقوامی میڈیا کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا یہی کہا جاتا تھا کہ یہ چوہوں کی وہی کانفرنسیں ہیں جو بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی ناممکن تجویزیں پاس کرتی ہیں اور پھر آپس کے اختلاف پر ختم ہو جاتی ہیں مگر یہ کانفرنس منفرد قسم کی کانفرنس تھی جس میں ٹھوس فیصلے کیے گئے اور سب سے بڑی بات

یہ کہ اسلامی بلاک ذوالفقار علی بھٹو جیسے آدمی کو اپنی قیادت سونپ رہا تھا اور سامراجی جانتے تھے کہ بھٹو عمل پسند تھا وہ صرف گفتار کا نہیں کردار کا بھی غازی تھا۔ اس نے حال ہی میں اپنے ٹوٹے پھوٹے ملک کو ہر لحاظ سے باوقار بنایا اور سب سے بڑی بات یہ کہ عملیت پسند آدمی سامراج دشمن خیالات رکھتا تھا اور اس نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کیا تھا۔ اس لیے اس اسلامی سربراہی کانفرنس نے سامراجی ممالک کے کان کھڑے کر دیئے۔ بین الاقوامی میڈیا چونک اٹھا۔ بڑے بڑے تھنک ٹینک سر جوڑ کر بیٹھ گئے لمبے لمبے مقالے لکھے جانے لگے کہ مزدکیت فتنہء فردا نہیں اسلام ہے۔ پاکستان کو عالمِ اسلام کا قلعہ کس طرح بنایا جا سکتا ہے؟ اب یہ سوال اتحاد عالمِ اسلامی کے قائد ذوالفقار علی بھٹو کے سامنے تھا۔ اس کا آج کے دور میں صرف ایک جواب تھا اور وہ یہ کہ پاکستان کو ایٹمی قوت بنایا جائے۔ کسی جارحیت کے لیے نہیں بلکہ اپنی حفاظت کے لیے۔ پاکستان کا پڑوسی بھارت آدھا ملک کاٹ چکا تھا۔ دونوں ملکوں کے درمیان کشمیر کا مسئلہ ایک سلگتا ہوا انگارہ تھا جو کسی وقت بھی ماحول کو شعلہ بداماں بنا سکتا تھا اور پھر یہ کہ بھارت ایٹمی قوت بننے کے لیے اپنے وسائل کی پوری قوت صرف کرر ہا تھا۔ دو آدمی آمنے سامنے ہوں اور دونوں مسلح ہوں تو تصادم کی صورت پیدا کرنے کے لیے بہت کچھ سوچنا اور سمجھنا ہوتا ہے لیکن اگر ایک آدمی مسلح ہو اور دوسرا نہتا تو طاقتور کا غصہ سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے اور دوسرا آنِ واحد میں بھسم ہو جاتا ہے یہی سوچ کر قائدعوام نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کو ایٹمی قوت بنایا جائے۔ انہوں نے انتہائی راز داری سے اس مسئلہ پر غور و فکر کیا اور انہیں ایک راستہ نظر آ گیا۔ بڑے خفیہ طریقے سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو پاکستان لائے اور ایٹمی پروگرام کا آغاز کر دیا۔ جلد ہی فرانس سے پلانٹ لے لیا گیا۔ امریکہ کو علم ہو گیا اس نے حکم دیا کہ ایٹمی پروگرام روک دیا جائے، نہیں تو اس کے سخت نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ امداد بھی روک لی جائے گی اور تمام ممالک کو کہہ دیا جائے گا کہ وہ پاکستان سے اقتصادی مقاطعہ کر لیں۔ اس طرح پاکستانی ہر طرح کی درآمد و برآمد سے محروم ہو کر بھوکا مر جائیں گے۔ ان دھمکیوں کے جواب میں قائدعوام نے سینہ تان کر کہا

"کسی مقاطعہ کی کوئی پروا نہیں سب کچھ روک لو ہم گھاس کھا لیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے" یہ دلیرانہ جواب امریکہ اور دیگر سامراجی ممالک کے منہ پر تھپڑ تھا۔ وہ یہ گستاخی برداشت نہ کر سکے۔ امریکہ کے وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے کہا" بھٹو ہماری بات مان لو نہیں تو تمہیں عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا" قائدِ عوام نے کہا" میں ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں میں مر جاؤں گا لیکن اپنے ملک کے عوام اور ملک کی تاریخ کے ساتھ غداری نہیں کروں گا۔ ایٹم ہماری ضرورت ہے ہم کسی جارحیت کے لیے نہیں اپنی حفاظت کے لیے یہ پروگرام چلا رہے ہیں اور اس پر کسی طرح کا سمجھوتہ کر کے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہنری کسنجر کی بات بھی یونہی ہوائی بات نہیں تھی اور یہ کوئی گیدڑ بھبکی نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے پورا پلان تھا۔ بڑا سوچا سمجھا منصوبہ تھا جو بہت جلد روبعمل آ گیا۔ قائد عوام نے اپنے معینہ وقت سے پہلے عام انتخابات کرا دیئے۔ اب ان کے خلاف ایک قومی اتحاد بن چکا تھا۔ دائیں بازو کی وہ ساری پارٹیاں اکٹھی ہو گئی تھیں جنہوں نے یحیٰی دور کے انتخابات میں بڑی خوفناک شکست کھائی تھی۔ یہ وہی پارٹیاں تھیں جن کی عوام میں اتنی پذیرائی نہیں تھی جتنا میڈیا نے انہیں سر پر چڑھا رکھا تھا۔ ان کا سارا زور شور چند بر خود غلط قسم کے اخبارات تک محدود تھا۔ اخباری پروپیگنڈے نے انہیں بڑا بنا رکھا تھا، وگرنہ کوئی بھی پارٹی تنہا بمشکل ایک دو سیٹیں لے سکتی تھی۔ اس الیکشن میں بھی انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، تاہم کچھ سیٹوں پر دھاندلی ہوئی۔ یہ دھاندلی امیدواروں نے اپنے طور پر کی مگر اس کا الزام حکومت کے سر ڈالا گیا جگہ جگہ احتجاج ہوا۔ فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ضیاء الحق نے عوامی احتجاج کو کنٹرول کرنے کے لیے بلا ضرورت گولی چلا دی جبکہ وزیر اعظم کی طرف سے بار بار اعلان ہوتا رہا کہ احتجاجی جلوسوں کو پر امن طریقے سے منتشر کیا جائے۔ قومی اتحاد کے لیڈر ایک قافلے کی صورت شہر شہر جلسے کرتے اور فوج سے کہتے کہ وہ مداخلت کرے اور آ کر مارشل لگا دے۔ قومی اتحاد کے ستاروں میں ایک ستارہ، وہ جرنیل بھی تھا جس نے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈال کر پوری قوم کو شرمسار کر دیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے قومی اتحاد کے لیڈروں کو مذاکرات

کی دعوت دی اور کئی روز کے مذاکرات کے بعد جماعت اسلامی کے پروفیسر عبدالغفور اور تحریک استقلال کے سربراہ ائیر مارشل اصغر خان کی وضاحتوں کے مطابق پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد کے درمیاں معاہدہ طے پا گیا۔صبح دستخط ہونا تھے کہ آدھی رات کو جنرل ضیاء الحق نے فوج کو لے کر شبخون مارا اور ملک کو ایک دفعہ پھر مارشل لاء کے جہنم میں دھکیل دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق نے ایک دیندار اور اسلام پسند ڈکٹیٹر کا روپ دھارا اور بڑے مومنانہ انداز میں الیکٹرانک میڈیا پر آکر پوری قوم کے سامنے اعلان کیا کہ اسے اقتدار کی کوئی ہوس نہیں ۔قوم کو اس وقت منصفانہ، غیر جانبدارانہ اور شفاف انتخابات کی ضرورت ہے اور ملک وقوم کی یہ ضرورت میں پوری کروں گا۔ میں نوے دن کے اندر انتخابات کرا دوں گا اور ملک منتخب جمہوری وزیر اعظم کے حوالے کر دوں گا۔اس کے اس اعلان سے قوم پر سکون ہوگئی۔ اسے جمہوری اتحاد کے رہنماؤں نے یقین دلایا تھا کہ پیپلز پارٹی ختم ہو چکی ہے اور ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی مقبولیت کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔اب اس کا کوئی نام لیوا بھی نہیں۔ جنرل ضیاء الحق اندر سے جانتا تھا کہ قومی اتحاد کے لیڈر ریونہی خوش فہمی اور خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ان کی یہ خوش فہمی دور کر دینی چاہیے تا کہ وہ مجھے صحیح معنوں میں اپنا محسن سمجھیں چنانچہ اس نے کچھ روز کے لیے جناب ذوالفقار علی بھٹو کو ضمانت پر رہا ہونے کا موقع دیا۔ان کا جیل سے باہر آنا تھا کہ پہلے سے زیادہ عوام ان کی پذیرائی کے لیے آنے لگے۔قومی اتحاد کے خود ساختہ اور میڈیا میڈ لیڈروں کی غلط فہمی دور ہوگئی۔ ان کے دماغوں میں بھری ہوئی وہ خود فریبی ختم ہوگئی جس نے انہیں اس گمان باطل میں مبتلا کر رکھا تھا کہ اب وہ عوام کے ہر دلعزیز لیڈر ہیں۔ انہیں یقین ہوگیا کہ اگر جنرل ضیاء سچ مچ غیر جانبدارانہ، منصفانہ اور شفاف الیکشن کراتے ہیں تو پہلے کی طرح انہیں ندامت خیز شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ جنرل ضیاء کے لیے ایک ٹیسٹ کیس تھا۔اسے بھی پوری طرح اندازہ ہو گیا کہ بھٹو ہی پاکستانی عوام کا ہر دلعزیز اور مقبول ترین لیڈر ہے۔امریکہ کو بھی علم ہو گیا کہ بھٹو کی مقبولیت ختم کرنا ناممکن ہے اور بھٹو کے ہوتے ہوئے امریکی سامراج کا پہلے کی طرح پاکستان میں پاؤں جمانا اور اس پر مسلط

رہنا بہت ہی دشوار ہے۔ وہ امریکہ جو اپنے آپ کو جمہوریت کا دیوتا کہتے نہیں تھکتا، اس کی پالیسی ہمیشہ دوغلی رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی پذیر ملکوں میں جمہوری حکومت کے بجائے ڈکٹیٹر سے سودا کرنا، اس کے لیے آسان ہوتا ہے. جمہوری حکومتوں میں تو ہر اقدام کو پارلیمنٹ میں زیر بحث لایا جاتا ہے اور اکثریت اس کی منظوری دیتی ہے۔ یہ مسئلہ خاصا دشوار اور تردد آمیز ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں ڈکٹیٹر شپ میں سارا سودا بالا بالا فردِ واحد سے ہی چکا لیا جاتا ہے۔ اور دنیا جانتی ہے کہ فردِ واحد سے معاملہ کرنا اور اسے خرید لینا بہت آسان ہوتا ہے۔ چنانچہ امریکہ ہمیشہ اسی دوغلی پالیسی پر عمل پیرا رہا ہے۔ وہ دنیا میں جمہوریت کا پرچم بلند رکھنے کے دعوے کرتا ہے۔ اپنے ملک میں بھی اس کی یہی حکمت عملی ہوتی ہے لیکن پاکستان جیسے ملکوں میں وہ ہمیشہ فوجی ڈکٹیٹروں کی حمایت کرتا اور ان پر انعامات کی بارش کرتا ہے۔

یہاں بھی یہی صورت حال تھی۔ امریکہ کو جنرل ضیاء سے پورا کام لینا تھا۔ اس نے ہنری کسنجر کی اس دھمکی کو بھی عملی جامہ پہنانا تھا جس کے تحت ذوالفقار علی بھٹو کو نشان عبرت بنایا جانا تھا۔ احمد رضا قصوری ایک نوجوان گمنام وکیل تھا۔ وہ ابتداء میں ہی پیپلز پارٹی میں شامل ہوا تھا پھر وہ بھی پیپلز پارٹی کی بے پناہ عوامی مقبولیت کے باعث ایم این اے منتخب ہوا اور کچھ عرصے کے بعد اس گمان باطل میں مبتلا ہو گیا کہ وہ کوئی بہت بڑا سیاسی لیڈر رہے اور قائد عوام سے اختلاف کر کے وہ پیپلز پارٹی کے متوازی کوئی بڑی پارٹی بنا سکتا ہے چنانچہ وہ پیپلز پارٹی کے خلاف ہو گیا۔ اسی دور میں اس کی کار پر گولی چلی۔ کار میں اس کا والد نواب محمد احمد خان بھی سوار تھا۔ احمد رضا قصوری نے اس قتل کو یہ رنگ دیا کہ بھٹو نے اس کی کار پر حملہ کرایا ہے۔ فائرنگ ہوئی تو وہ بچ گیا مگر اس کا والد قتل ہو گیا۔ بھٹو صاحب اس وقت وزیراعظم تھے۔ انہوں نے تھانیدار کو آزادانہ تفتیش کے لیے کھلی آزادی دی اور اس سلسلے میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہ کی تھانیدار نے تفتیش میں وزیراعظم کو بے گناہ قرار دیا اور اسے خاندانی دشمنی کا شاخسانہ قرار دے دیا۔ معاملہ ختم ہو گیا ایک جذباتی نوجوان کی طرح احمد رضا

قصوری کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے بھٹو صاحب سے معافی مانگی اور پھر پہلے کی طرح پیپلز پارٹی کا ساتھی بن گیا۔ بھٹو فیملی کی ایک بات کو اس ماحول میں اس کی خامی ہی سمجھنا چاہیے کہ ذوالفقار علی بھٹو تھے یا ان کی دختر محترمہ بے نظیر بھٹو، یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور انہوں نے جمہوری ملکوں کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی تھی مثالی جمہوری معاشروں میں پرورش پانے والے اور آکسفورڈ جیسی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کر کے ان عالی دماغ لوگوں نے اعلیٰ ترین تعلیمی اسناد حاصل کی تھیں۔ انہوں نے ان معاشروں میں پرورش اور تربیت پائی تھی جہاں کسی آدمی پر یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا بددیانتی کی بات کر رہا ہے۔ یہ لوگ تو ہر آدمی کو سچا سمجھتے ہیں اور ان کی بات کا یقین کر لیتے ہیں۔ انہیں پاکستان کے لوگوں میں رہ کر بھی اپنے پچھلے تجربات کو جھٹلانا اچھا نہیں لگتا۔ یہ دونوں باپ بیٹی اسی کمزوری کا شکار تھے چونکہ خود سچے اور راستباز تھے اس لیے ہر ایک کو سچا اور راستباز سمجھتے تھے چنانچہ بھٹو صاحب کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کوئی آدمی خوفناک طرز کا منافق بھی ہوتا ہے۔ وہ ظاہری شکل وصورت اور زبان سے صادر ہونے والے اقوال پر یقین کر کے دھوکا کھا گئے۔ جنرل ضیاء کو انہوں نے اس کی ظاہری مسکینی دیکھ کر ہی کمانڈر ان چیف بنایا اور اپنا وفادار سمجھا تھا۔ احمد رضا قصوری کی معافی کو بھی پوری نیک دلی سے اس کی انابت پر محمول کیا تھا مگر یہ پاکستان کے نفاق اساس معاشرہ کے پروردہ لوگ تھے۔ چنانچہ جنرل ضیاء نے کسنجر کی دھمکی کو عملی طور پر وقوع پذیر کرنے کا کردار سنبھالا۔ اس نے اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے احمد رضا قصوری کو چنا۔ قصوری کو معلوم ہو چکا تھا کہ جنرل ضیاء امریکہ کی خواہش پر بھٹو کو نشانِ عبرت بنا دے گا اور ذوالفقار علی بھٹو ماضی کی کہانی بن جائے گا۔ اس لیے اس نے اس پلان میں پورا حصہ ادا کیا۔ جنرل ضیاء نے بھٹو صاحب پر احمد رضا قصوری کے والد نواب محمد احمد خان کے قتل کا کیس زندہ کیا اور عدالتی قتل کے تانے بانے بنے جانے لگے۔ اب تھوڑی دیر کے لیے ہم ان واقعات کو یہیں چھوڑ کر محترمہ بے نظیر بھٹو کے حالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو

مختصر حالاتِ زندگی

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن اور سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو شہید 21 جون 1953ء کو پیدا ہوئیں۔ وہ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو اور محترمہ نصرت بھٹو کی پہلی اولاد تھیں۔ انہیں پہلے نرسری سکول اور بعد ازاں کانونٹ سکول کراچی میں داخل کرایا گیا۔ دو سال یہاں زیر تعلیم رہنے کے بعد والدین راولپنڈی آ گئے تو انہیں پریذینٹیشن کانونٹ سکول راولپنڈی میں داخل کرا دیا گیا۔ بعد ازاں وہ مری کے کانونٹ سکول میں زیر تعلیم رہیں۔ انہوں نے 15 سال کی عمر میں اولیول کا امتحان امتیازی شان سے پاس کیا۔ اب انہیں اے لیول مکمل کرنے کے لیے کراچی گرامر سکول میں داخل کرایا گیا۔ پاکستان میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے امریکہ بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ 1969ء سے 1973ء تک ریڈکلف کالج اور ہارورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتی رہیں گریجویشن یہاں سے کی اور اگلے مرحلے کی تعلیم کے لیے انہیں برطانیہ بھیجا گیا وہاں 1973 سے 1977 تک لیڈی مارگریٹ ہال آکسفورڈ میں فلسفہ پالیٹکس اور اکنامکس کے مضامین پڑھے۔ انہوں نے آکسفورڈ سے انٹرنیشنل لاء اور ڈپلومیسی کے کورس بھی کیے۔ 1976ء میں وہ آکسفورڈ یونین کی صدر منتخب ہوئیں۔ وہ پہلی ایشیائی خاتون تھیں جنہیں اس باوقار (Debating) ڈبیٹنگ سوسائٹی کی سربراہ بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔

ہم اور آپ اکثر دیکھتے رہتے ہیں اور ایک ہی بات کو جب اکثر دیکھا جائے تو اسے ایک زندہ حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح کی ایک زندہ حقیقت ہم نے یہ

بھی سمجھ رکھی ہے کہ مالی طور پر آسودہ حال لوگوں کی اولادیں بے اندازہ سہولیات کے باعث اکثر کندہء ناتراش رہ جاتی ہیں لیکن بھٹو فیملی کا ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس یقینی حقیقت کا انکار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو ایک بڑے جاگیردار کے بیٹے تھے اور یہ جاگیردار سر شاہنواز بھٹو تھے وہ خود بھی بہت قابل آدمی تھے اور انگریزوں کے دور میں بہت بڑے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کے فرزندان سے بھی آگے نکل گئے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوئے۔ انہوں نے اپنی اولاد میں بھی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا شوق پیدا کیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی بے مثال کتاب ''Daughter of the East'' (دخترِ مشرق) میں لکھتی ہیں۔

''آکسفورڈ دنیا کی بہترین یونیورسٹی ہے، آکسفورڈ'' پاپا نے ہم سب کے کانوں میں یہ لفظ ٹھونس دیا تھا۔ آکسفورڈ دنیا کی بہترین اور باوقار یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔ آکسفورڈ میں پوری انگریزی تاریخ سرایت کر چکی ہے۔ انگریزی ادب، انگریزی گرجا، شہنشاہیت، پارلیمنٹ سب کا کوئی نہ کوئی تعلق آکسفورڈ کے ساتھ ہے، امریکی طریقہءِ تعلیم اچھا تھا، وہ مانتے تھے لیکن یہ طریق کار ڈھیلا ڈھالا سا ہے۔ وہ کہتے آکسفورڈ تم پر نئے افق کھولے گا اور مضبوط و منظم زندگی گزارنے کے اصول و ضوابط سکھائے گا۔ ہم سب کی پیدائش پر انہوں نے ہر ایک کا نام وہاں رجسٹر کرا دیا تھا۔ سب سے بڑی ہونے کی بنا پر صرف میں ہی آکسفورڈ میں اپنی تعلیم مکمل ہونے کی عیاشی حاصل کر سکی''۔

مگر قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو اپنی باصلاحیت بیٹی کو یہ اعلیٰ تعلیم کس لیے دلانا چاہتے تھے؟ اس کا جواب ان کے اس خط سے ملتا ہے جو انہوں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو 1973ء میں لکھا تھا۔ انہوں نے لکھا۔

''مجھے یہ سوچ کر عجیب قسم کا احساس ہوتا ہے کہ تم میرے ان ہی نقوش قدم پر چل رہی ہو جو میں نے 22 سال قبل آکسفورڈ میں چھوڑے تھے۔ میں ریڈ کلف میں تمہاری موجودگی پر خوش تھا لیکن چونکہ میں ہارورڈ میں نہیں تھا میں آنکھوں کے

کیمرے سے اس کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تمہاری موجودگی کو اپنے ہی گوشت پوست کی طرح آکسفورڈ کی گلیوں کے گول پتھروں پر یخ بستہ پتھریلی سیڑھیوں کے ہر قدم پر اور مادر علمی کی ہر ڈیوڑھی میں دیکھتا ہوں۔ تمہارا آکسفورڈ میں موجود ہونا میرے خوابوں کی تعبیر ہے۔ ہماری دعا اور امید ہے کہ ہمارا یہ خواب حقیقت کا روپ دھار کر پاکستانی عوام کی خدمت میں ایک شاندار کردار بن کر ابھرے''۔

اپنی بیٹی کو قائد عوام اعلیٰ تعلیم اس لیے دلانا چاہتے تھے کہ وہ پاکستان اور پاکستانی عوام کی بہتر طور پر خدمت کر سکے اور یہاں کے عوام کا شعور بلند کرنے میں نمایاں کردار ادا کر سکے مگر جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں یہ قائد عوام کی سوچ تھی۔ مگر ان کا پاکستان آزاد ہو کر بھی آزاد کہاں ہوا تھا، وہ دوہری غلامی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ ایک ایسا ملک تھا جس پر اب برطانیہ حکمران نہیں تھا مگر اس بد نصیب ملک کے ماضی کے حکمرانوں نے اسے سامراج کی ذہنی و اقتصادی غلامی میں دے دیا تھا۔ یہاں سوچ آزاد تھی نہ قلم، قدم قدم پر وہ لوگ بکھرے ہوئے تھے جنہوں نے اپنے ضمیر کہیں اور گروی رکھ دیئے تھے۔ اس ملک کے نئے آقا کبھی نہیں چاہتے تھے کہ یہاں آکسفورڈ کے سکالر انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو متعارف کرائیں۔ لوگوں میں صحیح جمہوری شعور پیدا کریں اور یہ ملک اس قابل بن جائے کہ اپنا سر فخر سے بلند کر کے سپر پاور کے احکام ماننے سے انکار کر دینے کی جسارت رکھتا ہو۔ اور اس کے ہاتھ ایٹمی قوت سے طاقتور ہوں۔ قائد عوام کی اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کی مالک بیٹی اپنے والدین کے خوابوں کی تعبیر لیے آکسفورڈ کی سکالر کی حیثیت سے پاکستانی عوام کی خدمت کرنے پاکستان واپس آ گئی۔ وہ کچھ عرصہ اپنے والد کی رفاقت میں سیاست کے نشیب و فراز کا مطالعہ کرتی رہی اور وہ یہیں تھی جب کوتاہ قامت جنرل ضیاء نے ملک پر شبخون مارا اور جور و جبر کا دیوتا بن کر ظلم و تعدی کی نئی داستانیں رقم کرنے لگا۔ قائد عوام پر قتل کا بے بنیاد مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمے کے دوران ہائی کورٹ ایک مذاق بن گئی چن چن کر بھٹو دشمن یا اسٹیبلشمنٹ کے کاسہ لیس جج لائے گئے۔ مولوی مشتاق نے اپنا انتقام لیا، پھر سپریم کورٹ

میں ضیاء کے گرائیں انوار الحق نے عدالتی قتل کے حکمنامہ کی توثیق کر دی اور پاکستان وہ رسوائے زمانہ ملک بن گیا، جس میں ''عدلیہ'' جیسے عظیم ادارے نے اپنی بے ضمیری کی سیاہ ترین تاریخ رقم کر دی اور اس کے ساتھ ہی جب سے قائد عوام کو گرفتار کیا گیا تھا، ان کی پارٹی کے کارکنوں کو بھیانک تشدد کا نشانہ بنانے کا عمل شروع کر دیا گیا۔ شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک پاکستان کی سرزمین ہولناک جیل بن گئی تھی۔ جگہ جگہ ٹکٹکیاں نصب تھیں اور پارٹی کے کارکنوں کی پیٹھوں پر کوڑے برسائے جا رہے تھے۔ خواتین بھی وحشیانہ سزاؤں سے دوچار ہو رہی تھیں۔ شاہی قلعہ کے عقوبت خانے پارٹی کے لیڈروں اور جاں نثار کارکنوں سے بھرے پڑے تھے۔ تاریخ شرم سے سر جھکا کر سوچ رہی تھی بیسویں صدی میں آدمی کی اولاد اتنی وحشی بھی ہو سکتی ہے اور پھر وہ سیاہ ترین دن آ گیا جب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی جانا تھی جس طرح اس میں قدم قدم پر بین الاقوامی قوانین کی دھجیاں بکھیری گئی تھیں پھانسی کی سزا میں بھی وہی حال رہا۔ ان وحشی لمحوں کو ثانیہ ثانیہ قلمبند کرتے ہوئے آکسفورڈ کی سکالر اور بہادر باپ کی بہادر بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو لکھتی ہیں۔

''میں نے اپنے آپ کو خلا میں محسوس کیا۔ میری زندگی بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ تقریباً دو برس تک میں نے فوجی حکومت کی طرف سے اپنے والد کے خلاف لگائے گئے جھوٹے اور من گھڑت الزامات کے دفاع کے سوا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر ان انتخابات کے لیے کام کرنا شروع کر دیا جن کے انعقاد کا جنرل ضیاء نے حکومت کا تختہ الٹتے وقت وعدہ کیا تھا جنہیں بعد ازاں ہماری متوقع جیت کے پیش نظر جنرل ضیاء نے منسوخ کر دیا تھا۔ مجھے فوجی حکومت نے چھ مرتبہ زیر حراست رکھا اور مارشل لاء حکام نے مجھے بار بار کراچی اور لاہور کی سرزمین پر قدم رکھنے سے محروم رکھا۔ یہی حال میری والدہ کا بھی تھا میرے والد کے زمانہ قید میں انہیں پیپلز پارٹی کی قائم مقام چیئرپرسن کے طور پر آٹھ مرتبہ نظر بند رکھا گیا ہم نے اپنی نظر بندی کے آخری چھ ماہ سہالہ میں گزارے۔ اس

سے قبل چھ ماہ راولپنڈی میں نظر بندی تھی لیکن گزشتہ کل تک مجھے مطلقاً یقین نہیں تھا کہ جنرل ضیاء حقیقتاً میرے والد کو قتل کرا دے گا''۔

اور یقین کر بھی کون سکتا تھا۔ ایک ایسا شخص جو کوئی تاوان دیئے بغیر 5000 مربعہ میل علاقہ اور ترانوے ہزار جنگی قیدی اپنی حکمت عملی سے چھڑا لایا تھا جس نے ٹوٹے پھوٹے پاکستان کی تعمیر نو کی تھی اور دنیا میں اس کا وقار بحال کیا تھا جس کی سیاسی پارٹی پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی تھی جو کروڑوں عوام کے دلوں کی دھڑکن تھا۔ سارا عالم اسلام جسے اپنے قائد کی صورت میں دیکھ رہا تھا جس کے لیے تمام آزاد ممالک اپیلیں کر رہے تھے اور جس کا کوئی جرم نہیں تھا، اسے کیوں قتل کیا جا سکتا تھا، مگر بین الاقوامی قانون اور عالمی فلسفے کی سکالر بے نظیر بھٹو کا گمان غلط تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ایک ایسے ملک میں ہے جس میں کبھی کبھی جنگل کا قانون بھی برسر عمل آ جاتا ہے۔ اور اب جو شخص اقتدار پر قابض ہوا تھا اس کی آنکھوں پر اپنے مفادات کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی ساری کارروائی اندھی تھی حکومت پر اس کا قبضہ، قوم سے جھوٹے وعدے، قائد عوام اور کارکنوں پر تشدد عدالتوں میں اکھاڑ پچھاڑ یہ سب کچھ بتا رہے تھے کہ وحشیانہ کھیل ہو کر رہے گا۔ محترمہ نے اپنی سوچوں کا لمحہ لمحہ اپنے بے قرار آنسوؤں کی صورت میں اپنی کتاب پر چسپاں کرتے ہوئے لکھا۔

''میرے چھوٹے بھائیوں کو خبر کون دے گا؟ جو لندن میں اپنے سیاسی جلاوطنی کے دنوں سے اپنے والد کی سزائے موت کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں اور میری بہن صنم کو کون بتائے گا جو ہارورڈ میں اپنی تعلیم کے آخری سال میں پڑھ رہی ہے۔ میں صنم کے بارے خاصی متفکر تھی کیونکہ وہ تو سیاسی ذہن کی تھی بھی نہیں۔ تاہم ہمارے ساتھ اسے بھی اس المیہ میں دھکیل دیا گیا تھا۔ کیا وہ اب تنہا رہ جائے گی؟ میں دعائیں کرتی کہ اللہ تعالیٰ میری بہن کو حوصلہ اور استقامت عطا کرے کہ وہ ٹوٹے ہوئے جذبات میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے۔ مجھے اپنا جسم ٹکڑے ہوتا ہوا محسوس ہوا میں کیسے زندہ رہ سکتی تھی۔ میں کس قدر تنہا ہو گئی تھی۔ بالکل تنہا'' آپ کے سہارے کے بغیر میں

کیسے زندہ رہ سکوں گی''؟ میں نے موت کی کوٹھڑی میں اپنے والد سے سوال کیا تھا۔ مجھے ان سے سیاسی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ ہارورڈ اور آکسفورڈ کی ڈگریوں کے باوجود میں سیاستدان تو نہیں تھی لیکن وہ بھی کیا جواب دے سکتے تھے۔ انہوں نے بے چارگی میں اپنے کندھے جھٹکے۔ میں نے ایک روز قبل اپنے والد سے معمول کی ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات کا کرب ناقابل برداشت تھا۔ کسی نے ابھی تک انہیں یہ اطلاع نہیں دی تھی کہ اگلی صبح انہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائیگا''۔

ہم مجبور ہیں کہ محترمہ کے اپنے الفاظ پیش کرتے جائیں کیونکہ ہم لاکھ کوشش کریں ہماری تحریر میں وہ کرب منتقل نہیں ہوسکتا جو محترمہ کے اپنے الفاظ میں ہے کیونکہ جس تن لاگے سوہی جانے محترمہ لکھتی ہیں۔

''کسی نے ان متعدد عالمی رہنماؤں کو بھی اطلاع نہیں دی جنہوں نے فوجی حکومت سے سرکاری طور پر ان کی جان بخشی کی اپیل کی تھی۔ ان میں نہ صرف جمی کارٹر، مارگریٹ تھیچر، لیونڈ بریشرنیف، پوپ جان پال دوئم، چیئرمین ہوا کوفنگ اور اندرا گاندھی شامل تھے بلکہ تمام عالم اسلام یعنی سعودی عرب، ایران، ترکی، سوڈان، قطر، مصر، کویت لیبیا، فلسطین، متحدہ عرب امارات، شام وغیرہ کے سربراہان بھی شامل تھے۔ ضیاء حکومت کے بزدل قراریوں میں سے کسی کو بھی جرات نہ ہوئی کہ علی الاعلان ملک میں میرے والد کی پھانسی کی تاریخ کا اعلان کرتے۔ وہ یقیناً وزیراعظم بھٹو کی موت پر عوامی ردِعمل سے خوفزدہ تھے۔ صرف مجھے اور میری والدہ کو اس بات کا علم ہوا۔۔۔ وہ بھی حادثتاً اور واقعات کے تجزیہ کے بعد۔ میں 12 اپریل کی صبح فوج کی طرف سے فراہم کردہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، جب میری والدہ اچانک میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے مجھے میرے گھریلو نام سے پکارا ''پنکی'' یہ ایسا لہجہ تھا کہ میرا تمام جسم اکڑ گیا ''باہر فوجی افسران کا کہنا ہے کہ ہم دونوں آج تمہارے والد سے ملاقات کرلیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

مجھے مکمل فہم تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ اسی طرح میری والدہ بھی جانتی تھیں لیکن ہم دونوں اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے فرار چاہتی تھیں۔ یہ دن عمومی طور پر میری والدہ کی ملاقات کا دن تھا۔ انہیں ہفتے کے جس دن ملنے کی اجازت تھی، اس دن میری ملاقات نہیں ہو سکتی۔ میرے لیے اور دن مقرر تھا۔ ہم دونوں اکٹھی نہیں مل سکتی تھیں اور آج ہم دونوں کو اکٹھے ملاقات کے لیے جانے کو کہا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ ضیاء نے میرے والد کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا''۔

ذرا آگے چل کر لکھتی ہیں۔

''ایک تیز رفتار جیپ میں ہمیں جیل پہنچا دیا گیا۔ حفاظتی لوگوں کے پیچھے خوفزدہ لوگوں کا ہجوم تھا جنہیں اپنے وزیر اعظم کی قسمت کے متعلق کوئی خبر نہیں۔ جیل کی میٹرن نے میری والدہ اور میری تلاشی لی '' آج تم دونوں اکٹھی یہاں آئی ہو'' میرے والد نے اپنی کال کوٹھڑی کے دوزخ سے پوچھا۔ میری والدہ نے کوئی جواب نہ دیا'' کیا یہ آخری ملاقات ہے'' انہوں نے پھر پوچھا۔ میری والدہ جواب دینے کا یارا نہیں رکھتیں '' میرا خیال ہے ایسا ہی ہے'' میں نے کلیجہ مسوس کر کہا۔ انہوں نے پاس کھڑے ہوئے جیل سپرنٹنڈنٹ سے کہا'' کیا یہ آخری ملاقات ہے'' وہ پاس ہی کھڑا تھا کیونکہ یہ لوگ ہمیں اپنے والد سے تنہا نہیں ملنے دیتے تھے۔

'' ہاں'' جواب میں جیلر نے کہا! اس کی آواز میں لرزش تھی، جیسے وہ حکومت کی یہ بات بتانے میں شرمسار ہو۔

'' کیا تاریخ کا تعین ہو گیا ہے''؟

'' کل صبح''

'' کتنے بجے''

'' جیل قواعد کے مطابق صبح پانچ بجے''

'' یہ اطلاع تمہیں کب ملی''

''کل رات'' اس نے رکتے رکتے جواب دیا۔

''اپنے اہل وعیال سے ملاقات کا کتنا وقت دیا گیا ہے''

''نصف گھنٹہ''

''جیل قواعد کے مطابق ہمیں ایک گھنٹے ملاقات کا حق ہے'' وہ کہتے ہیں

''صرف نصف گھنٹہ'' مجھے یہی احکامات ملے ہیں''

''غسل اور شیو کرنے کے لیے انتظامات کرو۔ دنیا خوبصورت ہے اور میں اسے اسی حالت میں الوداع کہنا چاہتا ہوں''

یہ وہ پاکستان جسے اس شخص نے خاک سے اٹھا کر افلاک مرتبت کر دیا تھا اور یہ ہیں اس فوج کے جرنیل کہ جس فوج کو اس شخص نے شکست اور ہزیمت کے شرمناک احساس سے نجات دلا کر اس کا حوصلہ اور وقار بحال کیا تھا۔ نصف گھنٹہ گزر جاتا ہے اور کہا جاتا ہے وقت ختم ہو گیا۔ اس وقت قائد عوام کے دونوں بیٹے اور ان کی دوسری بیٹی باہر ہیں۔ ان غریبوں کو کوئی علم نہیں کہ ان پر کونسی قیامت ٹوٹ رہی ہے۔ قائد عوام اپنی غمزدہ بیگم سے بڑے اعتماد سے کہہ رہے ہیں۔

''دوسرے بچوں کو میرا پیار دینا، میر، سنی اور شاہ کو بتانا۔ میں نے ہمیشہ ایک اچھا باپ بننے کی کوشش کی۔ مجھے اپنے کسی قول اور کسی فعل پر کوئی ندامت نہیں۔ میری خواہش تھی کہ میں انہیں بھی الوداع کہہ سکتا مگر خیر، اور ہاں تم دونوں نے بہت مصائب جھیلے ہیں۔ آج وہ مجھے قتل کر رہے ہیں۔ میں تمہیں تمہاری مرضی پر چھوڑتا ہوں۔ اگر چاہو تو پاکستان سے اس وقت تک باہر چلی جاؤ، جب تک آئین معطل ہے اور مارشل لاء نافذ ہے۔ اگر تمہیں ذہنی سکون چاہیے اور زندگی نئے سرے سے شروع کرنا چاہو تو یورپ چلی جاؤ''۔

(ہمارے دل ٹوٹ رہے ہیں) ''نہیں نہیں، ممی کہتی ہیں'' ہم نہیں جا سکتے ہم کبھی نہیں جائیں گے۔ جرنیلوں کو کبھی یہ تاثر نہیں دیں گے کہ وہ جیت چکے ہیں۔ ضیاء نے انتخابات کا

دوبارہ پروگرام بنایا ہے۔ اگرچہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ ایسا کرنے کی جرات بھی کرے گا یا نہیں۔ ہم باہر چلے جائیں تو پارٹی کی رہنمائی کے لیے کوئی نہیں ہوگا اور یہ وہ پارٹی ہے جس کی آپ نے بنیاد رکھی اور پروان چڑھایا''

''اور تم پنکی''

''میں بھی کبھی نہیں جاسکتی پاپا''

وہ مسکراتے ہیں میں بہت خوش ہوں۔تم نہیں جانتیں مجھے تم سے کتنا پیار ہے۔تم میری لعل ہو اور ہمیشہ رہی ہو،'' ''وقت ختم ہو چکا'' سپرنٹنڈنٹ پکارتا ہے۔ میں سلاخوں کو پکڑ لیتی ہوں'' براہِ مہربانی کوٹھڑی کا دروازہ کھول دو میں اپنے پاپا کو الوداع کہنا چاہتی ہوں''۔

سپرنٹنڈنٹ انکار کر دیتا ہے۔ میں پھر التجا کرتی ہوں'' میرے پاپا، پاکستان کے منتخب وزیراعظم ہیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ مجھے ان سے مل لینے دو۔ وہ پھر انکار کر دیتا ہے۔

سلاخوں کے درمیان سے میں اپنے والد کے جسم کو چھونے کی کوشش کرتی ہوں وہ اس قدر نحیف و ناتواں ہو چکے ہیں ملیریا، ناکافی اور غلط خوراک، پیچش کی وجہ سے جسم بالکل نحیف، لاغر اور باریک ہو چکا ہے لیکن وہ سیدھا اٹھ بیٹھتے ہیں اور میرے ہاتھ کو چھو لیتے ہیں۔

''آج شب آلامِ دنیا سے آزاد ہو جاؤں گا'' چہرے پر ایک چمکتی روشنی لیے کہتے ہیں'' میں اپنی والدہ اور والد کے پاس چلا جاؤں گا اور میں لاڑکانہ میں اپنے اجداد کی زمینوں کی طرف واپس جاؤں گا اور اس سرزمین کا اس کی خوشبو کا اور اس کی فضا کا حصہ بن جاؤں گا۔ خلقِ خدا میرے بارے گیت گائے گی۔ میں اس کی کہانیوں کا جاوداں حصہ بن جاؤنگا'' پھر وہ مسکرا کر کہتے ہیں'' لیکن آج کل لاڑکانہ میں بہت گرمی ہوگی''۔

''میں وہاں ایک سائبان اٹھادوں گی پاپا'' میں بمشکل کہہ سکی اور جیل حکام آگے بڑھے'' الوداع پاپا''۔

کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ جنرل اپنی تاریک ضمیری کا مظاہرہ کس انداز میں کرنے والا ہے۔ یہ بات ایک خوفناک راز کی طرح صرف اس کے اور مخصوص راز دار جرنیلوں تک محدود تھی۔ بہت سے ملکوں کے سربراہ مطمئن تھے کہ ان کی اپیلیں رائیگاں نہیں جائیں گی اور ضیاء ان کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا کرے گا مگر وہ ضیاء جو اپنے حلفِ وفاداری سے غداری کر چکا تھا قوم کے ساتھ کیے ہوئے انتخاب کے وعدوں سے منحرف ہو چکا تھا۔ وہ کیا جانتا تھا کہ وعدہ کیا چیز ہوتی ہے۔ وہ ضیاء جس کی آنکھوں پر اس کے دل کی سیاہی پٹی باندھ چکی تھی۔ اسے کیا پرواتھی کہ جس اللہ کی کتاب کا وہ اور اس کے حواری چند مولوی بات بات پر ذکر کرتے ہیں، اس کتاب نور میں وعدوں کی پاسداری کی کتنی تاکید کی گئی ہے۔ اس جنرل پر اللہ کے رسول اکرم ﷺ کا یہ فتویٰ صادق آجائے گا، اسے اس کے کاسہ لیس مولویوں نے یہ نہیں بتایا تھا۔

''آیہ المنافق ثلاث اذا وعدہ اخلف اذا تمن خان واذا حدث کذب'' (متفق علیہ)

(منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے، اس کی خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرے۔)

محترمہ نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو واپس لا کر کڑے پہروں میں بند کر دیا گیا۔ وہ رات جس کرب میں گزری اس کا پورا نقشہ انہوں نے اپنی کتاب میں کھینچنے کی کوشش کی مگر ان کے لفظ ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ ان کے خیالات آوارہ پرندوں کی طرح پر پھڑ پھڑاتے دور افق میں ڈوب گئے اور آخر میں انہوں نے لکھا ہے۔

''صبح کے پانچ بج گئے پھر چھ بجے۔۔۔ ہر سانس جو میں لیتی مجھے اپنے والد کی آخری سانسوں کی یاد دلاتا، اے خدا کوئی معجزہ ہی رونما ہو جائے، میری ماں نے اور میں نے دعا مانگی کچھ نہ کچھ ہو جانا چاہیے...... ہم نا قابل یقین امید کے ساتھ چپکے ہوئے تھے سپریم کورٹ نے متفقہ طور پر سفارش کی تھی کہ میرے والد کی سزاے

موت کو عمر قید میں بدل دیا جائے۔ مزید برآں پھانسی دیئے جانے کی صورت میں پاکستانی قانون کے مطابق ایک ہفتہ قبل دن اور تاریخ کے تعین کا اعلان کر دیا جائے لیکن ایسا کوئی اعلان سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔

پھانسی کی سزا دیئے جانے والے ایک عام شہری کے سلسلے میں یہ قانون ہے مگر اس ملک کے منتخب وزیر اعظم اور اس وزیر اعظم کو یہ حق نہ دیا گیا جس نے قیام پاکستان کے 26 سال بعد اس سرزمین بے آئین کو آئین دیا تھا۔ محترمہ آگے چل کر لکھتی ہیں۔

''پی پی پی کے رہنماؤں نے بھی ہمیں یہ پیغام ارسال کیا تھا کہ ضیاء نے سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور دوسرے ممالک کے سربراہوں کو یقین دلایا تھا کہ وہ میرے والد کی سزائے موت کو تبدیل کر دے گا لیکن ضیاء کا ریکارڈ قانون کی پامالی اور جھوٹے وعدوں سے بھرا پڑا تھا''۔ (P.23)

ایک یہ شخص تھا جس کا ریکارڈ امانت میں خیانت، جھوٹے وعدوں اور کذب و دروغ سے بھرا پڑا تھا اور ایک وہ شخص تھا جسے جرنیلوں نے ضیاء کا یہ پیغام پہنچایا کہ وہ قتل کا جرم تسلیم کر لے اور ضیاء سے رحم کی اپیل کرے تو اس کی اپیل منظور کر لی جائے گی مگر اس شخص نے پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر کہا تھا کہ ''میں ناکردہ گناہ تسلیم کر کے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں فوج کے ہاتھوں مارے جانے کو اس پر ترجیح دوں گا کہ تاریخ کے ہاتھوں مر جاؤں''۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا

بہر حال فوجیوں نے کڑے پہرے میں قائد عوام شہید کی میت کو گڑھی خدا بخش کے خاندانی قبرستان میں دفن کر دیا۔ ان کی بیگم اور بیٹی سہالہ میں نظر بند تھیں۔ محترمہ کی والد کی شہادت کے بعد کیا حالت تھی۔ یہ بات ان کے اپنے الفاظ میں پڑھیے۔ لکھتی ہیں۔

''متعدد دنوں تک سہالہ میں اپنے والد کی موت کے بعد کھانا پینا بالکل چھوٹ گیا۔ پانی کے دو گھونٹ پیتی اور تھوک دیتی۔ میں کوئی چیز بھی حلق سے نیچے اتارنے کے قابل نہیں تھی۔ نیند بھی اڑ چکی تھی۔ ہر مرتبہ جب آنکھیں بند کرتی ایک ہی خواب

دکھائی دیتا'' میں ڈسٹرکٹ جیل کے سامنے کھڑی ہوں دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک موہوم سا ہیولا میری جانب بڑھتا ہے'' پاپا'' کہتے ہوئے میں اس کی جانب دوڑتی ہوں'' آپ آگئے ہیں، آپ آگئے ہیں۔ میں خیال کرتی تھی۔ وہ آپ کو مار چکے ہیں لیکن آپ زندہ ہیں۔ جونہی میں اس ہیولا تک پہنچتی میری آنکھیں کھل جاتیں اور یہ تلخ حقیقت میرے سامنے آجاتی کہ وہ تو جا چکے ہیں۔

'' کچھ تو کھاؤ پنکی تمہیں کچھ نہ کچھ کھانا چاہیے'' میری والدہ زور دے کر کہتیں اور میرے لیے سوپ لاتیں۔ جب ہم یہاں سے باہر جائیں گے تو انتخابات کی تیاری کے لیے تمہیں پوری توانائی کی ضرورت ہوگی۔ اگر تم اپنے باپ کے اصولوں کی خاطر اپنی جدوجہد جاری رکھنا چاہتی ہو اور اسی طرح لڑنا ہے جس طرح تمہارے والد لڑے تو کھاؤ کچھ ضرور کھاؤ'' (P.28-29)

یہ تفاصیل سامنے آتی ہیں تو ماں بیٹی کی ہمت اور بلند حوصلگی کی داد دینا پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ خواتین عزم وہمت کا پہاڑ تھیں۔ اس نظر بندی یا قید میں کسی نہ کسی طرح سے لاکھوں تعزیتی پیغامات میں سے کوئی پیغام محترمہ بے نظیر بھٹو تک پہنچ پاتا۔ وہ لکھتی ہیں۔

'' تعزیت کے جو پیغامات ہم تک پہنچتے ہیں، انہیں پڑھنے کی پوری کوشش کرتی۔ میری ایک خاندانی دوست نے 15 اپریل کو لکھا'' میری پیاری آنٹی اور بے نظیر! میرے پاس غم واندوہ بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں۔ پوری قوم اس حادثہ کی ذمہ دار ہے۔ ہم سب مجرم ہیں''۔

'' ہر پاکستانی غم زدہ ہے، مایوس ہے اور غیر محفوظ ہے۔ ہم سب گنہگار ہیں۔ اس گناہ میں ملوث ہیں'' (P. 29)

ظلم وجور کا سفاک دیو جنونی، اندھا اور پاگل ہو چکا تھا، حتیٰ کہ شہید کی غائبانہ نماز جنازہ بھی جرم ہوگئی تھی۔ راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ایسی نماز جنازہ ادا کرنے والوں کے ساتھ کیا کچھ ہوا محترمہ لکھتی ہیں۔

"اس دن راولپنڈی کے لیاقت باغ میں دس ہزار لوگ جمع ہوئے، جہاں ڈیڑھ برس قبل میری والدہ کو سننے کے لیے ایک بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ پی پی کے پر ہجوم جلسوں کو دیکھ کر ہی ضیاء نے انتخابات کو منسوخ کر دیا اور میرے والد کو سزائے موت دی۔ اب نماز جنازہ میں شریک میرے والد کے عقیدت مند ہجوم پر پولیس نے آنسو گیس پھینکی۔ لوگ بھاگے اور پولیس پر اینٹوں اور پتھروں کی بارش کر دی جس پر پولیس لاٹھیاں لے کر حملہ آور ہو گئی۔ کچھ گرفتاریاں بھی ہوئیں۔ یاسمین اس کی والدہ اور دو ہمشیروں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ اسی طرح میری ایک دوست آمنہ پراچہ (جس نے سپریم کورٹ میں دائر میرے والد کے مقدمہ میں وکلا کی امداد کی) اس کی دو بہنوں، بھتیجیوں اور ستر سالہ بوڑھی آیا نے بھی جنازے میں شرکت کی۔ تمام کی تمام دس خواتین کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ ان کے علاوہ سینکڑوں افراد بھی دو ہفتوں کے لیے قید کر دیئے گئے۔ (P. 29)

وہ کون سا پاکستان تھا جس میں ایک منتخب وزیر اعظم کو جرنیلوں نے پکڑا۔ اسے ہر طرح کی صعوبتیں دیں اور بالآخر ایک نا کردہ جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اب بھی اس کی بیٹی اور بیوی کو مبتلائے قید و بند رکھا جا رہا تھا، انہیں طرح طرح کے عذاب دیئے جا رہے تھے اور مرحوم کی نماز جنازہ ادا کرنا بھی جرم ٹھہر گیا تھا۔ جنازے میں شرکت کرنے والے پکڑے گئے اور کتنوں کے ننگے جسم پر کوڑے برسائے گئے۔ افسوس تو اس پر ہے کہ کچھ ایسی مذہبی سیاسی جماعتیں بھی تھیں جو جنرل ضیاء کے ہاتھ مضبوط کر رہی تھیں اور اس کی بنائی ہوئی کابینہ میں وزارتوں کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ وہ قومی اتحاد جس نے قوم کو نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قیام کے نام پر دھوکا دیا تھا، وہ سب جنرل ضیاء کے قدموں میں تھیں۔ انہیں عوام کے ووٹ نہ ملنے کا یقین تھا۔ اس لیے جرنیلوں کی پشت پناہی کر کے مراعات حاصل کر رہی تھیں۔ ایک طرف یہ لوگ تھے جن کا میڈیا جرنیلوں کو شاباش دے رہا تھا اور جو مدارس کے نام پر حکومت سے لاکھوں کروڑں کے فنڈز وصول کر رہے تھے اور دوسری طرف

وہ غریب عوام تھے جن کی اکثریت کی نمائندگی کرنے والی پیپلز پارٹی کے ہزاروں کارکن جیلوں میں کوڑے کھا رہے تھے۔ زمین پکار پکار کر کہہ رہی تھی

ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیرگیر

بزدل جنرل ضیاء ڈرتا تھا کہ اگر ان دو خواتین کو آزاد کر دیا گیا تو اس کی کرسی متزلزل ہو جائے گی اور اس کی کرسی کے رکھوالے نیست و نابود ہو جائیں گے اور اس کا یہ خوف حقیقت پر مبنی تھا کیونکہ اس کا کاسہ لیس میڈیا جھوٹ بول رہا تھا کہ پیپلز پارٹی ختم ہوگئی، بھٹو کے ساتھ ہی دفن ہوگئی۔ بھٹو کے لہو نے تو پیپلز پارٹی کو اور زیادہ مضبوط و مستحکم اور مقبول عام کر دیا تھا۔ جنرل ضیاء اپنے اردگرد جمع ہونے والے مفاد پرست سیاستدانوں کے جھوٹے نعروں سے واقف ہو چکا تھا اسے پتہ چل گیا تھا کہ ان میڈیا کے بانس پر چڑھائے ہوئے لیڈروں کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر عام انتخابات منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انداز میں کرا دیئے جائیں تو ان لیڈروں کے لیے اپنی ایک سیٹ بچانا مشکل ہو جائیگا۔ اسی لیے وہ علی الا علان کہتا تھا ''سیاستدان تو میرے پیچھے کتوں کی طرح دم ہلاتے پھرتے ہیں'' پیپلز پارٹی کا خوف تھا جو اسے اکساتا تھا اور وہ نت نئے مظالم کی قیامتیں توڑتا چلا گیا۔ اس نے زور لگایا کہ لوگوں کو شاہی قلعے کے عقوبت خانے میں مبتلائے عذاب رکھا جائے۔ ان کی ننگی پیٹھوں پر کوڑے برسائے جائیں۔ بے نظیر بھٹو اور نصرت بھٹو کی زندگیاں جہنم بنا دی جائیں تو پیپلز پارٹی ختم ہو جائے گی مگر یہاں تو جتنا ظلم ہو رہا تھا پیپلز پارٹی اور زیادہ مقبول و مستحکم ہو رہی تھی اس طرح شاعر کی وہ بات سچی ہو رہی تھی جس میں اس نے کہا تھا۔

ہر گھر سے بھٹو نکلے گا تم کتنے بھٹو مارو گے

بہر حال محترمہ بے نظیر بھٹو اور محترمہ نصرت بھٹو کی یہ درخواست منظور ہوگئی کہ انہیں اپنے شہید کی رسم سوئم پر قبر پر حاضر ہونے دیا جائے۔ اس درخواست کو منظور کر لیا گیا اور یہ دو خواتین جس طرح قبر پر لائی گئیں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے محترمہ لکھتی ہیں۔

''7 اپریل کو صبح سات بجے پیغام ملا کہ پانچ منٹ میں تیار ہو جائیں۔ ہمارے

پاس نوحہ خوانی کے لیے پہننے کو سیاہ کپڑے نہیں تھے اور ہمیں اسی لباس میں جو ہم قید خانے میں لے کر آئی تھیں جانا پڑا'' جلدی کرو، جلدی کرو' ایک مارشل لاء آفیسر اصرار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد ہم کار میں ایئر پورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ وہ ہمیں ہر کام میں ہمیشہ جلدی کرنے پر مصر رہتا مبادا لوگوں کی نظر ہم پر پڑ جائے اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر ہمارے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کریں یا ہمارے لیے ہمدردی کا اظہار کریں اور نتیجتاً مارشل لاء سے ان کی نفرت ظاہر ہو جائے...... طیارہ موہنجوڈارو کے ہوائی اڈے پر نہیں اتارا گیا، جو گڑھی خدا بخش سے نزدیک تھا بلکہ جیکب آباد اتارا گیا جو تقریباً ایک گھنٹے کے سفری فاصلے پر تھا۔ فوجی حکام نے ہوائی اڈے سے گاؤں جانے والا سیدھا راستہ جو میرے والد نے تعمیر کرایا تھا، اختیار نہیں کیا بلکہ کار سڑکوں پر رینگتی اچھلتی بل کھاتی ہوئی کچی گلیوں میں گھومتی ہوئی گئی۔۔۔۔ ہم جب خدا خدا کر کے قبرستان کے دروازے تک پہنچے تو گرد اور پسینے سے شرابور ہو چکے تھے۔ میں تنگ ڈیوڑھی سے آگے بڑھی تو ایک فوجی افسر میرے پیچھے آیا۔ میں وہیں کھڑی ہو گئی۔ اس نے کہا'' ہمیں حکم ملا ہے کہ آپ کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں''، '' میں تمہیں اندر آنے کی اور اس جگہ کے تقدس کو پامال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ تم نے میرے والد کو قتل کر دیا ہے۔ اب ہمیں تنہائی میں رونے اور چلانے بھی نہیں دیتے''۔

'' ہمیں حکم ہے کہ ہر جگہ آپ کے ساتھ رہیں''

'' تب ہم قبر کی زیارت نہیں کریں گے، ہمیں واپس لے چلو'' میری والدہ نے واپس کار کی طرف جاتے ہوئے کہا! اس پر وہ پیچھے ہٹ گیا اور ہم قبرستان میں داخل ہو گئے''۔

تھوڑا آگے چل کر محترمہ لکھتی ہیں۔

'' اپنے آنسوؤں کے درمیان میں ان کی قبر تلاش کر رہی تھی مجھے مطلقاً علم نہیں تھا

کہ ان کو انہوں نے کہاں دفن کیا تھا میں نے ان کی قبر دیکھی۔ وہ فقط کیچڑ کا اک ڈھیر تھی۔ کچی مٹی کا کیچڑ جن پر پھولوں کی پتیاں چھڑکی ہوئی تھیں۔ ممی اور میں قبر کے پاؤں کی طرف بیٹھ گئیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے والد یہاں دفن ہیں۔ میں فرطِ غم میں وہیں گر گئی اور قبر کے اس حصے کو چوما، جہاں میرے تصور کے مطابق ان کے پاؤں ہو سکتے تھے۔

''پاپا اگر میری وجہ سے کوئی دکھ پہنچا ہو تو مجھے معاف کر دیجیے'' (P.37)

جتنے مظالم قائد عوام کی بہادر بیٹی اور بہادر بیوی نے برداشت کئے یقیناً وہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دینے کے لیے کافی تھے مگر حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ کس استقلالِ مزاج اور جذبۂ بے قیاس کے حامل تھے کہ انہیں توڑنا جنرل ضیاء اور اس کے سفاک گماشتوں کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اس قبر کی زیارت نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو ایک نئے عزم سے سرشار کر دیا وہ لکھتی ہیں۔

''اب جبکہ میں انہیں کھو چکی تھی میں نے ایک ایسا خلاء محسوس کیا جسے کبھی پر نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن میں روئی نہیں کیونکہ بطور مسلمان میرا یقین تھا کہ آنسو روح کو زمین کی طرف واپس لے آتے ہیں اور اس کی آزادی سلب کر لیتے ہیں میرے والد نے اپنی آزادی بزور حاصل کی تھی اور اپنے سکون کے لیے بہت قیمت ادا کی تھی۔ ان کا ابتلاء ختم ہو چکا تھا۔

''سب عز و شان اسی ذاتِ وحدہ لاشریک کے لیے جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ میں نے قرآن پاک کی سورہ یٰسین سے اس آیت کی تلاوت کی'' اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے'' (P.37)

اتنا عظیم کردار کیسے تشکیل پایا تھا۔ یہ مضبوط سیرت کیسے تعمیر ہوئی تھی۔ محترمہ لکھتی ہیں۔

''فوجی حکام پھر ہمیں مختلف اور تکلیف دہ راستے سے ایئر پورٹ واپس لے گئے ......تاہم امن اور ایک نئے یقین کا احساس مجھ پر جم گیا تھا'' چیلنج کا مقابلہ کرو

مسلط کردہ ہر بگاڑ کے خلاف لڑو۔ دشمن پر غلبہ حاصل کرو'' بچپن میں میرے والد جو قصے کہانیاں سناتے رہے، ان میں سچائی کو برائی پر فتح نصیب ہوتی تھی۔ '' آیا تم موقع کو بروقت جھپٹ لیتی ہو یا اسے ہاتھوں سے پھسل جانے دیتی ہو۔ آیا تم جلد باز ہو یا سوچ بچار کرنیوالی؟ آیا تم مضبوط اعصاب کی مالک ہو یا بزدل، یہ انتخاب تمہارا اپنا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ اپنی تقدیر کی تشکیل تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔

اب ایک دہشت پورے پاکستان پر محیط تھی۔ میرے والد کا مطمحِ نظر میرا اپنا مطمحِ نظر بن گیا تھا۔ میں نے اس وقت بھی یہی محسوس کیا تھا جب میں ان کی قبر کے سرہانے کھڑی تھی، ان کی روح کا اعتماد اور قوت مجھ میں سرایت کر گئی تھی۔ اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ پاکستان میں جمہوریت آنے تک میں چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ میں نے پختہ وعدہ کیا کہ امید کی جو شمع میرے والد نے جلائی ہے، اسے ہمیشہ تاباں اور زندہ رکھوں گی۔ میرے والد پاکستان کے وہ پہلے رہنما تھے جو تمام طبقات کی نمائندگی کرتے تھے۔ وہ صرف فوج یا اشرافیہ کے ہی نمائندہ نہ تھے بلکہ وہ پاکستان کے کروڑوں غریب عوام کے نجات دہندہ بھی تھے اب یہ ہم پر تھا کہ ہم ان کے جدوجہد کو جاری رکھیں'' (P.37-38)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا۔

زیارت گاہِ اہل عزم وہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

قائد عوام کی قبر پر یہ ماں بیٹی رونے دھونے نہیں بیٹھ گئیں بلکہ اس خاک کے ایک ایک ذرے سے انہوں نے ''راز الوندی'' سیکھا یہاں سے انہوں نے پہاڑوں کا سا استحکام اپنانے کا درس لیا۔ اس قبر نے انہیں بتایا کہ اپنے مقصد پر ڈٹ جاؤ، پہاڑ کی طرح پروقار طریقے سے ڈٹ جاؤ۔ تم میں اتنا استقلال ہونا چاہیے کہ موت ہی تمہیں اپنے مقام سے ہٹا سکے مگر موت بھی اتنی پروقار ہو کہ جو بھی تمہاری قبر دیکھے اس میں یہ جوش پیدا ہو کہ ڈٹ جانا

ہے۔ یا مرنا ہے اور مرنا ہے تو بھی اس خوبصورت انداز میں مرنا ہے کہ موت کو بھی تم پر پیار آجائے۔ فیض نے جانے کس عالم سرشاری میں کہا تھا؟

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم
جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

واپسی کے کچھ عرصے بعد محترمہ نصرت بھٹو اور ان کی عظیم بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو کو ان کے اپنے گھر ''المرتضیٰ'' میں نظر بند کر دیا گیا مگر یہ نظر بندی کیسی تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے محترمہ نے لکھا۔

''مغربی پریس کو بتایا گیا ہے کہ حکومت نے ہمیں گھر پر نظر بند کر رکھا ہے، لیکن یہ غلط ہے پاکستان میں گھر کی نظر بندی کا مطلب اصل نظر بندی سے مختلف ہے۔ نظر بند شخص کو دوست احباب سے ملاقات کی اجازت ہوتی ہے، پریس کو انٹرویو دیئے جاسکتے ہیں۔ مقامی اور طویل فاصلوں کی ٹیلی فون کالوں کی اجازت ہوتی ہے۔ کتابیں لائی جاسکتی ہیں بعض اوقات تھوڑے فاصلے تک گاڑی بھی چلا کر آ جاسکتے ہیں اور گھر سے باہر میٹنگ میں بھی جاسکتے ہیں لیکن ''المرتضیٰ'' کو سب جیل قرار دیئے جانے پر اسے قید خانہ قرار دیا گیا ہے جہاں جیل کے قوانین پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ ہمارے ٹیلی فون کاٹ دیئے گئے ہیں۔ میری والدہ اور مجھے گھر کے صحن میں نظر بند کر دیا گیا ہے، سوائے بہن صنم کے کسی دوست احباب کو ملنے کی قطعاً کوئی اجازت نہیں۔ گھر کو اندر اور باہر سے شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی پٹھانوں پر مشتمل فرنٹیئر فورس کے سپاہیوں نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ میرے والد کی حکومت کے زمانے میں المرتضیٰ پر کمانڈو فورس اس لیے متعین تھی کہ غیر آدمی اندر داخل نہ ہو سکیں۔ اب فرنٹیئر فورس صرف اس مقصد کے لیے متعین تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو شہید کی بیوی اور بیٹی کو اندر سے باہر نہ جانے دیا جائے اور نہ ان سے انکا کوئی

اپنا باہر سے آ کر مل سکے۔ ضیاء کی خواہش ہے کہ ملک اور باہر کی دنیا بالکل بھول جائے کہ بھٹو نام کے خاندان کا کوئی وجود بھی ہے۔(P.46)

جنرل ضیاء پر پیپلز پارٹی ایک کابوس بن کر سوار ہو گئی تھی، اسے اس کے کاسہ لیسوں نے یقین دلا رکھا تھا کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کر لے تو پیپلز پارٹی ختم ہو جائے گی اور وہ ایسا کر گزرا تھا مگر اسے اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ پارٹی بھٹو شہید کے بعد اور مضبوط ہو گئی تھی۔ صرف چند موقع پرست اسے چھوڑ گئے تھے مگر ان موسمی پرندوں کے اڑ جانے سے پارٹی کارکن خوش ہوئے تھے کہ ان کی سیاست سے گندگی اور غلاظت دور ہو گئی ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ جاں نثارانہ جذبات کے ساتھ پارٹی پر فدا ہو رہے تھے۔ جرنیل اپنا ہر حربہ آزما چکے تھے۔ الیکشن کے اعلانات سے ضیاء بار بار منحرف ہوا کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر الیکشن ہوتے ہیں تو اکثریت ہر حال میں پیپلز پارٹی کو ہی ملنی ہے۔ آخر اس نے الیکشن منسوخ کر دیئے۔ اسے پیپلز پارٹی کا ہوا، ہر وقت ڈراتا رہتا تھا۔ اس کے اوسان بجا نہیں رہے تھے۔ آخر اس نے سوچا کہ اسلام کو آڑ بنا کر کوئی نئی چال چلی جائے۔ اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ اسلام کے نزدیک مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی ناجائز ہے۔ سیاسی پارٹیاں بھی ملت میں افتراق پھیلاتی ہیں۔ اس لیے سیاسی پارٹیوں کا وجود غلط ہے۔ محترمہ لکھتی ہیں۔

”اکتوبر 1979 سے فوجی حکومت نے اعلانیہ قانون نافذ کر دیا کہ تمام سیاسی پارٹیاں غیر قانونی ہیں۔ یہ ایک کھلم کھلا کوشش تھی کہ میرے والد کی عوامی پالیسیوں کے لیے عوامی ہمدردی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ جنرل ضیاء کا مارشل لاء حکم نمبر 48 بین طور پر کہتا ہے، پاکستان میں تمام سیاسی پارٹیوں کا وجود بمع ان کے گروہ شاخیں اور فرقے فوری طور پر ختم کیئے جاتے ہیں۔ کسی سیاسی پارٹی کا کوئی رکن، یا کوئی بھی شخص جو خفیہ طور پر بھی اپنے آپ کو رکن کہتا ہے 14 سال قید بامشقت، اپنی جائیداد کی ضبطی اور 25 کوڑوں کی سزا کا مستوجب

ہوگا'' گویا اب سے آئندہ کے لیے اخبارات میں جہاں بھی پیپلز پارٹی کا ذکر ہوگا، اس کے ساتھ سابق کا سابقہ لگانا ضروری ہوگا، یا اس پارٹی کے نام سے پہلے ''کالعدم'' لکھنا ہوگا۔ اب میں اور میری والدہ سابقہ جمہوریت میں ایک سابقہ پارٹی کی سابقہ رہنما بن کر رہ گئیں'' (P.47)

ایم آر ڈی کی تشکیل

ہر جگہ فوجی عدالتیں قائم ہوگئی تھیں ۔بیسویں صدی کے آخری دنوں کی روشن اور منور دنیا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر چپ تھی۔جانے اس کی سانسیں کونسے سانپ نے پی لی تھیں۔ محترمہ لکھتی ہیں۔

”ضیاء کی ہر صوبے میں قائم کردہ خصوصی فوجی عدالتیں جن کی صدارت ایک مجسٹریٹ اور قانونی تعلیم سے نابلد دو فوجی افسران کر رہے تھے، سزائے موت اور تاحیات قید کے فیصلے مرحمت فرما رہی تھیں ۔سینکڑوں ایسی فوجی عدالتیں بھی قائم کر دی تھیں جہاں غیر تربیت یافتہ ایک فوجی افسر گواہی سنتا اور فوراً ایک سال قید با مشقت اور پندرہ کوڑوں کی سزا سنا دیتا فوجی عدالتوں میں ملزموں کو کوئی وکیل کرنے کی اجازت نہیں تھی، نہ کسی فیصلے کے خلاف کسی طرح کی اپیل کا حق تھا۔ عدالت کے متعلقہ افسر کو رشوت دیکر یعنی دس ہزار روپے فی کوڑا کی شرح پر ملزم فوری عملدرآمد کو رکوا سکتا تھا۔ یہ تھے حالات، مارشل لاء کا پھندا مزید کسا جا رہا تھا“۔(P. 271-272)

مارشل لاء کے حکم نمبر 78 میں کہا گیا تھا کہ کسی کو کوئی وجہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی بغیر وجہ بتائے کسی بھی شخص کو گرفتار کیا جا سکتا تھا پھر یہ کہ مارشل لاء حکام کو پورا اختیار تھا کہ کسی شخص کی نظر بندی میں جتنا مرضی آئے اضافہ کر دیں۔

قائد عوام کو شہید کرنے کے بعد جنرل ضیاء کے حوصلے بلند ہو گئے تھے، اس نے کہا تھا سیاستدان تو میرے پیچھے کتوں کی طرح دم ہلاتے پھرتے ہیں۔ وہ قومی اتحاد کے لیڈروں

کی قوت جان چکا تھا، پہلے تو اس نے قومی اتحاد کی جماعتوں کے لوگ بطور وزیر اپنی کابینہ میں شامل کر رکھے تھے لیکن اب اس نے ان سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگادی۔ اس پر 1980ء کے موسم خزاں میں قومی اتحاد میں شامل سیاسی پارٹیوں نے پیپلز پارٹی کے قریب آنا شروع کر دیا۔

ایسی حرکت اکتوبر 1979ء میں بھی ان جماعتوں کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس وقت پیپلز پارٹی کے قائدین نے یہ سمجھا تھا کہ جنرل ضیاء کو دھمکی دی جارہی ہے کہ ہمیں (قومی اتحاد کے لوگوں کو) دوبارہ وزارتوں میں لے لو اور صاحبانِ اختیار بناؤ نہیں تو ہم پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر تحریک چلائیں گے۔ اس لیے اس وقت پیپلز پارٹی نے اس پیشکش کی طرف کوئی توجہ نہ دی لیکن جب دوسری مرتبہ کوشش ہوئی تو پارٹی نے سنجیدگی سے اس پر سوچا کیونکہ اب ضیاء نے پیپلز پارٹی کے ہی لوگوں پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اب جنرل ضیاء مارشل لاء حکومت ختم کر کے سول حکومت کی طرف لوٹ رہا ہے چنانچہ اس نے ضمیروں کی خرید کا عمل شروع کیا۔ پیپلز پارٹی کے ایک سرکردہ لیڈر اور پی پی حکومت کے صوبہ سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ غلام مصطفیٰ جتوئی کو ضیاء کی طرف سے ملک کا وزیر اعظم بنانے کی پیش کش کی گئی، جو ضیاء کے خیال کے مطابق جتوئی قبول کرنے کو تیار ہو گئے۔ ضیاء اس طرح لوگوں کو فریب دینا چاہتا تھا کہ پیپلز پارٹی کے انتہا پسند سزا پا گئے مگر اعتدال پسند لوگ جنرل ضیاء کے ساتھ ہیں۔ غلام مصطفیٰ جتوئی نے نیشنل پیپلز پارٹی کے نام سے ایک پارٹی کے قیام کا اعلان بھی کر دیا۔ اسی طرح پروگریسو پیپلز پارٹی بھی قائم کر لی گئی۔ اس مرحلہ پر محترمہ نصرت بھٹو نے بڑی دانشمندی سے فیصلہ کیا کہ قومی اتحاد والوں کو قریب آنے دیا جائے محترمہ لکھتی ہیں۔

"میری والدہ نے مجھے ماہ ستمبر میں اس وقت جب مصطفیٰ جتوئی کو وزارتِ عظمیٰ کی پیش کش کی گئی کہا" اس سے پہلے کہ ضیاء اپنی چالوں سے ہمیں مات دے ہمیں اپنی چالوں سے اسے مات دے دینی چاہیے۔ اگرچہ اس خیال سے مجھے وحشت ہوتی

ہے، تاہم ہمیں پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے مثبت رویوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے'' پہلے پہل تو میں خوفزدہ ہوگئی'' اس سے پارٹی رہنماؤں میں زلزلہ ہوجائے گا'' میں نے احتجاج کیا ہم کیسے بھول سکتے ہیں کہ پارٹی پر مارشل لاء کا عذاب مسلط کرنے والے یہی لوگ تھے۔ ان ہی لوگوں نے جنرل ضیاء کو راستہ دیا پھر فوجی تسلط کے لیے راستہ ہموار کیا۔ یہ لوگ ضیاء کی کابینہ میں وزیر تھے، جب اس نے پاپا کو موت کے گھاٹ اتارا''۔

''لیکن ہمارے پاس اس کے سوا اور کونسا راستہ ہے'' والدہ نے پوچھا۔ اب اگر آج جتوئی ہے، کل دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔ جب مثالی حالات موجود نہ ہوں تو بدنما حقائق کو قبول کرنا پڑتا ہے''۔

انہوں نے پی پی پی کی مرکزی ایگزیکٹو کمیٹی کے تقریباً 30 ارکان کا اجلاس بلایا۔ ہمیں علم تھا کہ ہم ایک بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں۔ سیاسی میٹنگز پر پابندی تھی لیکن اگر ہم خاموش تماشائی بنے رہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم حکومتی کارروائی پر مثبت ردعمل دے رہے ہیں۔ یہ اجلاس ایسی ہی دوسری میٹنگز کی طرح 70 کلفٹن میں منعقد کیا جا رہا تھا۔ راہنما ملک کے دور دراز علاقوں یعنی صوبہ سرحد اور بلوچستان سے بھی تشریف لائے اور متوقع طور پر مذاکرات میں کافی تلخی دیکھنے میں آئی۔ سندھ کے ایک رکن نے برملا کہا'' قومی اتحاد کے لوگ قاتل ہیں، قاتل ہیں۔ اگر آج ہم سے معاہدہ کرتے ہیں تو کل کو جنرل ضیاء سے براہِ راست مذاکرات سے ہمیں کونسی چیز مانع ہوگی''

''لیکن ماؤزے تنگ نے چیانگ کائی شیک سے اتحاد کیا تھا، جب جاپان نے چین پر حملہ کیا تھا۔ معمر رہنما شیخ محمد رشید نے جواب دیا' وہ پارٹی میں مارکسسٹ سمجھے جاتے تھے'' اگر قومی مفاد میں وہ آپس میں متحد ہو سکتے تھے تو میں کہتا ہوں ہمیں قومی اتحاد کی جماعتوں سے اتحاد کر لینا چاہیے''۔

مباحثہ اپنے نشیب و فراز کے ساتھ جاری رہا'' ہم اس بات پر متفق ہیں کہ وہ لوگ موقع

پرست اور مفاد پرست ہیں'' میں نے کہا '' لیکن ہمارے پاس اب چارہ کار ہی کیا ہے؟ ہمیں یا تو پہل کرنے کو چھوڑنا ہوگا یا قومی اتحاد سے مذاکرات کی کڑوی گولی نگلنا ہوگی، تاکہ پہل کرنے کا حق ہمارے پاس رہے۔ میری رائے ہے کہ ہم اعتدال پسندی کی راہ اختیار کرتے ہوئے، ان کے ساتھ اتحاد کرلیں مگر اپنے الگ تشخص کی قیمت پر ہرگز نہیں'' سات گھنٹے کی بحث وتمحیص کے بعد آخر کار عملیت پسندی کا بول بالا ہوا اور ہم میں سے ہر ایک نے پاکستان قومی اتحاد کے ساتھ سلسلہ جنبانی کو ترجیح دی۔ تحریک بحالی جمہوریت یعنی ایم آرڈی کے تانے بانے کو تشکیل دیا گیا'' (P.274-275)

قومی اتحاد کی سیاسی پارٹیوں سے مذاکرات میں بھی بہت سا وقت صرف ہوا۔ آخر چار مہینوں کی طویل بات چیت کے بعد دس پارٹیوں کے درمیان ایک متفقہ معاہدہ طے پا گیا لیکن محمد خان جونیجو کی مسلم لیگ عین آخری لمحات میں الگ ہو کر جنرل ضیاء کے قدموں میں جا گری۔ دوسری پارٹیوں کے ساتھ معاہدہ جس عالم میں ہوا اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے محترمہ لکھتی ہیں۔

'' میں نے اپنے والد کے سابقہ مخالفین کو ان کے گھر میں ان کی بیوہ جو پی پی کی چیئر پرسن تھیں اور ان کی بیٹی سے سیاسی معاہدہ کرتے ہوئے دیکھا۔ سیاست کس قدر عجیب چیز ہے؟ پاکستان جمہوری پارٹی کے نصر اللہ خان ترکی ٹوپی پہنے ہوئے میری والدہ کے دائیں بازو کی طرف بیٹھے۔ اصغر خان کی تحریک استقلال کے معتدل مزاج اور بھرے بھرے چہرے والے قصوری (خورشید محمود) ان کے نمائندہ کے طور پر میرے بالمقابل براجمان تھے۔ مذہبی جماعت جمعیت علمائے اسلام کے باریش رہنما کمرے کے ایک طرف تھے اور دوسری طرف بائیں بازو کی ایک چھوٹی سی پارٹی کے رہنما فتحیات علی خان تھے جنہوں نے کلف لگا کرتا اور تنگ چوڑی دار پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ تقریباً بیس کے قریب افراد تھے جن میں سے اکثر سابقہ قومی اتحاد کے رہنما تھے۔ میں اپنے آپ کو یاد دلاتی رہی کہ اصل بات تو ضیا کو

اقتدار سے الگ کرنا اور متضاد خیالات کے باوجود سیاسی اتحاد کو مضبوط کر کے ضیاء کو
الیکشن کرانے پر مجبور کرنا تھا۔''

ایم آر ڈی کی تشکیل ہوگئی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اس میٹنگ کی منظر کشی کے ساتھ اپنے جذبات کی تصویر کشی بھی کی ہے یہ تفاصیل واضح کرتی ہیں کہ محترمہ کتنی بڑی اور دور رس سوچ رکھنے والی عملیت پسند سیاستدان تھیں۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھی تھیں جن میں سے کچھ وہ تھے جنہوں نے اپنی تاریک ضمیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے قائد عوام کی المناک شہادت پر خوشیاں منائی تھیں اور حلوے بانٹے تھے مگر ان لوگوں کا 70 کلفٹن میں آ کر قائد عوام کے گھر میں ان کے پیالوں میں کافی پینا، دراصل قائد عوام کی فتح تھی۔ ان لوگوں نے واسطے دے دے کر جنرل ضیاء کو بلایا تھا خود ہی اس کے سر پر اقتدار کا تاج رکھا تھا مگر جب اسی ضیاء نے انہیں وزارتوں سے نکالا اور مفادات سے محروم کیا تو اب انہیں خیال آ رہا تھا کہ انہوں نے ضیاء کا ساتھ دے کر تاریخ سے غداری کی تھی اور پرائی دلائی میں اپنے ہاتھ اور اپنا دامن کالا کر لیا تھا۔ محترمہ کو بار بار ان کے ماضی کے رویے یاد آتے رہے اور ان کے ذہن کو ڈستے رہے مگر انہوں نے اپنی والدہ کی رہنمائی میں اپنے کلیجے پر پتھر رکھ لیا اور ایک بڑے مقصد کے حصول کے لیے سب کچھ برداشت کر لیا۔ محترمہ نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے اس فیصلے سے پیارے بھائی میر مرتضٰی بھٹو کو اختلاف تھا مگر محترمہ کہتی تھیں، ہم ضیاء کے ہتھیاروں سے اس کے بازو کاٹ رہے ہیں مگر میر مرتضٰی بھٹو کبھی اس دلیل سے قائل نہ ہو سکے۔ ان کا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ ایسے تمام لوگوں سے مصالحت شہید کے لہو سے بے وفائی ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ جنرل ضیاء کے دست و بازو بنے تھے، بہرحال ایم آر ڈی 6 فروری 1981ء کو وجود میں آ گئی۔ محترمہ لکھتی ہیں۔

''ایم آر ڈی کے منشور پر دستخط ثبت ہونے کی خبر لوگوں نے بی بی سی کے نشریئے پر سنی۔ اس خبر نے لوگوں کو ایک نفسیاتی حوصلہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مارشل لاء حکومت کی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کا ابتدائیہ ہے۔ صوبہ سرحد کے طلبہ نے

گلیوں اور سڑکوں پر آ کر احتجاج کرنے میں پہل کی۔ فوراً ہی ضیاء نے میری والدہ کو اور مجھے شہر بدری کے احکامات بھجوا دیئے تا کہ ہم زخمیوں کی عیادت کو نہ جائیں۔ بے چینی جلد ہی سندھ اور پنجاب میں بھی پھیل گئی، جہاں یونیورسٹی پروفیسر، وکلاء اور ڈاکٹر ابھرتی ہوئی تحریک میں جوق در جوق شامل ہوتے چلے گئے۔ طلباء کے احتجاجی جلوس ملتان، بہاول پور، شیخو پورہ، لاہور اور کوئٹہ میں بھی نکلنے شروع ہو گئے۔ ایم آر ڈی کی تحریک میں خدا کا شکر ہے ٹیکسی ڈرائیور، چھابڑی والے، چھوٹے تاجر اور غریب مزدور شامل ہوتے گئے۔ ضیاء کا وقت ختم ہو گیا ہے" عام افواہ پھیل گئی۔ کراچی کی ایمپریس مارکیٹ سے واپسی پر ہمارے باورچی نے رپورٹ دی کہ قصاب بھی ایم آر ڈی کی دعوت پر ہڑتال پر تیار ہو گئے ہیں۔

ضیاء سمجھ گیا کہ وہ شکنجے میں پھنس گیا ہے۔ اس نے کل پاکستان میں تمام یونیورسٹیاں بند کر دیں۔ پانچ سے زیادہ افراد کے اجتماع پر پابندی لگا دی لیکن مظاہرے جاری رہے۔ ٹائم میگزین کے مطابق مخالفت کی یہ شدید ترین اور سنجیدہ ترین لہر تھی جو جنرل ضیاء کا سامنا کر رہی تھی۔" (P.277-278)

لاہور میں 27 فروری کو ایم آر ڈی کا خفیہ اجلاس بلایا گیا۔ ضیاء کا ردِ عمل تھا۔ اس نے ایم آر ڈی کے بہت سے رہنماؤں کو گرفتار کرا لیا۔ کئی لیڈروں کو اپنے گھروں میں نظر بند کر دیا۔ بیرون پنجاب کے لیڈروں کے پنجاب میں داخلے پر پابندی لگا دی۔ محترمہ نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی احکام مل گئے کہ پنجاب میں تمہارا داخلہ امن و امان کے لیے خطرہ ہے۔ اس لیے اس صوبہ میں تمہارا داخلہ ممنوع ہے۔ محترمہ نصرت بھٹو نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو حکم دیا کہ وہ سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینا کچھ عرصے کے لیے ترک کر دیں، تا کہ دونوں کو اکٹھا جیل نہ بھیجا جا سکے۔ ایک کو جیل سے باہر ہونا چاہیے تا کہ وہ قیادت کر سکے۔ محترمہ نصرت بھٹو نے فیصلہ کیا کہ وہ جیسے بھی ممکن ہو ایم آر ڈی کے لاہور کے خفیہ اجلاس میں ضرور شریک ہونگی۔ اسی طرح ایم آر ڈی کے وہ ارکان جو ابھی تک آزاد تھے، انہوں نے بھی

ٹیڑھے میڑھے راستوں سے جائے اجلاس پر پہنچنا تھا۔ محترمہ نصرت بھٹو نے ایک بڑھیا کا روپ دھارا۔ اپنے ایک ملازم کا تیرہ سالہ بچہ ساتھ لیا اور یوں بذریعہ ٹرین ایک دادی اماں کے روپ میں لاہور روانہ ہو گئیں، جن کے ساتھ تیرہ سالہ پوتا سہارا دینے کے لیے تھا۔ پولیس نے اجلاس کے دوران چھاپہ مارا اور تمام حاضرین کو گرفتار کر لیا۔ محترمہ نصرت بھٹو بھی گرفتار ہو گئیں، تاہم ایم آر ڈی اپنا اعلامیہ جاری کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

''مارشل لاء ختم کرو اور تین ماہ کے اندر اندر انتخابات کراؤ۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ضیاء اقتدار فوراً چھوڑ دے، بصورت دیگر مارشل لاء حکومت کو عوام اپنے ناقابل تسخیر عزائم کو کام میں لا کر ہٹا دیں گے۔ ایم آر ڈی نے پاکستان بھر میں جگہ جگہ مظاہروں اور ہڑتالوں کے لیے 23 مارچ کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ 1979ء کے بلدیاتی انتخابات میں پیپلز پارٹی کے کچھ منتخب کونسلروں نے ہڑتال کے روز خود استعفیٰ پیش کرنے اور ضیاء سے مستعفی ہونے کا پرزور مطالبہ کرنے کا اعلان کیا۔ ضیاء کے اقتدار کے خاتمے اور پاکستان میں سول حکومت کی واپسی کے لیے بھرپور جدوجہد شروع ہو گئی تھی۔ محترمہ نے یہاں ایک جملہ لکھا ہے۔

''ضیاء کی قسمت میں بدبختی کا گھڑیال بجنا شروع ہو گیا تھا''

اچانک خبر ملی کہ پی آئی اے کا ایک مسافر طیارہ اغوا کر لیا گیا ہے پھر آئے روز اخبارات میں خبریں آنے لگیں کہ طیارہ ایک تنظیم ''الذوالفقار'' نے اغوا کیا ہے ''الذوالفقار'' میر مرتضیٰ بھٹو کی بنائی ہوئی تنظیم بتائی گئی اور یہ بھی بتایا گیا کہ اس تنظیم کا مرکز کابل میں ہے۔ یاد رہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے دونوں بھائی شاہنواز بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو ان دنوں کابل میں مقیم تھے۔ جنرل ضیاء کو بڑا سہارا مل گیا تھا۔ اس نے اپنی طاقتوں کو اسی بات پر لگا یا کہ وہ طیارے کے اغواء کا پیپلز پارٹی سے رشتہ جوڑیں اور کوشش کریں کہ محترمہ نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو ہی کو الذوالفقار کے تانے بانے بننے والی ثابت کیا جائے، چنانچہ پاکستان بھر میں گرفتاریوں کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی

رپورٹ کے مطابق صرف مارچ 1981ء میں چھ ہزار افراد گرفتار کر لیے گئے۔ محترمہ نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی الگ الگ گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار کیۓ جانے والے کارکنوں پر تشدد کیا جا رہا تھا اور انہیں مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ پاکستان میں الذوالفقار کے وجود کا اعتراف کریں اور یہ تسلیم کریں اور گواہی دیں کہ اس تنظیم کو خفیہ طریقے سے یہی ماں بیٹی چلا رہی ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو ایک دہشت گرد تنظیم ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا تھا حالانکہ پاکستان بھر میں یہی ایک سیاسی پارٹی تھی جو سچی جمہوریت پر یقین رکھتی تھی اور جس کا مطالبہ اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کرائے جائیں۔ محترمہ لکھتی ہیں۔

”سکھر جیل کی کوٹھڑی میں تنہا ہونے کی وجہ سے مجھے یقین ہو چلا تھا کہ حکام مجھے مار دینے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ جیل عملے کے ایک اہلکار نے گھبراہٹ میں مجھے بتایا کہ مجھ پر یہیں خفیہ طور پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر سزائے موت دے دی جائے گی۔ دوسرے شخص نے بتایا کہ دوسرے صحن میں میرے لیے موت کی کوٹھڑی تیار ہو رہی ہے جہاں مجھے منتقل کیا جانے والا ہے۔ سکھر میں حفاظتی پولیس کی تعداد میں بھی اضافہ کیا جا رہا تھا، افواہیں عام پھیلی ہوئی ہیں کہ میری سزائے موت کے اعلان کی صورت میں میرے بھائی مجھے چھڑانے کی کوشش کریں گے، بعض دوسری افواہیں بھی گردش میں تھیں کہ مجھے بلوچستان کے ایک اذیتی مرکز میں منتقل کیا جا رہا ہے تا کہ پی آئی اے کے طیارے کے اغواء میں اپنے ملوث ہونے کا اعتراف مجھ سے کرایا جائے ایک اہل کار نے ہمدردانہ طور پر مجھے بتایا ”تمہارے لیے روز زیادہ خوفناک ایام آنے والے ہیں“۔

انسپکٹر جیل خانہ جات جب سکھر جیل میں معائنہ پر آئے تو اس نے ان افواہوں کی تصدیق کی ”وہ لوگوں کو تمہیں الذوالفقار میں ملوث کرنے کے لیے اذیت دے رہے ہیں۔ ایک رحم دل ملگجے بالوں والے افسر نے آہستہ سے مجھے بتایا کہ میں آنے والے خطرات سے

باخبر ہو جاؤں'' لیکن میں بے گناہ ہوں۔ وہ مجھے ملوث نہیں کر سکتے میرے ملوث ہونے کی کون شہادت دے سکے گا'' میں نے گویا اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دی۔ انسپکٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا'' میں نے تمہارے آبائی شہر لاڑکانہ کے ایک لڑکے کو دیکھا ہے جس کے پاؤں کے ناخنوں کو اکھاڑ اگیا تھا، کتنے لوگ اتنی اذیتیں برداشت کر سکیں گے''۔ (P. 292)

اس طرح جیل کے مصائب میں اضافہ ہوتا گیا۔ ادھر محترمہ نصرت بھٹو الگ سے مصائب کا شکار تھیں حتیٰ کہ ان کی صحت تباہ ہوگئی اور بڑی مشکل سے انہیں بیرون ملک جا کر علاج کرانے کی اجازت دی گئی۔ اب پاکستان کی جیلوں میں محترمہ بے نظیر بھٹو، جنرل ضیاء کی تاریک ضمیری کے متشددانہ فیصلوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ ان کی بیماریاں بڑھتی گئیں۔ ان کا ایک کان تقریباً جواب دے چکا تھا۔ انہیں طرح طرح کے عوارض نے گھیر لیا۔ بالآخر 1983ء میں انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ پردیس میں مدت کا بچھڑا ہوا خاندان مل گیا۔ ماں دو بھائی، دو بہنیں اکٹھے ہوئے مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ جنرل ضیاء کی سازشیں یہاں بھی ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ شاہنواز بھٹو کو ایک سازش کے تحت زہر دے کر قتل کر دیا گیا اور خوشی پھر ایک نہ ختم ہونے والے دکھ میں بدل گئی۔ ذوالفقار علی بھٹو کا چھوٹا بیٹا بھی اس دنیا میں نہ رہا محترمہ بے نظیر بھٹو نے بیرون ملک سرگرمیاں جاری رکھیں۔ تمام ممالک میں جنرل ضیاء کے تشدد اور ظلم و ستم کی بے درد کہانیاں پھیلتی گئیں اور ہر طرف سے اس پر زور ڈالا جانے لگا کہ ملک میں جمہوریت بحال کرے۔ وہ سیاسی پارٹیوں کو ختم کرنے کے اقدامات کر چکا تھا۔ غیر جماعتی انتخابات کرا کے ایک اسمبلی وجود میں لا چکا تھا اور محمد خان جونیجو کو وزیر اعظم بنا چکا تھا۔ ادھر روس کے خلاف پاکستانی سپاہیوں کو امریکہ کی جنگ لڑنے کے لیے پیش کر چکا تھا۔ اس لیے وہ امریکہ کے لیے بہت محبوب ہو گیا تھا۔ امریکہ نے اسے ڈھیروں اسلحہ دیا تھا۔ افغانستان میں روس کی پسپائی نے صورتِ حالات بدل دی۔ امریکہ اب دنیا کی واحد سپر پاور بن چکا تھا۔ اب وہ اپنے نزدیک دنیا کا خداوند تھا اور اسے کسی طرح کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ اب اسے جنرل ضیاء جیسے لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

وطن واپسی

آخر محترمہ نے دنیا بھر میں پھیلے اور ملک کے طول وعرض میں سمائے ہوئے، پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں سے رابطے کرنے کے بعد وطن واپسی کا فیصلہ کرلیا۔ ان کی بیان کردہ تفاصیل کے مطابق انہیں روزانہ فون پر ہمدرد بن کر ڈرایا جاتا تھا کہ پاکستان آنے سے احتراز کرو۔ بار بار ایک ہی طرح کے پیغامات آتے اور بتایا جاتا کہ پہلے سے زیادہ خوفناک مستقبل میرا انتظار کر رہا ہے۔ جونہی میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا مجھ پر جہنم کے دروازے کھل جائیں گے لیکن مجھے اپنے خدا پر بھروسا تھا اور یہ یقین تھا کہ پیپلز پارٹی کے غریب کارکن میرے لیے آہنی فصیل ثابت ہونگے چنانچہ پاکستان واپسی کا فیصلہ کرلیا گیا۔ دنیا کے سارے میڈیا نے یہ خبر نشر کردی اور اسے ایک نمایاں واقعہ کی حیثیت سے خوب اشاعت دی۔ جنرل ضیاء جس نے دس سال تک پاکستانی عوام کو مارشل لاء کی وحشیانہ گرفت میں رکھا تھا جس نے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک کارکنوں کی پیٹھیں کوڑے برسا برسا کر ادھیڑ دی تھیں، جسے اس کے قدم بوس حواریوں نے یقین دلا رکھا تھا کہ انہوں نے بھٹو کی موت کے بعد بھٹو کے چاہنے والوں کو بھی بے جان کر دیا ہے، اب پیپلز پارٹی اور بھٹو کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں رہے گا۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ مردہ بھٹو زندہ بھٹو سے زیادہ طاقتور ہو کر اس کے سامنے آجائے گا۔ محترمہ نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ لاہور آئیں گی اور کل کے منٹو پارک اور آج کے یادگار پاکستان پارک میں خطاب کریں گی۔ 1940ء میں اسی جگہ قائداعظمؒ نے یادگار جلسہ کیا تھا اور یہیں قرارداد پاکستان پاس ہوئی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو شہیدؒ نے اسی دن کی عظمت کو زندہ رکھنے کے لیے یہاں مینار

پاکستان یادگار تعمیر کرایا تھا اور محترمہ نے یہیں اترنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ لندن سے سعودی عرب گئیں وہاں عمرہ ادا کیا اور 10 اپریل 1986ء کو لاہور ایئرپورٹ پر اتریں، یہاں استقبال کا کیا منظر تھا، اس کی کچھ تصویر کشی محترمہ نے خود کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

"زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جنہیں لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ لاہور میں میری واپسی بھی ان ہی واقعات میں سے ایک ہے۔ انسانوں کے بے کراں سمندر تھے جو سڑکوں کے ساتھ ساتھ ایستادہ تھے، گھروں کی بالکونیوں اور چھتوں پر مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ درختوں اور بجلی کے کھمبوں پر لوگ موجود تھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اور دور تک کھیتوں، سڑکوں پر پھیلے ہوئے انسانوں کا وسیع بے کراں سمندر تھا، اس روز پاکستان کے سارے راستے مینار پاکستان پارک کی طرف جا رہے تھے۔ ایئرپورٹ سے مینار پاکستان تک کا 8 میل کا فاصلہ عموماً پندرہ منٹ میں طے ہو جاتا ہے، 10 اپریل 1986ء کے ناقابل یقین دن کو ہمیں وہاں تک پہنچنے میں 10 گھنٹے لگے۔ ایئرپورٹ پر دس لاکھ انسانوں کی تعداد مینار پاکستان تک پہنچتے پہنچتے بیس لاکھ، پھر تیس لاکھ اور پھر بے شمار اور ان گنت ہو گئی" (P.5,3)

تھوڑا آگے چل کر لکھتی ہیں۔

"جب میں نے اقبال پارک کو سر اٹھا کر دیکھا، سڑک کے اس پار بادشاہی مسجد کا سرخ پتھر غروب ہوتے سورج کی کرنوں میں آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ بادشاہی مسجد دنیا کی عظیم ترین مسجدوں میں سے ایک ہے۔ سامنے دائیں جانب درختوں کے سائے میں سے جھلکتا ہوا، لاہور کا شاہی قلعہ تھا۔ مغلوں کا قلعہ، جس کے تہہ خانوں میں ہمارے بہت سے غریب کارکنوں کو مہیب اذیتوں سے دوچار کیا گیا اور ان میں سے کچھ نے موت کو گلے لگا لیا۔ میں مجمع کو اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں خطاب کر رہی تھی۔ کچھ لوگوں نے مجھے سیاست چھوڑ دینے کی نصیحت کی ہے،

انہوں نے متنبہ کیا ہے کہ میرا مقدر بھی میرے والد اور بھائی جیسا ہو سکتا ہے، بعض نے کہا کہ پاکستان میں سیاست کا میدان عورتوں کے لیے نہیں۔ میرا ایسے تمام لوگوں کو جواب ہے کہ میری پارٹی کے کارکن میرے بھائی ہر خطرے میں میری حفاظت کرینگے میں نے اپنی مرضی سے کانٹوں بھرا راستہ چنا ہے اور موت کی وادی میں قدم رکھا ہے" (P.517)

یہ ہجوم پروانوں کا تھا۔ ستائے ہوئے غریب انسانوں کا تھا، یہ اپنے شہید قائد کی ستم رسیدہ بیٹی کے لیے جمع ہوا تھا اور یہ ہجوم اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی قائد نے موت کی وادی میں قدم رکھا ہے تو صرف اس لیے کہ غریب عوام کو اختیار ملے، اعتبار ملے، وقار ملے اور ان کے بچوں کو پرسکون اور عظیم الشان مستقبل ملے۔ اس ہجوم کو کچھ بھی حکم دیا جاتا، یہ کرنے کے لیے تیار تھا کہ یہ لوگ تو جان ہتھیلیوں پر رکھ کر آئے تھے۔ محترمہ لکھتی ہیں "پورے دن میں ہجوم کی طرف سے زیادتی کی کوئی کارروائی نہیں ہوئی، سوائے حکومت کو پرامن چیلنج دینے کے اور کوئی ارادہ نہ تھا۔ ہجوم اتنا مستعد اور ولولوں سے معمور تھا کہ بہت سے لوگوں کے خیال میں حکومت کا تختہ الٹا جا سکتا تھا۔ صرف ایک لفظ کہنے پر ہجوم پنجاب اسمبلی، وزراء کے گھروں اور لاہور ہائی کورٹ، جہاں ضیاء کی نامزد کردہ عدالت نے میرے والد کو سزائے موت سنائی تھی، سب کچھ تباہ و برباد کر سکتا تھا لیکن ہم قتل و غارت گری کے ذریعے برسر اقتدار نہیں آنا چاہتے تھے۔ ہم جمہوریت لانا چاہتے تھے۔ پرامن اور قانونی انتخابات کے ذریعے سے آزاد جمہوری حکومت لانا چاہتے تھے" (P. 518)

جنرل ضیاء کی ہوس خوں آشامی ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ پھر پاکستان کے طول و عرض میں پکڑ دھکڑ اور مار دھاڑ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا لیکن بھٹو کی بیٹی ایک چٹان تھی اور پیپلز پارٹی فدا کاروں اور جاں نثاروں کا بے مثال کارواں تھی اس چٹان کو راستے سے ہٹایا جا سکا اور نہ پیپلز پارٹی کے جیالوں کو جھکایا جا سکا۔ اسی جدوجہد کے دوران محترمہ کی آصف علی زرداری سے شادی ہو گئی۔ یہ شادی خاندان سے باہر تھی لیکن پورے خاندان کی رضامندی

اور خوشیاں اس میں شامل تھیں۔ آصف علی زرداری کا انتخاب محترمہ کی خالہ نے کیا اور پھر انہوں نے ہی محترمہ نصرت بھٹو کو اس کا قائل کیا اور پھر محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی آمادہ کیا۔ محترمہ کی بیان کردہ تفاصیل کے مطابق پارٹی کے کارکنوں کے بے پناہ ہجوم میں یہ شادی انجام پائی۔

جنرل ضیاء نے محمد خان جونیجو کی وزارتِ عظمیٰ ختم کردی اور اسمبلی توڑ دی۔ نا معلوم ابھی جنرل ضیاء نے اور کیا کیا حشر برپا کرنا تھے کہ خدا نے اس کی مہلت ختم کردی اور اس رسی کو کاٹ دیا جو بہت دراز ہو چکی تھی۔ 17 اگست 1988 کو بہاول پور کے فوجی ہوائی اڈے سے واپسی پر جنرل ضیاء کا طیارہ جل کر تباہ ہو گیا۔ جنرل ضیاء کے ساتھ تیس دیگر افراد بھی اس حادثے کی نذر ہو گئے۔ ان جل کر مرنے والوں میں پاکستان میں امریکی سفیر آرنلڈ رافیل اور ایک امریکی بریگیڈیئر جنرل بھی شامل تھا۔

تفصیلات کے مطابق جنرل اسلم بیگ جنرل ضیاء کے ساتھ وہیں تھا۔ وہ عین وقت پر دوسرے طیارے میں سوار ہو گیا اور جنرل ضیاء کے طیارے کو زمین چھوڑتے ہی آگ لگ گئی اور سب کچھ راکھ ہو گیا۔ محترمہ لکھتی ہیں۔

> ''پاکستان کے متعدد لوگوں نے ضیاء کی موت کو خدا کا قہر قرار دیا۔ تاہم حقیقت میں خدا کے قہر کی یہ مثال رونگٹے کھڑے کردینے والی تھی۔ طیارہ پانچ گھنٹے بری طرح جلتا رہا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ضیاء نے اسلام کے نام کا اس قدر استحصال کیا تھا کہ جب وہ مرا، خدا نے اس کا کوئی نشان تک نہیں رہنے دیا۔ میت کو غسل دینا اور جنازہ پڑھتے وقت اس کے منہ کو مکہ مکرمہ کی جانب رکھنا تجہیز و تکفین کی ایسی رسومات پر عمل نہ ہو سکا۔ شاہ فیصل مسجد کے احاطہ میں جس تابوت کو دفنایا گیا، اس میں ضیاء کے جسم کا بچا کھچا کوئی ٹکڑا نہیں تھا'' (P.602

بہر حال جو کچھ بھی ہوا ضیاء کا دورِ استبداد ختم ہو گیا لیکن اس کی باقیات موجود رہیں۔ اسحاق خان اس وقت چیئر مین سینٹ تھے، انہیں صدر بنا دیا گیا اور انہوں نے عام انتخابات کا

اعلان کر دیا۔ پوری کوشش کی گئی کہ کسی نہ کسی طرح پی پی کا راستہ روکا جائے۔ جونیجو کی بنائی ہوئی مسلم لیگ کے ہیرو میاں نواز شریف بن گئے۔ آئی ایس آئی کے سربراہ ریٹائرڈ جنرل حمید گل نے پچھلے دنوں اعتراف کیا ہے کہ اسلامی جمہوری اتحاد اسٹیبلشمنٹ نے بنوایا تھا اور اس میں میجر رول خود حمید گل نے ادا کیا تھا۔ محترمہ نے اپنی خودنوشت میں یہ لکھا ہے کہ عجیب صورت حال ہے۔ عام طور پر سیاسی پارٹیاں حکومتی پارٹی کے خلاف اتحاد بناتی ہیں لیکن یہاں یہ ہو رہا ہے کہ برسوں جس پیپلز پارٹی کو کچلا جاتا رہا، اس کے خلاف سرکار، سیاسی پارٹیوں کا اتحاد بنا رہی ہے، جس میں بہت سی سیاسی پارٹیاں شامل ہو رہی ہیں۔ سابقہ قومی اتحاد کے نام کا محاذ غریبوں کی ایک پارٹی کے خلاف اکٹھا ہو گیا ہے۔ ووٹر کے لیے شناختی کارڈ کی شرط رکھی گئی۔ مقصود یہ تھا کہ تاکہ پیپلز پارٹی کے وہ ووٹرز جو دیہات میں رہتے ہیں، ووٹ سے محروم رہیں کیونکہ ان کی اکثریت کے پاس ابھی شناختی کارڈ نہیں تھے۔ الیکشن ہوا اس میں سارے حربے آزمائے گئے لیکن پھر بھی پیپلز پارٹی کو قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہو گئی۔ سندھ میں بھی یہی اکثریت حاصل ہوئی۔ پنجاب میں بھی زیادہ تعداد میں پیپلز پارٹی کے ارکان کامیاب ہوئے لیکن اکثریت اسلامی جمہوری اتحاد کو مل گئی۔ مرکز میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت بن گئی مگر صوبہ پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت بنی اور میاں نواز شریف وزیر اعلیٰ ہو گئے۔ اسٹیبلشمنٹ نے پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کو مرکز سے برسرِ پیکار کر دیا۔ میاں نواز شریف نے مرکز سے محاذ آرائی شروع کر دی۔ محترمہ کو آزادی سے حکومت نہ کرنے دی۔ ادھر صدر اسحاق خان تھے جن کے پاس جنرل ضیاء کی 58 ٹو بی کی ننگی تلوار بھی تھی۔ محترمہ بے بس تھیں لیکن اس کے باوجود وہ غریبوں کے لیے جو کچھ کر سکتی تھیں، انہوں نے کیا۔ اس دور کا محترمہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ضیاء دور کی لائی ہوئی لوڈ شیڈنگ پر قابو پایا۔ الیکٹرک کمپنیوں کو پاکستان لائیں اور بہت سے دیہات کو بجلی پہنچائی۔ میاں نواز شریف کی صوبائی حکومت ان کے لیے قدم قدم پر رکاوٹ بنی حتیٰ کہ پیپلز ورکس پروگرام کے تحت پیپلز پارٹی کسی سکول کو چار دیواری بنا کر دیتی تھی تو صوبائی حکومت کے

ارباب کار اسے گرادینے میں پس و پیش نہ کرتے آخر اسحاق خان نے اپنی تلوار چلائی اور اسمبلیاں توڑ دیں۔ محترمہ کے پاس قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت نہیں تھی انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کی حزبِ اختلاف سے بارہا کہا کہ 58 ٹو بی کو آئینی طریقے سے ختم کرالیں لیکن حزب اختلاف نے ساتھ نہ دیا، الٹا اسحاق خان سے مطالبہ کرتی رہی کہ وہ تلوار چلائے اور آخر اس نے یہ تلوار چلا دی اور محترمہ کی حکومت وقت سے بہت پہلے ختم کر دی گئی۔ انتخابات ہوئے اب کے میاں نواز شریف کو وزارت عظمیٰ بھی مل گئی اور صوبہ پنجاب کی حکومت بھی مگر وہ بھی جلد ہی بے بس ہو گئے اور نادیدہ قوتوں نے ان کی حکومت کو بھی چلتا کیا۔ اب پھر پیپلز پارٹی کی حکومت آ گئی۔ اس مرتبہ محترمہ نے اپنے ایک قابل اعتماد ساتھی فاروق لغاری کو صدر بنوایا مگر اسٹیبلشمنٹ نے اسے قابو کر لیا اور وہ میاں نواز شریف کی کوششوں کا حصہ بن گیا۔ اسی دور میں افراتفری کو ایجنسیوں نے اس انتہاء تک پہنچا دیا کہ محترمہ کا اپنا بھائی میر مرتضیٰ بھٹو قتل کر دیا گیا اور الزام محترمہ کے خاوند آصف علی زرداری پر ڈال دیا گیا آخر فاروق لغاری نے بھی اسمبلی توڑ دی اور انتخاب کرائے تو میاں نواز شرف کو بھاری مینڈیٹ والی حکومت مل گئی حکومت کے خاتمے پر آصف علی زرداری کو قید کر لیا گیا تھا اب اس پر طرح طرح کے کیس بنا دیئے گئے۔ میاں صاحب نے 58 ٹو بی دو تہائی اکثریت کے باعث ختم کرا دی اور جلد ہی پرویز مشرف کو اس کی عدم موجودگی میں برطرف کیا تو فوجی جرنیلوں نے نہ صرف ان کا حکم ماننے سے انکار کر دیا بلکہ ان کی حکومت پر شبخون مارا اور انہیں گرفتار کر لیا۔ ان پر مقدمات قائم کیئے گئے۔ میاں صاحب کی پارٹی کے صفِ اول کے بہت سے لیڈر جا کر جنرل پرویز مشرف کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ میاں صاحب کچھ عرصہ جیل میں رہے پھر پرویز مشرف سے ایک ڈیل کے ذریعے سعودی عرب چلے گئے۔ آصف علی زرداری جیل کی پر مصیبت زندگی گزارتے رہے۔ جنرل پرویز مشرف نے بھی اپنی تقریباً ہر تقریر میں آصف علی زرداری اور محترمہ بے نظیر بھٹو پر کرپشن کے وہی الزامات دہرائے جن کے کیس میاں صاحب بنا کر گئے تھے۔ محترمہ کے بچوں کو یہاں کسی سکول میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ وہ بچوں کو ساتھ لے کر دبئی چلی

گئیں ان کی انتہائی بیمار والدہ بھی ان کے پاس تھیں۔ یہاں ایسی فضا پیدا کر دی گئی کہ محترمہ جب بھی آئیں انہیں گرفتار کر لیا جائے۔ اپنی جلاوطنی کے دوران دنیا کی کئی اعلیٰ یونیورسٹیوں کی دعوت پر وہ لیکچر دیتی رہیں۔ دانشوروں کے ہر عالمی سیمینار میں انہیں امتیازی شان سے لیکچر کی خاطر بلایا جاتا تھا۔ ایسے سیمیناروں میں انہیں چیف گیسٹ کی حیثیت دی جاتی اور ان کی تقریر کو ایک بلند پایہ عالمی مفکر کی تقریر کے طور پر سنا جاتا۔ وہ صرف ایک سیاسی لیڈر نہیں تھیں بلکہ بین الاقوامی سیاسی و معاشرتی حالات پر گہری نظر رکھنے والی مفکر تھیں۔ ان کی آخری کتاب ان کی اس حیثیت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ اسے آج بھی ایک رہنما کتاب کے طور پر پڑھا جا رہا ہے۔ جنرل پرویز مشرف دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جب امریکہ کا صفِ اول کا اتحادی بنا اور غیر کی جنگ کو اپنے گھر لے آیا تو وہ اپنے ملک میں غیر مقبول ہوتا گیا پھر اس نے جس شوکت عزیز کو دنیا کا عظیم ماہر معاشیات گردان کر وزیراعظم کے عہدے پر فائز کیا، اس کی غلط معاشی پالیسیوں نے ملک کی اقتصادیات تباہ کر دی، تو جنرل پرویز مشرف کی حکومت ڈانواں ڈول ہونے لگی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اس ملک کا غیر مقبول ترین آدمی ہے۔ اسے اس کی مقبولیت کے جتنے قصے سنائے گئے، وہ سب جھوٹے تھے دو جلاوطن سیاسی لیڈر محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف جنہیں اسٹیبلشمنٹ نے مخصوص مقاصد کے تحت ہمیشہ آپس میں برسر پیکار رکھا تھا، اب ان میں صلح ہو چکی تھی۔ دونوں نے سابقہ مخالفت کو اپنی غلط فہمیوں کا شاخسانہ تسلیم کر کے میثاقِ جمہوریت پر دستخط کئے تھے۔ مشرف جان چکا تھا، وہ ان قوتوں کو فنا نہیں کر سکا۔ اس نے جتنا انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی، اتنی ان کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ اس حقیقت کو جان کر اس نے محترمہ سے رابطے کئے اور کوشش کی وہ وطن واپس آ کر اسے سہارا دیں۔ محترمہ کو واسطہ دیا گیا کہ ملک کو خطرات سے نکالیں۔ محترمہ کو متحدہ پاکستان سے عشق تھا پاکستان کے غریب عوام سے عشق تھا کیونکہ ان کے عظیم والد نے انہیں جیل سے جو خطوط لکھے تھے، ان میں سے ایک خط میں انہوں نے لکھا تھا۔

”پیاری بیٹی آخرت کی جنت تمہاری ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ یہ بالکل

درست اور برحق بات ہے اسی طرح کی ایک اور بالکل درست اور برحق بات یہ ہے کہ اس دنیا کی جنت تمہارے ملک کے غریب عوام کے قدموں کے نیچے ہے مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی یہ دونوں جنتیں حاصل کرے گی"۔

عظیم بیٹی نے عظیم باپ کے ان الفاظ کی زندگی بھر پاسبانی کی، چنانچہ وہ اپنا ملک بچانے اور ملک کے عوام کا مقدر سنوارنے کے خواب لیے واپس پاکستان آنے پر رضامند ہوگئیں۔آصف علی زرداری آٹھ نو سال جیل میں رہے اور جیل کی مصیبتوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔میاں نواز شریف کے دور میں ان پر مختلف مقدمات بنائے گئے تھے میڈیا میں انہیں خوب بدنام کیا گیا تھا لیکن انہوں نے اپنے کردار اور استقلال و پامردی سے ثابت کردیا کہ ان پر لگائے گئے الزامات جھوٹے تھے، کسی عدالت میں کوئی کیس ثابت نہ ہوسکا حالانکہ حکومت میاں نواز شریف کی تھی یا پھر جنرل پرویز مشرف کی اور ظاہر ہے کہ ان حکومتوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوگا، جب میاں نواز شریف بھی ابتلاء کا شکار ہوئے تو انہوں نے بھی حقیقت کو سمجھ لیا کہ ان کو لڑانے والی قوتیں دراصل اپنے مفادات حاصل کر رہی تھیں۔انہوں نے تسلیم کیا کہ انہوں نے ماضی میں غلطیاں کیں۔ بہرحال محترمہ نے واپسی کا فیصلہ کرلیا۔پرویز مشرف نے مفاہمتی آرڈیننس کے نفاذ کا وعدہ کیا جس کے تحت ان تمام مقدمات کو ختم ہونا تھا جو سیاسی اختلاف پر بدنیتی سے مخالفین پر بنائے گئے تھے۔اس آرڈیننس کے نفاذ کے بعد بے شمار لوگوں کے مقدمات ختم ہوئے لیکن وہ سیاسی بونے جو پیپلز پارٹی کی عوامی مقبولیت سے ہمیشہ خائف رہے، انہوں نے محترمہ کے خلاف ڈیل ڈیل کا شور مچایا اور یہ شور مچا ہوا تھا کہ محترمہ نے پرویز مشرف سے کہا! جب تک تم وردی نہیں اتارو گے اور آرمی چیف کے عہدے سے ریٹائرمنٹ نہیں لو گے ہماری آپس میں بات چیت آگے نہیں بڑھے گی۔جنرل مشرف ہر طرف سے مجبور تھا۔اس نے محترمہ کی بات مان لی اور وردی اتار کر آرمی چیف کے عہدے سے ریٹائر ہوگیا۔

18 اکتوبر 2007ء کو محترمہ وطن واپس آئیں۔ کراچی ایئرپورٹ پر لاکھوں لوگ

استقبال کو پہنچے۔ پورا شہر اور شہر کی ساری سڑکیں استقبالی جلوسوں سے بھر گئیں۔ ابھی ملک کے طول وعرض سے سینکڑوں جلوس کراچی آرہے تھے سازشیوں نے محترمہ کے قتل کا جال بن رکھا تھا۔ خودکش حملے ہوئے محترمہ اور اعلیٰ درجے کی قیادت ایک ہی بلٹ پروف ٹرک میں تھے۔ حملہ اگر کامیاب ہو جاتا تو محترمہ کے ساتھ پیپلز پارٹی کے دوسرے قائدین بھی نشانہ بن جاتے لیکن محترمہ کے جاں نثار کارکنوں نے اپنی جان پر کھیل کر یہ حملہ ناکام بنایا۔ اس میں سینکڑوں کارکن شہید اور زخمی ہوئے۔ اس حملے کے بعد ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ جائے وقوعہ سے فوراً تمام نشانات دھو دیئے گئے۔ مستقبل کے تمام خطرات واضح ہو گئے تھے۔ کھل گیا تھا کہ اس ملک میں جمہوریت کے علمبرداروں کا حشر کیا ہوتا ہے۔ محترمہ نے بے مثال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ انتخابات کے لیے جدوجہد جاری رکھیں گی اور ملک کو تمام اندرونی خطرات سے نجات دلانے کے لیے سینہ سپر رہیں گی۔ انہوں نے انتخابی جلسے شروع کر دیئے۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں آمریت اور مذہبی انتہا پسندی کی کھل کر مخالفت کی اور ہر جگہ برملا اعلان کیا کہ وہ عوام کے ساتھ کئے ہوئے، وہ تمام وعدے پورے کریں گی جو قائدعوام نے پیپلز پارٹی کے بنیادی منشور میں تحریر کئے تھے۔ انہوں نے صاف کہا کہ وہ جمہوریت کے قیام کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ وہ پاکستان کے تمام صوبوں کے عوام کو آزادی، امن معاشی خوشحالی اور انصاف دلائیں گی۔ محترمہ کے ہی مطالبات پر میاں نواز شریف کی واپسی کی راہ ہموار ہوئی۔ میاں صاحب نے یہاں آکر اے پی ڈی ایم اور وکلاء کے الیکشن بائیکاٹ کے نعروں کا ساتھ دیا اور اے پی ڈی ایم کے جلسہء عام میں اعلان کیا کہ وہ محترمہ کے پاس جائیں گے اور انہیں بھی بائیکاٹ پر آمادہ کریں گے۔ میاں صاحب محترمہ کو سمجھانے گئے تھے کہ وہ بھی الیکشن کا بائیکاٹ کریں لیکن محترمہ نے انہیں قائل کر لیا کہ الیکشن میں حصہ لینا ضروری ہے کیونکہ اگر ان دو بڑی سیاسی پارٹیوں نے خود کو الیکشن سے باہر کر لیا تو بھی الیکشن رک نہیں سکتا۔ الیکشن کرا دیا جائے گا اور ق لیگ کو کھلا میدان مل جائے گا اور جنرل پرویز مشرف دنیا کو یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو جائے

گا کہ دونوں بڑی سیاسی پارٹیاں اپنی ہار دیکھ کر میدان سے بھاگ گئیں کیونکہ جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف اوران سے وابستہ ق لیگ اور ایم کیو ایم وغیرہ، مقبول ترین سیاسی پارٹیاں ہیں۔ محترمہ کے سمجھانے سے میاں نواز شریف بھی بات سمجھ گئے اور اے پی ڈی ایم اور وکلاء کے الیکشن بائیکاٹ کے فیصلے سے منحرف ہوکر الیکشن میں حصہ لینے پر آمادہ ہو گئے۔

محترمہ کا آخری جلسہ راولپنڈی کے لیاقت باغ میں تھا، اس جلسہ میں ان کی تقریر مثالی تقریر تھی۔ جلسہ بہت کامیاب رہا جلسے سے فراغت کے بعد محترمہ بہت مسرور جلسہ گاہ سے نکلیں اور انہیں شہید کر دیا گیا۔ ان کی شہادت پر بہت کچھ لکھا گیا۔ محترمہ وہ واحد سیاسی قائد تھیں جن کی موت پر پوری دنیا میں سوگ منایا گیا۔ قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت پر اس ملک کی بعض سیاسی پارٹیوں نے اپنی بد باطنی کا مظاہرہ کیا اور ان کے لیڈروں نے حلوے بانٹے مگر محترمہ کی شہادت پر دوست دشمن سب نے آنسو بہائے۔ وہ فی الواقع پاکستان کا اور دنیا کے تمام جمہوریت پسند عوام کا بہت بڑا اسرمایہ تھیں۔ جن تاریک ضمیر لوگوں نے ان کے قتل کی سازش کی اور پھر یہ بھیانک جرم کیا وہ پاکستان کے دشمن تھے اور انہوں نے جمہوریت پسند لوگوں کے دل و دماغ کو تباہ کر دیا'' چاروں صوبوں کی زنجیر بے نظیر بے نظیر'' صرف ایک نعرہ نہیں تھا، بہت بڑی حقیقت تھی۔ فی الواقع محترمہ پاکستان کے چاروں صوبوں کو متحد رکھنے والی زنجیر تھیں۔ ان کی سوچ پاکستان کو جمہوریت پسند ترقی یافتہ اور خوشحالی بنانے کی سوچ تھی۔ قاتلوں نے بھٹو کو قتل کر کے گمان کر لیا تھا کہ پیپلز پارٹی مر گئی ہے لیکن خود انہوں نے دیکھ لیا کہ بھٹو موت کے بعد ایک زندہ، جاندار اور مضبوط تحریک بن گیا ہے۔ بہادر باپ کی بہادر بیٹی نے اس تحریک کو اپنا لہو دے کر اور زیادہ زندہ اور روشن کر دیا ہے۔ محترمہ کو اب کوئی نہیں مار سکتا کیونکہ وہ زندہ جاوید ہو گئی ہیں۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

شہید بے نظیر بھٹو کی سوانح حیات

''دختر مشرق''

سے چند اقتباسات

(ذیل میں محترمہ کی خودنوشت کے چند اقتباسات دیئے گئے ہیں۔آپ انہیں پڑھ کر ان کی مدبرانہ سوچ اور ملکی و عالمی حالات پر ان کی دور رس نظر کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ان اقتباسات سے معلوم ہوگا کہ وہ اپنے قتل کی سازش کرنیوالوں کی سوچ کا حقیقی ادراک رکھتی تھیں۔محترمہ کو زندگی بھر جو کٹھی لڑائی لڑنا پڑی اور ان کی صلاحیتوں پر غور کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے وہ کسی حال میں بھی اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں بن سکتی تھیں اور یہی بات اسٹیبلشمنٹ کو سخت ناگوار تھی۔محترمہ جامع حیثیات شخصیت تھیں اور ان کی ہر حیثیت بے مثال و بے نظیر تھی وہ ایک بہادر، دوربین اور دروں بین عالمی سیاسی لیڈر تھیں وہ ایک عملیت پسند فلسفی تھیں وہ ایک سعادت مند بیٹی تھیں وہ ایک وفاشعار بیوی تھیں وہ ایک محبت کرنے والی فرض شناس ماں تھیں وہ غریب عوام پر جان چھڑکنے والی پر ایثار قائد تھیں ایسی صفات اور ایسے اوصاف رکھنے والے بہت کم لوگ ہوتے ہیں اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی پارٹی کو استحکام بخشے اور ملک کو اس جمہوریت سے ہمکنار کرے جس کے خواب محترمہ ادھورے چھوڑ گئی ہیں۔آمین۔)

جس بات پر مجھے بہت زیادہ فخر ہے، وہ یہ ہے کہ ہم نے ایک ایسے معاشرے میں خواتین کے حقوق کے فروغ کے کام کو مکمل کیا جہاں کافی عرصے سے انہیں نظرانداز کیا جارہا تھا اور جہاں کھلے عام ان سے برا سلوک کیا جاتا تھا، میں نے اپنی کابینہ میں متعدد خواتین کو شامل کیا اور ترقی نسواں کی وزارت قائم کی۔ہم نے یونیورسٹیوں میں خواتین کی تعلیم کے پروگرام شروع کیے۔اس امر کو یقینی بنایا کہ جیل میں قید خواتین بہتر طریقے سے قانونی مشورہ

اور نمائندگی کی سہولت حاصل کر سکیں۔

ہم نے صرف خواتین کو قرضہ دینے کے لیے وویمن ڈویلپمنٹ بینک قائم کیا۔ علاوہ ازیں خواتین کو عام بینکوں سے قرضہ لینے کی سہولت بھی حاصل تھی، ہم نے خاندانی منصوبہ بندی، غذائیت کے متعلق مشاورت، چائلڈ کیئر اور برتھ کنٹرول کے لیے ادارے تشکیل دیے۔ بین الاقوامی سطح پر منعقد ہونے والے کھیلوں کے مقابلے میں خواتین کی شرکت کو قانونی شکل دی اور اس عمل کی حوصلہ افزائی کی، جس پر ضیاء نے فوجی آمریت میں پابندی عائد کی تھی۔

یہ ایک ایسے معاشرے میں ٹھوس آغاز تھا، جہاں ایک مشکل دہائی میں اسلام کو معاشرے میں خواتین کی حیثیت کو دبانے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ ہم نے تمام سیاسی اور انتظامی رکاوٹوں کے باوجود یہ امور سرانجام دیے، جب میں پہلی دفعہ وزیراعظم کے دفتر میں گئی تو وہاں ڈپٹی سیکرٹری کے علاوہ اور کوئی سٹاف موجود نہیں تھا۔ مجھے فوری طور پر ایک ٹیم کو لندن بھیجنا پڑا تاکہ وہ یہ معلوم کر سکیں کہ برطانوی وزیراعظم کا دفتر کس طرح کام کرتا ہے۔ اس طرح میرے دفتر کو مکمل انداز میں کام کرنے کے قابل بنایا جا سکے۔ علاوہ ازیں کئی روز تک مجھے فائلیں نہ بھیجی گئیں۔ کیبنٹ سیکرٹری کو ہدایت دی گئی تھی کہ فائلیں ایوان صدر بھیجی جائیں۔

میری حکومت کے پہلے دور میں سب سے اہم مسئلہ ہمسایہ ملک افغانستان کی صورت حال تھی۔ 1979ء میں جب سوویت یونین نے افغانستان پر قبضہ کیا تو پاکستان نے مجاہدین کی مدد کرنے کے لیے امریکہ کی شراکت داری میں کام کیا۔ امریکہ کے لیے اس کی حیثیت سرد جنگ کی حکمت عملی کے فعل جیسی تھی۔ اسی سوچ نے اسے مداخلت کی تحریک دی۔ امریکہ کو افغانستان میں سوویت یونین کو اس کے وسائل اور منشاء سے محروم کرنے کا راستہ نظر آیا۔ اس نے سوویت یونین کے غلط حملے اور قبضے سے فائدے اٹھانے کی کوشش کی۔ افغانوں، پاکستان کی آئی ایس آئی اور فوج کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا، افغانستان

میں روس کے خلاف خونیں اور بالآخر مکمل جنگ کی جس کا نتیجہ 1990ء میں براہ راست سقوط روس کی صورت میں نکلا۔

افغانستان میں پاکستان کے مفاد کی نوعیت پیچیدہ اور کثیر الجہتی تھی۔ افغانستان کا پاکستان کے ساتھ دیرینہ تنازعہ تھا جو ''ڈیورنڈ لائن'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں 1947ء میں جب برصغیر کی تقسیم ہوئی تو پشتونوں کے اہم عناصر نے پاکستان کے قیام کی مخالفت کی۔

اہم افغان شخصیات کے بھارت کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ افغانوں کے دلوں میں پاکستان کے بارے میں شکوک وشبہات اور بداعتمادی کے احساسات تھے۔ افغانستان کے صدر داؤد نے 1970ء میں پاکستان کے قبائلی علاقے میں بغاوت کی حمایت کی تھی۔ جس کا جواب ہم نے ڈیورنڈ لائن کے پار جوابی بغاوت کی صورت میں دیا، دونوں ممالک کے درمیان سرحد حالت التوا میں تھی۔ فروری 1989ء میں جنیوا مذاکرات کی شرائط کے تحت افغانستان سے روسی افواج کے فوری انخلاء کے ساتھ پاکستان نے عبوری افغان حکومت کی تشکیل میں مدد دی۔ جنرلوں نے سفارشات پیش کیں کہ ہم افغان لیڈر سیاف کو صدر بناتے ہیں اور حکمت یار کو وزیراعظم کے عہدے پر برقرار رہنے دیتے ہیں۔ میں نے اس سے اتفاق نہ کیا، میں نے فوج سے کہا۔ آپ کے خیالات اور میری حکومت کی سوچ میں سمجھوتہ ہونا چاہیے، میں صدر کے طور پر ایک اعتدال پسند کی حمایت کرنا چاہتی ہوں، آپ اپنی پسند کے کسی شخص کو وزیراعظم بنا سکتے ہیں۔ ہماری کوششوں کے ساتھ افغان گروپوں نے صدر مجددی اور وزیراعظم سیاف کو افغان عبوری حکومت کے رہنماؤں کے طور پر قبول کرلیا۔ یہ کوئی آسان راستہ نہیں تھا۔ ایوان صدر میں ہمارے طویل اجلاس ہوئے۔ جہاں ہم پیپلز اسمبلی کے لیے افغان گروپوں میں اتفاق رائے پیدا کرنے کی سخت کوشش کرتے، جب کبھی اذان کی آواز آتی، تمام آدمی چلے جاتے اور میں اکیلی رہ جاتی۔ انہیں یہ گوارہ نہیں تھا کہ ایک عورت ان کے ساتھ نماز میں شریک ہو، مجھے یہ صورت حال بہت

عجیب محسوس ہوتی کیونکہ کعبہ شریف میں تمام مرد اور عورتیں اکٹھے دعا کرتے ہیں۔ اسی طرح مدینہ النبی میں بھی اکٹھے دعا کی جاتی ہے۔

سعودی انٹیلی جنس چیف شہزادہ ترکی بن فیصل اور ایرانی وزیر خارجہ اکثر دورے کرتے ہر دفعہ جب میں نے اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کی مجھے میری انٹیلی جنس ایجنسیوں نے مطلع کیا کہ یا تو سعودی یہ نہیں چاہتے کیونکہ شیعہ فرقہ کو غیر متناسب حصہ دیا جارہا تھا یا ایرانی یہ نہیں چاہتے کیونکہ سنیوں کو غیر متناسب حصہ دیا جارہا تھا، روم میں جلاوطن افغان صدر مجھے اور میرے ساتھیوں کو قدرتی غیر جانبدار شخصیت دکھائی دیے، لیکن ایرانی بادشاہ ان کو نہیں چاہتے تھے، میں نے افغان گروپوں کے ساتھ بحث و تمحیص کے عمل کے لیے بہت زیادہ وقت دیا۔ مجھے اکثر محسوس ہوا کہ وہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اہل کاروں سے بریفنگ پوائنٹس لیتے تھے۔ اسی لیے وہ سمجھوتہ نہ کر سکے۔ انٹیلی جنس سروس نے اصرار کیا کہ وہ افغانوں کو قائل نہیں کر سکی۔ اس لیے ہمیں خاموشی سے اشاروں کو سمجھ کر کھیل کھیلنا ہوگا۔ مجھے افغانوں کی حالت زار دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ وہ طاقت ور غیر ملکی قوتوں میں کچلے گئے تھے اور اگر وہ اپنے سرپرستوں کی پالیسی سے انحراف کرتے تو ان کا انجام تباہی پر ہوتا۔

جنرل ضیاء مولانا مودودی کے بہت قریب تھے

پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء مولانا مودودی کے بہت قریب تھے جو جماعت اسلامی کے مذہبی رہنما تھے اور اسلامی برادری میں ان کی قائدانہ حیثیت نہ تھی۔ جب سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کیا جنرل ضیاء نے جماعت اسلامی سے رجوع کیا اور اس کے ذریعے اسلامی برادری سے مدد کے لیے رابطہ کیا انہوں نے مولانا مودودی کے کام کو فوج کے نصاب میں متعارف کرایا اور فوج اور تعلیمی اداروں کو اعتدال پسندوں سے پاک کیا۔ جلد ہی آئی جے آئی کو فنڈز دیے تا کہ وہ ہیڈ کوارٹرز بنائیں۔ نام نہاد تھنک ٹینکس کی تشکیل کریں اور فوجی حکومت کو مشورہ دیں کہ مہاجرین کیمپوں کے بچوں کو متاثر کرنے کے لیے انتہا پسند مدرسے قائم کرنے کے لیے فنڈز کو کیسے استعمال کیا جائے۔ اسلامی دنیا میں

فنڈز جمع کرنے کے لیے سرگرمیاں شروع کی گئیں جہاں فرض شناس غریب اور ضرورت مند لوگوں کے لیے تعلیم، صحت اور خوراک کے لیے چندہ دیتے۔ یہ رقم ان سیاسی مدرسوں میں گئی جن کا دعویٰ تھا کہ وہ مہاجر کیمپوں کے یتیم بچوں کو تعلیم دے رہے ہیں اور ان کی پرورش کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہ ادارے نفرت اور دہشت گردی کی تبلیغ کر رہے تھے۔

انٹرنیشنل فنڈز پاکستان میں آئے، تاہم ان کا رخ آئی ایس آئی کے ہیڈکوارٹرز کی طرف موڑ دیا گیا۔ ضیاء نے اس نقطہء نظر پر اصرار کیا کہ سی آئی اے اور دوسری تنظیموں اور ملکوں کی طرف سے دیے جانے والے فنڈز کا معاملہ ان کی فوجی حکومت پر چھوڑ دیا جائے جو مجاہدین کے معاملات کو منضبط کرے۔ امریکہ نے ان پر مہربانی کی۔ اس سے پاکستان کی فوج کو یہ موقع مل گیا کہ وہ نظریاتی اعتبار سے انتہائی سخت، مذہبی بنیاد پرستوں اور خون کے پیاسے گروپ پر نوازشات کرے۔ ان کی تربیت کرے انہیں فنڈز اور اسلحہ فراہم کرے۔ یہ ایسا فیصلہ تھا جس کو قلیل المدت مقاصد کے لیے دفاع کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ان کے طویل المدت نتائج دنیا پر منڈلاتے رہیں گے۔

جب میں نے 1989ء میں امریکہ کا دورہ کیا تو وائٹ ہاؤس میں صدر بش اور مسز بش کی طرف سے میرے اعزاز میں دیا گیا شاندار سٹیٹ ڈنر عوام کی زبردست توجہ کا مرکز بنا۔ کانگریس کے مشترکہ سیشن میں میرا زبردست استقبال میرے لیے اور میرے ملک کے لیے زبردست موقع تھا۔ لیکن اس دورے کے دوران ایک اور واقعہ پیش آیا جو میرے لیے بہت زیادہ اہمیت کا باعث تھا۔ جب میں نے صدر بش کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں الگ ملاقات کی تو میں نے انہیں اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ میں نے کہا کہ افغانستان میں سوویت یونین کے ساتھ موثر طریقے سے مقابلہ کرنا ہمارا مشترکہ جذبہ تھا، ہمارے ملکوں نے مجاہدین میں سے سب سے زیادہ جنونی عناصر کو طاقت دینے کا سٹریٹیجک فیصلہ کیا جو بعد میں قابو سے باہر ہو سکتا ہے۔ میں نے صدر بش سے افسردگی سے کہا "جناب صدر! میں خوف زدہ ہوں کہ ہم نے فرینکنسٹائن کی عفریت تخلیق کر دی ہے جو مستقبل میں واپس آ کر ہمیں خوف زدہ

کر سکتی ہے۔

یہ المناک تھا کہ میں نے مستقبل کے واقعات کی پیشین گوئی کردی تھی۔ امریکی روسیوں کو شکست دینے کا قلیل المدت مقصد حاصل کر کے افغانستان چھوڑ گئے۔ جمہوریت کو موقع ملنا چاہیے تھا تاہم اس مقصد کے لیے اور جمہوریت کو مستحکم کرنے کے لیے بین الاقوامی امداد کی ضرورت تھی تاکہ اسے فوج کی طرف سے عدم استحکام کرنے کی کوششوں سے تحفظ دیا جاسکتا۔ لیکن اس مقصد کے لیے بین الاقوامی امداد حاصل نہیں تھی۔ روسیوں کے جانے کے بعد دیوار برلن کے انہدام کے ساتھ یورپ میں ڈرامائی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ دنیا کی توجہ اب اور طرف مبذول ہوچکی تھی۔

اگرچہ بہت کم لوگوں کو اس وقت اس حقیقت کا ادراک تھا۔ افغانستان میں سوویت تسلط کا خاتمہ ایک نئی جنگ کا آغاز تھا، انتہاپسند مذہب کا نام لے کر مغرب سے مقابلہ کرنے کے لیے پرعزم ہوگئے۔ ان کے نزدیک اعتدال پسند پی پی اور میں ان کی اس فتح کے خوابوں کے راستے میں خطرات کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس کی بنیاد اسلامی دنیا کے عوام کے مذہبی جذبات کے استحصال کرنے پر تھی۔

سوویت یونین کو طاقت کے ذریعے باہر نکالنے کے تجربے اور اس کے نتیجے میں عالمی طاقت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کی حقیقت نے انتہاپسندوں پر نشہ طاری کردیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مغرب سے بھی مقابلہ کرسکتے ہیں مغربی انٹیلی جنس کی اہم شخصیات میری نسبت جنرل ضیاء سے معاملات طے کرنے میں زیادہ آسانی محسوس کرتی تھیں۔ میں ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی تھی، جسے وہ سوشلسٹ اور پاکستان کے جوہری پروگرام کا بانی تصور کرتے تھے، علاوہ ازیں میرے بھائیوں نے سوویت قبضے کے دوران افغانستان میں ''الذوالفقار'' کی تشکیل کی تھی۔

ایک مغرب نواز جنرل نے مجھے کہا آپ کی فوج نے روسیوں کو شکست دی ہے اور آپ کی طرف سے ایک کال پر ہم امریکہ کو شکست دے سکتے ہیں میں نے اس ششدر کردینے

والے بیان کا اپنے ایک سفیر سے ذکر کیا وہ فوراً چلے گئے اور میری گفتگو امریکی سفیر تک پہنچا دی جس نے ان سے کہا یہ کبھی سچ نہیں ہو سکتا۔ وہ شخص الکوحل پیتا ہے۔

پھولوں کے گملے میں بم

میری حکومت کے پہلے ہفتے جب میں لاہور اتری، پھولوں کے گملے سے ایک بم برآمد ہوا اس نے اس وقت چلنا تھا جب میں نے اس کے پاس سے گزرنا تھا عوام کو میرے خلاف کرنے کے لیے افواہیں پھیلا کر لوگوں کو سڑکوں پر لانے کی بار بار کوشش کی گئی۔ ان میں ایک احمقانہ مثال ان کا یہ الزام تھا کہ ایسے ملک کی وزیر اعظم نے پیرس سے مہنگے دوپٹے خریدے ہیں جس کے عوام غریب ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ میں نے یہ دوپٹے کراچی کے ایک بازار سے خریدے اور میں پاکستان کے عوام کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس طرح کی احمقانہ افواہوں کو مسترد کر دیا اور میرا ساتھ دیا جس نے پاکستانی معاشرے میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔

مجھے نئی انٹیلی جنس بنانے کی تجویز دی گئی

میرے انتخاب کے ایک ماہ کے اندر آئی ایس آئی کے سربراہ بریگیڈیئر امتیاز اور ان کے ڈپٹی نے میرے اراکین اسمبلی سے رابطے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ ان اراکین پارلیمنٹ کو مجھے چھوڑنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ ان کا پسندیدہ انداز یہ تھا کوئی اسے نہیں چاہتا، امریکی اسے انہیں چاہتے، فوج اسے نہیں چاہتی اور جوں ہی وہ حکومت سے باہر ہوتی ہے اس کا شوہر بھی اسے اچانک چھوڑ دے گا۔

افغانستان میں جہاد کی کامیابی کے ساتھ ان کا منصوبہ تھا کہ مغرب کی طاقت اور اقتدار کا مقابلہ کیا جائے کیونکہ حکومت کی باگ ڈور میرے ہاتھوں میں تھی۔ اس لیے وہ کام آزادانہ طریقے سے سرانجام نہ دے سکے۔ آئی ایس آئی نے ڈکٹیٹر ضیاء کے ''سیاسی فرزند'' نواز شریف کو وزیر اعظم بنانے کا عہد کیا۔ نواز جو پہلے ہی وزیر اعلیٰ پنجاب کے عہدے پر فائز تھے نے اعلان کیا کہ وہ احکام کی مزاحمت کریں گے تاکہ عملی طور پر پورے ملک کی بجائے

میں صرف اسلام آباد کی وزیر اعظم بننے تک ہی محدود رہوں۔

آئی ایس آئی کے سربراہ نے میری سیاسی بنیاد کا مقابلہ کرنے کے لیے انٹیلی جنس کا دائرہ کار بڑھانے کے لیے مجھے تجویز پیش کی کہ میں تسلسل برقرار رکھنے کے لیے ایک نئی انٹیلی جنس کور کی تشکیل کروں۔ مجھے کہا گیا کہ تمام سینئر سرکاری افسروں کی ترقیوں سے پہلے آئی ایس آئی کے ذریعے چھان بین کی جائے۔ میں نے یہ تجویز مسترد کر دی اور اسے کہا جنرل ضیاء نے سوویت یونین اور بھارت کے ساتھ دو محاذ جنگ کا سامنا کیا لیکن انہیں گاؤں کی سطح پر بھی الگ فوجی کور کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور میں بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ آئی ایس آئی کے سربراہ نے اصرار کیا۔ ان کا موقف تھا کہ آئی ایس آئی کی توسیع کے بغیر اور ان ہی افسروں کے تسلسل کے بغیر ملک کی نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کے لیے سکیورٹی کنٹرول برقرار رکھنا مشکل ہے۔ مجھے کہا جارہا تھا کہ میں ''ریاست کے اندر ریاست'' بنانے کے لیے حکم دوں اور اس عمل کو قانونی جواز بھی مہیا کروں جو پاکستان میں انتخابات سمیت زندگی کے ہر پہلو میں جوڑ توڑ کرنے کا باعث ہوتا۔ میں نے انکار کر دیا تاہم میری حکومت برطرف کیے جانے کے بعد عبوری وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی (جسے آئی ایس آئی لائی) نے ان کی سکیم پر عمل کیا۔ جنرلوں کی سیاسی مخالفت کے باوجود مجھے فوج کی طرف سے زبردست حمایت ملنے کا سلسلہ جاری رہا۔ 23 مارچ 1989ء کو جب جنرل بیگ اور میں اپنی پہلی مارچ پاسٹ پریڈ میں گئے تو فوجیوں کے خاندان گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے میری کار کے گرد اکٹھے ہو گئے، اور کار کی رفتار کم کرنے کے لیے مجبور کیا۔ جنرل بیگ نے جو عوام کی محبت کے اظہار کے طریقوں سے ناآشنا تھے نے پریشانی سے پوچھا ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میرے ملٹری سیکرٹری نے جواب دیا فوجیوں کے خاندان وزیر اعظم کو دیکھ کر خوش ہیں بیگ خوش نہ تھے۔ فوج اور جنرلوں میں دو دہائیوں کے تصادم کے باوجود میں ہزاروں اور سینکڑوں میں یہ امتیاز کر لیتی ہوں کہ چند مٹھی بھر افسروں کے برخلاف عزت اور وقار سے ملک کی خدمت کروں جنھوں نے میری مخالفت کی ان افسروں

پر افغان جہاد کے اثرات تھے۔

میں نے خاتون کو وزیر اعظم بنانے کے نکتہ پر او آئی سی میں پاکستان کی رکنیت معطل کرنے کی کوشش کامیابی سے ناکام بنائی۔ مختلف اسلامی ممالک کے علماء میرے انتخاب کے متعلق جھگڑے پر اتر آئے وہ مختلف فتوے اور حکم دینے لگے۔ بد قسمتی سے ایک سعودی عالم دین شیخ باز جونابینا تھے لیکن ممتاز حیثیت رکھتے تھے میرے متعلق فتویٰ دیا کہ مسلمان ملک کی سربراہی کرنا عورت کے لیے غیر اسلامی فعل ہے، تاہم میں خوش قسمت ہوں کہ چین، شام، مصر، عراق جہاں زیادہ سیکولر حکومتیں ہیں ان کے علماء نے اس صورت حال سے مجھے نجات دلائی۔

اگرچہ 1989ء میں اسامہ بن لادن نے القاعدہ کی تشکیل نہیں کی تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کا نام اس وقت سنا جب اس نے میری پہلی حکومت کو برطرف کرنے کے لیے عدم اعتماد کی تحریک کے بل کے لیے فنڈز دیے وہ فروری 1989ء میں سوویت یونین کی فوجوں کے انخلاء کے بعد سعودی عرب واپس آ گئے تھے لیکن جب میں نے مئی میں آئی ایس آئی پر اپنا دعویٰ منوالیا تو انہیں واپس بلایا گیا۔ اسامہ بن لادن کو آئی ایس آئی نے کہا کہ وہ جمہوری حکومت کو گرانے اور مذہبی حکومت قائم کرنے کے لیے مدد دیں۔ بن لادن نے 10 ملین ڈالر کی بڑی رقم تحریک عدم اعتماد کے لیے دی تاکہ اس رقم سے میری حمایت کرنے والے ارکین پارلیمنٹ کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔ افغانستان کی جنگ ختم ہونے کے بعد بن لادن کی پاکستانی سیاست میں اچانک مداخلت کو ایک ابتدائی علامت کے طور پر پڑھ لیا جانا چاہیے تھا اور اس امر کو سمجھ لیا جانا چاہیے تھا، تاکہ اس کا مقصد اور دوسرے لوگوں کے ساتھ جنہوں نے جہاد کی حمایت کی ایک اسلامی ملک سے سوویت تسلط پسندوں کو نکالنے سے بہت بڑا تھا۔ یہ حقیقت میں اسلامی ریاستوں میں خلافت کا بگڑا ہوا تصور تھا، جو یورپ، ایشیا اور افریقہ میں مذہبی انتہا پسندوں کے کنٹرول کے تحت پھیل رہا تھا۔

کسی بھی صورت میں مجاہدین جو کسی وقت امریکہ اور مغرب کے قریبی دوست تھے

اپنے پرانے سرپرستوں کے خلاف ہو رہے تھے۔ انہوں نے کسی حد تک یہ سوچ لیا کہ وہ امریکہ کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ اس وقت بھی جب کہ کابل پر حکومت مشکل ثابت ہو رہی تھی۔ اس دوران مجھے ایک رپورٹ موصول ہوئی کہ ایک سعودی طیارہ آموں کے ڈبے لے کر پاکستان اترا ہے۔ چونکہ سعودی عرب میں کھجوریں اگتی ہیں آم نہیں اس لیے ان کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہوئے۔ سویلین انٹیلی جینس نے پتہ چلایا کہ ڈبوں میں آم نہیں بلکہ رقم تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے شاہ فہد کی حمایت حاصل ہے۔ جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے میرے والد کی تعریف کی تھی اور یاد دلایا تھا کہ کس طرح انہوں نے میرے والد کی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میرے والد کا قتل ''غیر منصفانہ'' تھا۔ وہ میرے والد کے بھائی کی طرح تھے اور مجھے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے۔ اس لیے میں نے اپنے وزیر قانون کو سعودی عرب بھیجا کہ وہ ان سے استفسار کریں کہ کیا وہ اپنی بیٹی سے ناراض ہیں اور اس کے مخالفین کو فنڈز مہیا کرنے کے لیے سعودی پیسہ پاکستان بھیج رہے ہیں۔ شاہ نے یقین دلایا کہ رقم پاکستان منتقل کی گئی ہے اس کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے بیان کیا کہ کچھ لوگ جو افغان جہاد سے متاثر ہیں وہ اپنا نجی پیسہ بھیج رہے ہیں۔ شاہ کے ایک مشیر نے رقم بھیجنے کا ذریعہ دریافت کر لیا یہ اسامہ بن لادن تھے۔

جب رمزی کو مجھے قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں رمزی یوسف نے نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر پہلے حملے میں حصہ لیا تھا۔ القاعدہ کے پہلے حملے کی اس طرح منصوبہ بندی کی گئی تھی کہ ایک مینار دوسرے مینار پر گرتا۔ فروری کی بمباری کے بعد یوسف امریکہ سے بچ کر نکل آیا اور پاکستان پہنچ گیا۔ 7 ماہ بعد اسے میرے قتل کی ذمہ داری سونپی گئی۔ 1993ء کی انتخابی مہم کے دوران دو الگ الگ مواقع پر اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔

ستمبر میں اس نے اپنے 2 ساتھیوں کے ساتھ میرے گھر کے سامنے کی گلی میں ایک بم رکھا جسے ریموٹ کنٹرول سے چلایا جانا تھا، اس کی منصوبہ بندی یہ تھی کہ جوں ہی میری گاڑی

گیراج سے باہر نکلے بم دھماکے سے پھٹ جائے، جب وہ یہ بم نصب کرنے کی کوشش کررہا تھا ایک پولیس اہلکار نے وہاں سے گزرتے ہوئے اسے روکا اور پوچھا کہ وہ کیا کررہا تھا، اس نے کہا وہ اپنی چابیاں ڈھونڈ رہا تھا جو گلی میں گرگئی تھیں۔ پولیس اہلکار کو شبہ ہوا اس نے اسے فوری طور پر وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ بظاہر یوسف نے اس رات، اس بم کو ناکارہ بنانے کی کوشش میں اپنے آپ کو زخمی کرلیا تھا اور علاج کے لیے ہسپتال گیا۔ ہسپتال کی فائلوں کے مطابق اس رات اس کی ایک انگلی ضائع ہوگئی۔

یہ کوششیں نہ رکیں رمزی یوسف اور اس کا گروپ اپنے چچا خالد محمود شیخ اور اس کے حمایتیوں کی واضح ہدایات پر مجھے قتل کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ خالد شیخ جسے اب ہم جانتے ہیں القاعدہ کا سی ای او بن گیا۔ اس پر وال سٹریٹ جرنل کے بیورو چیف ڈینیل پرل کو قتل کرنے کا شک ظاہر کیا گیا ہے۔ (آج کل وہ امریکہ کی تحویل میں ہے) انہوں نے مجھ پر حملہ کرنے کی پھر منصوبہ بندی کی لیکن اس مرتبہ منصوبہ زیادہ پیچیدہ تھا اس کا ایک ثانوی سیاسی مقصد بھی تھا کہ پی پی پی کے عناصر کو ایک دوسرے کے خلاف کردیا جائے۔

القاعدہ اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کا بنایا ہوا منصوبہ میرے قتل پر مبنی تھا اور اسے اس طرح ظاہر کرنا مقصود تھا جیسے میرا بھائی اس کا ذمہ دار تھا۔ میں نے نشتر پارک کراچی میں ایک بڑی انتخابی ریلی میں شرکت کرنی تھی۔ خالد شیخ نے بہت سے جدید ہتھیاروں کا انتظام کیا ہوا تھا جو پشاور سے رمزی یوسف کو پہنچائے گئے جسے ٹرین کے ذریعے قتل کے مقررہ دن پہنچنا تھا۔ منصوبہ اس طرح ناکام ہوگیا کہ ٹرین حیدرآباد دیر سے پہنچی اور ریلی کے ختم ہونے تک ہتھیار نہ پہنچے۔ مضحکہ خیز امر یہ ہے کہ فروری 1995ء میں رمزی پاکستان میں گرفتار کیا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے میرے خلاف قاتلانہ حملوں کی کوششیں کرنے پر گرفتار کیا گیا ہے اس نے پاکستان فیڈرل انویسٹی گیشن اتھارٹی کو بتایا کہ ہمارے ذہن میں اس کے لیے بھی حل موجود تھا تاہم ہتھیار وقت پر نہ پہنچے اسے میرے حکم پر امریکہ کے حوالے کردیا گیا۔

1993ء کے انتخابات میں پی پی پی نے پنجاب میں اکثریت حاصل کی تھی اور پنجاب

اسمبلی میں مخلوط حکومت تشکیل دی، جسے نواز شریف اور انتہا پسندوں نے میری پہلی حکومت کو کمزور کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ 1990ء میں میری حکومت کے خلاف انقلاب کے صرف 3 سال بعد پی پی پی پاکستان کی حکمران جماعت کی حیثیت سے واپس لوٹی میں ایک مرتبہ پھر وزیر اعظم تھی۔

دوسری دفعہ وزیر اعظم بننے کا غیر معمولی موقع ملنے کے بعد میں پر عزم تھی کہ ہر دن کو پاکستان کے کام کرنے والے گھرانوں کی زندگی بہتر بنانے کے لیے استعمال کروں اور خطرناک بین الاقوامی ماحول میں اعتدال پیدا کروں۔

جب میں نے دوسری مرتبہ پاکستان کی وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا تو پاکستان کو درپیش بہت سے چیلنج میرے ذہن میں آئے۔ میرا ملک دہشت گرد ریاست قرار دیے جانے کے کنارے پر کھڑا تھا کراچی میں فوجی آپریشن کیا جا رہا تھا اور پاکستان اقتصادی طور پر دیوالیہ قرار دیے جانے کے کنارے پر تھا۔ یہ کثیر الجہتی قومی بحران تھا۔

میں نے دوبارہ جہاں تک ممکن ہو سکا تیز اور موثر انداز میں پاکستان کو جدید دور میں لانے کی کوشش کی، ابتدائی مہینوں میں میری حکومت نے انتہائی آرزومندانہ سوشل ایکشن پلان (SAP) بنایا اور اس کا نفاذ شروع کیا۔ اس منصوبے کے مقاصد میں تعلیم، صحت، عامہ، صحت صفائی، انفراسٹرکچر، حقوق نسواں جیسے شعبوں میں ملکی سطح پر تیز ترقی کے اہداف حاصل کرنا تھے (SAP) کا اہم نکتہ پبلک پرائیویٹ شراکت واری تھی جس میں یہ عزم کیا گیا تھا کہ مرکزی حکومت سے غیر معمولی حد تک فنڈ، بین الاقوامی ترقیاتی تنظیموں سے گرانٹس حاصل کی جائیں، اس کے ساتھ اسے پاکستان کے سرعت پذیر نجی شعبہ کی بھی مدد حاصل ہو۔

میری نئی حکومت کے پہلے سال ہی میں ہم نے 20 بلین ڈالر غیر ملکی سرمایہ کاری کا ریکارڈ ہدف حاصل کیا۔ ایک ہی سال میں ہم نے اتنی سرمایہ کاری حاصل کر لی جو گذشتہ 40 سالوں میں ممکن نہ ہو سکی تھی۔ نئی غیر ملکی سرمایہ کاری کا 80 فی صد حصہ پاور جنریشن میں تھا جس کا مقصد بجلی بند کرنے کے سلسلہ کو ختم کرنے کے عزم کا آئینہ دار تھا اور اس کا یہ بھی مقصد

تھا کہ اقتصادی سرگرمیوں کو تیز رفتاری سے شروع کیا جائے۔

ہم نے سٹاک ایکسچینج کے قوانین کو جدید بنایا اور سٹیٹ بینک آف پاکستان کو کمپیوٹرائزڈ کیا۔ تمام ایشیا میں بجلی کے شعبہ میں سب سے کم نرخوں پر سرمایہ کاری کرنے کے لیے مذاکرات کیے اور اس طرح بجلی بند کرنے کا سلسلہ ختم کیا۔ نجکاری سے حاصل شدہ منافع سے ہم بڑے قرضے ادا کرنے لگے اور سود کی لاگت کم کی۔ پاکستان کی تاریخ میں ہم پہلی حکومت تھے جنہوں نے صرف سود کی بجائے حقیقتاً اصل سرمایہ واپس کیا۔ ہم نے صنعتوں کی نجکاری متعارف کرائی اور اپنے اقتصادی اداروں کو اس قابل بنایا کہ وہ جدید دنیا میں ترقی اور تقابل کر سکیں۔ ملکی قرضہ کو کم کرنے کے لیے مشکل فیصلے کیے۔ ہم نے 3 ملین روپے کے غیر ترقیاتی اخراجات کم کیے جو اس وقت ہمارے ٹیکسوں کا ایک تہائی تھے۔ ان مشکل فیصلوں کے اچھے ثمرات وصول ہوئے۔ پاکستان خوش حال ہونا شروع ہو گیا۔

جنرل مشرف میرے سوالوں سے گھبرا گئے

جب میں نے وزیراعظم کی حیثیت سے لندن کا دورہ کیا تو اسلامی اتحاد کے داعی مذہبی انتہا پسند گروپ ڈورچسٹر ہوٹل کے باہر جمع ہو گئے تاکہ میرے خلاف نعرے بازی کر سکیں۔ ان انتہا پسندوں نے نعرے لگا کر لندن میں مجھے رات بھر جگائے رکھا اور مجھے احساس ہوا کہ انگلینڈ میں ان کی معقول تعداد موجود ہے، چونکہ انتہا پسندوں نے مغرب سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی خواہش کو بہت کم چھپا کر رکھا اس لیے مجھے ملک سے باہر بھی ان کی رسائی کے متعلق تشویش لاحق تھی۔ اگلے روز جب میں برطانوی وزیراعظم جان میجر سے ملی تو انہیں کہا کہ وہ ان مسجدوں کو چیک کریں جہاں امام (جنہوں نے افغان مہاجرین کی حمایت کی تھی) وعظ دیتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ پاکستانی آبادکاروں اور برطانوی پاکستانیوں کی دوسری نسل کو نفرت اور تشدد کی تعلیم دیتے ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ حیران ہو گئے۔ پاکستان میں مجھ پر انتہا پسندوں کا خطرہ عیاں تھا کیونکہ مجھے ہر روز دہشت گردوں اور انتہا پسندوں سے نمٹنا پڑتا تھا تاہم مغرب والوں کو اب بھی اس کا ادراک نہیں تھا۔ یہ صورت

حال جلد تبدیل ہو گئی۔

انتہا پسندوں کی یہ سوچ غیر منطقی نہیں تھی کہ میں ان کے عزائم کے راستے میں رکاوٹ تھی۔ وہ اس لیے میری مخالفت کرتے تھے کہ وہ پاکستان پر مکمل قبضہ کرنا چاہتے تھے اس لیے انتہا پسندوں نے میری پالیسیوں کو ناکام بنانے اور میری دونوں حکومتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے توانائیاں صرف کیں اور اپنے وسائل کا بھرپور استعمال کیا۔

میں حقیقتاً یہ سوچتی ہوں کہ یہ کچھ اتفاقی امر ہے کہ دہشت گردوں کے بڑے حملے اس وقت ہوئے جب انتہا پسندوں کو ایک جمہوری پاکستانی حکومت سے نمٹنا پڑا جب انہوں نے کسی پابندی اور نگرانی کے بغیر کام کیا ان میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر 1993ء اور 2001ء کے حملے، بمبئی دھماکے، بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ، افریقہ میں امریکی سفارت خانے پر حملہ شامل ہیں۔ میرا یقین ہے کہ اگر 1996ء میں پاکستان میں میری حکومت کو عدم استحکام سے دوچار نہ کیا جاتا تو طالبان اسامہ بن لادن کو افغانستان میں مرکز قائم کرنے کی اجازت، تمام اسلامی دنیا سے اعلانیہ نوجوان بھرتی کر کے انہیں تربیت دینے کا کام اور 1998ء میں امریکہ میں جنگ کا اعلان نہ کر سکتے۔

دوسری مدت اقتدار کے دوران مجھے سیکورٹی پر بریفنگ دینے کے لیے ایک مرتبہ پھر جنرل ہیڈ کوارٹرز میں مدعو کیا گیا۔ ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز میجر جنرل پرویز مشرف (جو بلاشبہ بعد میں چیف آف آرمی سٹاف اور اقتدار چھین کر صدر بنے) نے مجھے بریفنگ دی۔ مجھے یہ گھسا پٹا منظر محسوس ہوا کیونکہ ایک مرتبہ پھر میں نے یہ سنا کہ اگر میں احکامات جاری کر دوں تو پاکستان کس طرح سری نگری پر قبضہ کر سکتا ہے۔ مشرف نے اپنی بریفنگ ان الفاظ پر ختم کی کہ فائر بندی ہو جائیگی اور پاکستان کا مقبوضہ کشمیر کے دار الحکومت سری نگر پر قبضہ ہو گا۔ میں نے ان سے استفسار کیا اس کے بعد کیا ہو گا؟ وہ میرے سوال سے حیران ہوئے اور کہا کہ اس کے بعد ہم پاکستان کا جھنڈا سری نگر کی پارلیمنٹ پر لہرا دیں گے پھر کیا ہو گا؟ میں نے جنرل سے پوچھا، اس کے بعد آپ اقوام متحدہ جائیں گی اور انہیں بتائیں گی کہ سری نگر اب

پاکستان کے کنٹرول میں ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ میں نے اصرار جاری رکھا۔ میں دیکھ سکتی تھی کہ جنرل مشرف اس قسم کے سخت سوالوں کے لیے تیار نہ تھے اور اس صورتحال سے گھبرا گئے۔ انہوں نے کہا کہ اور...... اور آپ انہیں بتائیں گی کہ نئے جغرافیائی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے دنیا کا نقشہ تبدیل کریں۔ آپ جانتے ہیں اقوام متحدہ مجھے کیا کہے گا؟ میں نے جنرل مشرف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جب کہ آرمی چیف ساتھ بیٹھے تھے ماحول ساکت ہوگیا۔ میں نے واضح طور پر کہا وہ سلامتی کونسل کی قرارداد پاس کریں گے جس میں ہماری مذمت کی جائے گی اور مطالبہ کیا جائے گا کہ ہم یک طرفہ طور پر سری نگر سے فوجیں نکال لیں۔ ہمیں اپنی کوششوں سے سوائے بے عزتی اور تنہائی کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے بعد میں نے اچانک اجلاس ختم کر دیا۔

انتہا پسندوں کی طرف سے میری حکومت کو برطرف کرنے کی کوشش کا نتیجہ ستمبر 1995ء میں بریگیڈیئر مستنصر کی طرف سے انقلاب کی صورت میں نکلا۔ یہ گروپ اسلام آباد ہتھیار سمگل کر رہا تھا۔ انہوں نے ایک اجلاس کے دوران ملٹری ہیڈکوارٹرز پر قبضہ اور تمام جنرلوں کو ہلاک کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ اس کے بعد ان کا ارادہ یہ ظاہر کرنے کا تھا کہ ہلاک شدہ جنرل مجھے جی ایچ کیو لے جاتا اور پھر قتل بھی کرنا چاہتے تھے۔ جب جی ایچ کیو پر قبضے کے لیے استعمال ہونے والے ہتھیار سرحد سے اسلام آباد جانے والے راستے کے دوران روک لیے گئے تو گروپ نے دعویٰ کیا کہ وہ کشمیری عسکریت پسند تھے لیکن مقامی پولیس نے جو منتخب حکومت کی وفادار تھی۔ آئی ایس آئی کے ساتھ مل کر معاملے کی چھان بین کا فیصلہ کیا۔ آئی ایس آئی کے چیف نے ان کی گرفتاری اور انکوائری کے احکامات دیے۔

اس وقت جنرل وحید کاکڑ آرمی چیف تھے۔ انہوں نے مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے کہا میں نے انہیں وزیراعظم ہاؤس میں بلایا۔ سازش کی تفصیلات منکشف کرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا وزیراعظم! آپ خوش قسمت خاتون ہیں۔

میں نے احتیاط سے قوم سے خطاب کا مطالعہ کیا جو سازش کے ایک کردار میجر ظہیر الا

سلام عباسی نے پہلے ہی سے لکھ کر رکھا تھا۔ ان کا خطاب تمام مسلمانوں سے اس اپیل سے شروع ہوا کہ تمام مسلمان اسلامی انقلاب کے لیے متحد ہو جائیں جو رونما ہو چکا تھا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اب سے اسلامی دنیا میں کوئی سرحدیں نہیں ہوں گی۔ افغانستان اور پاکستان کے مابین سرحدیں ختم ہو جائیں گی، کیونکہ اسلام کے مطابق ہم ایک قوم ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ کنفیڈریشن کا پرانا خیال تھا جو اب نئی زبان میں تیار کیا گیا تھا۔ یقیناً سخت گیروں کا یقین تھا کہ وہ افغانستان سے وسط ایشیا، ترکی چیچنیا سے یورپ کے ساحلوں تک پہنچ سکتے ہیں اور اسلام پھیلا سکتے ہیں۔ یہ خلافت کے لیے القاعدہ کی طرح کا خاکہ تھا۔ جنرل وحید کاکڑ نے مجھے کہا، وزیر اعظم ان افراد پر بغاوت کے الزام میں فوجی عدالتوں میں مقدمہ چلاؤں گا اور انہیں پھانسی پر لٹکاؤں گا۔ یہ سازشی افراد جنرل مشرف کے دور میں رہا کر دیے گئے۔

میر مرتضیٰ کو پولیس فائرنگ کے ذریعے قتل کیا

میں فوج میں انتہا پسندوں کے گھس جانے کی وجہ سے پریشان تھی اور جنرل کاکڑ سے کہا کہ وہ 1995ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کی بجائے بعد میں بھی اس عہدے پر اپنی خدمات جاری رکھیں بدقسمتی سے جنرل کاکڑ نے آرمی چیف کی حیثیت سے اپنی ملازمت جاری رکھنے کی میری تجویز سے اتفاق نہ کیا۔

آئی ایس آئی کے ایک سابق افسر میجر عامر نے ٹی این ایس ایم کے نام سے جنگ جو تنظیم بنا رکھی تھی۔ جو صوبہ سرحد میں فعال تھی اس تنظیم نے 1996ء میں صوبہ سرحد کے علاقے مالاکنڈ میں مسلح بغاوت تیار کی۔ مذہبی انتہا پسندوں نے پولیس سٹیشنوں پر قبضہ کر لیا اور میری پارٹی کے رکن اسمبلی کو ہلاک کر دیا۔ میری حکومت نے ان کی چال بازیوں کے آگے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ ہم عسکریت پسندوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب تھے اور مالاکنڈ میں امن وامان قائم کیا۔ ایک پریس رپورٹ کے مطابق اس بغاوت کا ایک اہم لیڈر مولانا لیاقت 30 اکتوبر 2006ء کو باجوڑ واقعہ میں مارا گیا جب کہ اس کا ایک مسلح ساتھی

فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ جب مجھے دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کرنا پڑا تو میں نے وہ کیا جس کی ضرورت تھی اور مجھے عوام کی حمایت حاصل تھی۔ داخلی اور خارجی سطح پر دہشت گردی کے واقعات کم ہو گئے۔ جنوری 1996ء میں اکھوڑا ڈیم کا افتتاح کرنے کے لیے میں بلوچستان گئی یہ بلوچستان کے عوام کو پینے کا پانی فراہم کرنے کے لیے میرے عہد کی تکمیل تھی۔ ایک سینئر صحافی نے مجھے آگاہ کیا کہ اسے آرمی ہیڈ کوارٹرز میں بلایا گیا جہاں اسے بتایا گیا فوج اس (بے نظیر) سے تنگ ہے۔ ایک فولڈر اس کے حوالے کیا گیا جس میں موجود مواد پر مبنی کرپشن کے متعلق کہانیاں لکھنے کے لیے انہیں کہا گیا۔

مارچ میں فوج کے ایک میجر نے مجھے اطلاع دی کہ انٹیلی جنس نے میری حکومت برطرف کرنے کے لیے عدم استحکام کی کوششوں پر مبنی مکمل پروگرام تیار کیا ہے ایک ماہ بعد ایک اور فوجی افسر نے مجھے اطلاع دی کہ افسر ڈیل کرنے کے لیے سپریم کورٹ سے رجوع کر رہے ہیں۔ آئینی بحران کے بدلے میں جو صدر میری حکومت کو برطرف کرنے کے لیے برپا کرتے چیف جسٹس کو عبوری وزیر اعظم بنانے کا وعدہ کیا گیا۔ میں نے اور میری ٹیم نے آرمی چیف جنرل کرامت سے بعض فوجی افسروں کے تبادلے کرنے کا ایشو اٹھایا لیکن وہ ایسا کرنے کے لیے متذبذب تھے۔ اس کی بجائے انہوں نے استعفیٰ دینے کی پیش کش کی۔ جب میں نے ڈائریکٹر جنرل آف ملٹری آپریشنز جنرل محمود کے متعلق شکایت کی جو میرے خیال کے مطابق میرے خلاف مہم چلانے میں فعال کردار ادا کر رہے تھے فوج اور انٹیلی جنس ایجنسیوں میں وہ تبدیلیاں جو 1995ء کے آخر میں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ جب جنرل کاکڑ ریٹائرڈ ہوئے اور جنرل جاوید اشرف کا آئی ایس آئی سے تبادلہ ہو گیا یہ وجہ میری دوسری حکومت کی تباہی کا باعث بنی۔

جنرل کاکڑ کی ریٹائرمنٹ کے بعد فوج کے سخت گیروں نے صدر کی حمایت حاصل کر لی اور میری حکومت کو برطرف کرنے کی سازش کی صدر کے ایک رشتہ دار نے اگست 1996ء میں مجھے اطلاع دی کہ ملٹری انٹیلی جنس نے ان سے کہا ہے کہ وہ صدر تک ان کا ایک پیغام

پہنچادیں۔ پیغام میں میری حکومت کو برطرف کرنے کے لیے اس انداز کی دھمکی دی گئی کہ جب تک وہ ایسا نہیں کرتے فوج صدر اور وزیراعظم دونوں سے نجات حاصل کرلے گی۔

فوج سے معاملہ طے کرنے والی آئینی قوتیں صدر کی بجائے میرے ساتھ ہوتیں تو میں ان لوگوں کے خلاف انضباطی کارروائی کا حکم دیتی جو قانونی حکومت کے خلاف جوڑ توڑ میں شریک تھے لیکن صدر میں اتنی اخلاقی جرات نہیں تھی کہ انٹیلی جنس کے جنرلوں کا مقابلہ کرتے۔

صدر اس فریب میں مبتلا تھے کہ فوج کی حمایت سے وہ دس سال تک صدر رہ سکتے تھے یہ یقینی امر ہے کہ صدر کو انٹیلی جنس نے ڈرایا دھمکایا تھا۔ آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل حمید گل اگست 1996ء میں آرمی کے سربراہ سے ملاقات کرنے کے لیے گئے۔ انہوں نے جنرل جہانگیر کرامت سے کہا کہ صدر وزیراعظم کو برطرف کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن انہیں شبہ ہے کہ فوج کے سربراہ وزیراعظم سے بہت قریب ہیں اگر یہ صورت حال نہیں ہے تو آرمی چیف کو صدر کے ساتھ وزیراعظم کو برطرف کرنے کا ایشوز اٹھانا چاہیے۔

ان دو پیغامات سے جن میں سے ایک جنرل محمود کی طرف سے صدر کے رشتہ دار کو دیا گیا اور دوسرا جو جنرل گل نے ملٹری چیف کو دیا میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ فریب دہی پر مبنی کھیل کھیلا جارہا ہے میرا اندازہ ہے کہ صدر کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر وہ حکومت کو برطرف نہیں کرتے تو انہیں بھی ہٹا دیا جائے گا۔ آرمی چیف کو دھمکی دی گئی کہ اگر وہ وزیراعظم کے بہت نزدیک ہیں تو انہیں صدر کے ذریعے ہٹایا جاسکتا ہے۔ اس وقت صدر کے پاس فوج کے سربراہوں کا تقرر کرنے اور انہیں ہٹانے کے آئینی اختیارات تھے۔

ایم آئی کے سربراہ جنرل محمود جنرل مشرف کے انقلاب کے بنیادی محرک تھے بعد ازاں وہ آئی ایس آئی کے سربراہ بن گئے انہیں نائن الیون کے بعد بین الاقوامی دباؤ کے تحت ریٹائر کیا گیا۔ بڑھتی ہوئی سیاسی بے یقینی کے درمیان میں میرے خاندان کے ساتھ ایک اور المناک واقعہ پیش آیا۔ میرے والد ڈکٹیٹر ضیاء الحق کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے،

میرے بھائی شاہ نواز کو فرانس میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا اور 20 ستمبر 1996ء کو میرا خاندان ایک اور قتل سے سخت صدمہ انگیز صورت حال کا شکار ہوا۔ میرے بھائی مرتضیٰ بھٹو کو کراچی میں اس کے گھر کے سامنے پولیس فائرنگ کے ذریعے قتل کر دیا گیا، میں خاصی سخت پریشان ہوئی کیونکہ کچھ سالوں کی سیاسی رنجش کے بعد ہماری اب مصالحت ہوئی تھی اور ہمارا خاندان ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کے قریب آ رہا تھا۔ میں بہت افسوس کے ساتھ کہتی ہوں کہ میں امریکہ کے ضیاء کے متعلق غلط اندازوں کا عمل نئے فوجی ڈکیٹٹر پرویز مشرف کے معاملے میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ پاکستان میں جمہوریت کے خلاف ضیاء کے انقلاب کی دو دہائیوں کے بعد ایک اور آرمی چیف نے سویلین حکومت کے خلاف انقلاب برپا کیا ہے۔ اپنے سے پہلے کی ڈکیٹٹرشپ کی قیادت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نئے پاکستانی ڈکیٹٹر نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اپنے مفاد کے لیے مدد فراہم کر کے مغرب کے ساتھ فلرٹ کیا ہے۔ اس سے امریکہ اور برطانیہ اس کی سیاسی حمایت سے دور ہوئے ہیں۔

جب کہ طالبان پاکستان کے قبائلی علاقوں میں پھر منظم ہوئے ہیں اور ہمسایہ ملک افغانستان میں نیٹو کے فوجیوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔ عسکریت پسندوں کے سیل جوں کے توں ہیں، ان کے لیڈر گرفتار کیے جاتے ہیں اور جوں ہی عالمی توجہ رخ پھیرتی ہے انہیں رہا کر دیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اپوزیشن لیڈروں پر دباؤ ڈال کر منتخب کردہ سیاسی جماعتوں کو قتل کر کے پریس پر پابندیاں عائد کر کے اور انسانی حقوق کی وجوہات کو روک کر فوجی ڈکیٹٹرشپ اب بھی روبہ عمل ہے فوجی حکومت کا مقصد یہ ہے کہ اس امر کی یقین دہانی حاصل کی جائے کہ حکومتیں تشکیل دینے کے لیے انٹیلی جنس اداروں کا کوئی متبادل نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پی پی پی کی مخالفت کرتے ہیں۔ فوجی حکومت کے حامیوں کو صدر جان ایف کینیڈی کے الفاظ یاد رکھنے چاہئیں جو انہوں نے 1961ء میں اپنے افتتاحی خطاب میں کہے تھے، ''جو شیر کی کمر پر سواری کرتا ہے عموماً اس سے ڈرا ہوتا ہے۔۔۔''

جنرل مشرف سے میری اتفاقیہ ملاقات اس وقت ہوئی جب ترک فوجیوں کے دوروں

کے دوران انہوں نے ترک مترجم کے فرائض سرانجام دیے۔ میں نے انہیں اپنا ملٹری سیکرٹری بنانے سے انکار کیا۔ ہم نے نسلی اور اکثر مشتعل مہاجر قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کے ساتھ ان کے مشتبہ روابط کی وجہ سے شروع میں ان کو ترقی دینے سے انکار کر دیا۔ آخری دفعہ میری ان سے ملاقات سب سے اہم تھی جب انہوں نے 1996ء میں کشمیر پر جنگ کے متعلق خاکہ پیش کیا۔

مشرف کی طرف سے پی پی پی کو روکنے اور مجھے دوبارہ منتخب ہونے کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے کے عزم اور خبط کا نتیجہ ملک میں کمزور سیاسی اداروں اور سیاسی جماعتوں اور شہری اداروں میں جمہوریت کا انفراسٹرکچر تباہ ہونے کی شکل میں نکلا ہے۔ علاوہ ازیں بجٹ میں ان کی ترجیحات کا رخ سماجی شعبہ سے فوج کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ اس سے لاکھوں، پاکستانی جو غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارتے ہیں ان کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ ہم اس امر سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ جنرل مشرف پر قاتلانہ حملوں کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ امید کی جاتی ہے کہ ان پر مزید کوئی حملہ نہیں ہوگا۔ خطرہ پھر بھی موجود ہے۔ پاکستان میں پائیدار جمہوریت قائم کرنے کی کوششوں میں ناکامی کے دورس نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔

مشرف حکومت پاکستانی سرحد کے حصوں میں اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ کنٹرول نہیں کیے جا سکتے، یہ انوکھا خیال ...... کہ پاکستان کے یہ وسیع حصے کنٹرول نہیں کیے جا سکتے محض حماقت ہے۔ وزارت عظمیٰ کے دونوں ادوار میں میری حکومت نے امن وامان قائم کرنے کے لیے ان علاقوں میں فوجیں بھیجیں اب مشرف حکومت نے دہشت گردوں کو ان علاقوں پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ ان کی حکومت ان دہشت گردوں کے ساتھ رہتی ہے جو طیاروں، ٹرینوں اور بسوں میں سفر کرنے والی معصوم خواتین، بچوں اور مردوں پر حملے کرتے ہیں۔ اگر ایک خاتون وزیر اعظم کے دور میں اس طرح کے واقعات ہوتے ہیں تو اس پر کمزور اور بے صلاحیت ہونے کا الزام عائد کیا

جائے گا لیکن یہ جنرل ہر کام سزا کی بریت کے بغیر کر رہا ہے خواتین کے عظیم کاموں کے باوجود عورت مرد کی کارکردگی کو جانچنے میں دوہرے معیار برقرار ہیں۔ مشرف دہشت گردی کے خلاف جنگ میں چمچہ بھر ضرورت کے مطابق تھوڑا تھوڑا کردار ادا کر رہے ہیں تا کہ واشنگٹن اور لندن کی نگاہوں میں اچھے بنے رہیں لیکن ان کی پالیسیاں مغرب کے دشمنوں کو طاقت دے رہی ہیں۔

ہمارا خاندان دنیا میں قربانیاں دینے کے لیے آیا

شاہنواز کے قتل کے بعد جب میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تو میری والدہ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''پنکی'' تم ہرگز واپس نہیں جاؤ گی۔ میں پہلے ہی اپنے بیٹے شاہنواز سے محروم ہو چکی ہوں اب میں اپنی بیٹی کو کھونا نہیں چاہتی۔ میں نے والدہ سے کہا'' شاہ نے میرے لیے بہت کچھ کیا'' مگر میں کبھی اسے نہ پوچھ سکی کہ میں اس کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔ کافی عرصہ پہلے جب وہ لاڑکانہ آیا تھا تو مجھ سے پوچھتا تھا کہ بابا کو کہاں دفنایا گیا ہے، مجھے وہاں لے چلو میں ان کے مزار کی تصویر بنانا چاہتا ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ 21 اگست 1985ء کو میں شاہنواز کی میت لے کر پاکستان آئی تھی۔ ضیاء الحق کی حکومت نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں اجازت دے دی تھی کہ شاہنواز کو لاڑکانہ دفن کر سکیں۔ ضیاء حکومت کو چونکہ اندیشہ تھا کہ اس موقع پر لوگ جذباتی ہو کر ہنگامہ آرائی کر سکتے ہیں لہٰذا اس نے کراچی سے موہن جوداڑو بذریعہ پرواز میت لے جانے کی اجازت دی۔ ضیاء حکومت چاہتی تھی کہ شاہنواز کو فوری طور پر عجلت میں سپرد خاک کر دیا جائے مگر حکومت کو معلوم نہیں تھا کہ جس بچے کو وہ عجلت میں دفنانا چاہتی ہے۔ دنیا میں اس کی کس قدر مقبولیت تھی۔ اس 27 سالہ نوجوان کی موت پر دنیا کے اہم ممالک کے سربراہان نے تعزیت کی۔ شاہنواز کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے ہزاروں لوگ گاڑیوں موٹر سائیکلوں، ٹرکوں اونٹ گاڑیوں پر سوار ہو کر آئے، پیدل آنے والوں کا شمار ہی نہیں کیا جا

سکتا تھا اس موقع پر شاہنواز شہید کی بڑی بڑی تصاویر بھی سینکڑوں میل پیدل چل کر آنے والوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ اس سے پہلے ہمارے خاندانی مولوی نے شاہنواز کو غسل دیا تھا جس کے بعد میں نے اپنے گھریلو ملازمین سے کہا تھا کہ وہ شاہ کی میت ڈرائنگ روم میں لائیں تاکہ وہاں موجود رشتہ دار اس کی مغفرت کے لیے دعا کر سکیں۔ آخر وہ لمحات بھی آگئے جب میں نے شاہنواز کو خدا حافظ کہنا تھا۔

یہ لمحات بڑے دردناک تھے جب ایمبولینس اس کی میت لے کر جانے لگی تو میں دوڑ کر اس کے پیچھے گئی اور ملازمین سے کہا وہ کچھ دیر کے لیے شاہنواز کو واپس لائیں میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا چھوٹا اور پیارا بھائی اتنی جلدی مجھ سے جدا ہو جائے۔ بالآخر جب اس کی ایمبولینس گیٹ کے قریب سے گزری تو وہاں کھڑی سوگوار خواتین نے اس کے لیے باآواز بلند دعا کی اور پھر میرا بھائی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں سوچتی ہوں کہ آخر ہمارے خاندان کے افراد ہی ظلم کا شکار کیوں بنتے ہیں میرے باپ کو برداشت کیا گیا نہ میری والدہ کو برداشت کیا گیا۔ اگر ماضی سے حال تک ایک نظر ڈالوں تو ہمارا خاندان ہمیشہ آزمائشوں کی چکی میں پستا رہا۔ شاید میرا خاندان قربانیاں دینے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے۔

محترمہ غیر سیاسی انداز میں

پاکستانی سیاست میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے والد کی طرح نیا رنگ پیدا کیا اور انہوں نے پیپلز پارٹی کے لبرل نظریات کو نمایاں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پیپلز پارٹی لبرل پارٹی ہے۔ 1999ء کے شروع میں انہوں نے میرے ساتھ غیر سیاسی گفتگو کی تھی، میں نے ان سے غیر سیاسی سوالات کئے تھے جس کے جوابات محترمہ نے بڑی مہارت سے دیئے، آپ 1999ء کے آغاز کو اپنے ذہن میں رکھ کر اس انٹرویو سے مستفید ہو سکتے ہیں، اب بے نظیر بھٹو کی غیر سیاسی گفتگو آپ کی نذر ہے۔

سوال: آپ کے میاں جیل میں ہیں اور بچے دوبئی میں جبکہ ملکی سطح پر آپ کو عدالتوں میں

کھینچا جار ہا ہے۔آپ بچوں کو کتنا مس کرتی ہیں۔؟

بے نظیر بھٹو:۔آپ چاہتے ہیں میں رونے لگ جاؤں۔ان کے ان الفاظ کے ساتھ ہی سارا ماحول اداس ہو گیا اور ان کی آنکھیں باقاعدہ بھیگ گئیں۔ان کی آنکھوں میں تیرتی نمی نے ساری آنکھوں کو بھگو دیا۔انہوں نے کہا ''دن بھر تو سیاست کے جھمیلوں میں الجھی رہتی ہوں۔رات کو جب تنہا ہوتی ہوں تو بچے بہت یاد آتے ہیں۔کوشش کرتی ہوں کہ یہ نوبت نہ آئے اور خود کو مصروف رکھوں، لیکن بچے تو بچے ہوتے ہیں۔بار بار آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ان کے کھلونے، تصویریں، اور ان کی یادیں مل کر ایک عجیب سوگوار اور اداس فضا بناتے ہیں۔بہت مشکل سے اس حصار سے نکلتی ہوں۔اس بار عید کی چھٹیوں میں انہیں یہاں لانے کا پروگرام ہے۔انہیں سیکیورٹی کے نقطہ نظر سے دوبئی بھجوایا ہے۔

سوال: آپ ایشیا کی واحد سیاسی رہنما ہیں جن کا گھر دکھوں نے دیکھ لیا ہے۔آپ کے والد کو شہید کر دیا گیا۔بھائیوں کو قتل کر دیا گیا، والدہ ان صدموں سے بیمار ہیں۔بچے ملک سے دور، میاں جیل میں اور آپ کو مقدمات کا سامنا ہے۔یہ سب کیا ہے اور کیسی سازش ہے؟

بے نظیر بھٹو: یہ قدرت کی طرف سے امتحان ہے اور سب خدا کے کرم سے ٹھیک ہو جائے گا۔سب کچھ جھیلنے کا حوصلہ بھی خدا دیتا ہے اور اسی کی رحمت ہے کہ آج بھی ظلم کے خلاف لڑ رہی ہوں۔

سوال: آپ مغربی ممالک کی مخالف نہیں سمجھی جاتیں لیکن مغربی پریس آپ کے خلاف مہم چلا رہا ہے۔؟

بے نظیر بھٹو: گلوبل مفادات کا جب ٹکراؤ ہوتا ہے تو پھر پالیسیاں بدلتی رہتی ہیں۔خاص لابی ہے جو میرے خلاف سرگرم ہے لیکن انہیں بھی اب منہ کی کھانی پڑی ہے۔

سوال: گھر میں پیار سے کیا کہتے ہیں؟

بے نظیر بھٹو: پہلے پنکی کہتے تھے۔پھر والدہ نے کہا اب آپ بڑی ہو گئی ہو۔پھر انہوں نے بے نظیر کہنا شروع کر دیا۔آصف کچھ نہیں کہتے میں انہیں جو کہتی ہوں وہ آپ کو نہیں بتاؤں گی

(وہ خالصتاً مشرقی لڑکی کی طرح شرمائیں اور ان کا رنگ سرخ ہو گیا)۔

سوال: بچپن میں آپ کیا بننا چاہتی تھیں۔؟

بے نظیر بھٹو: مختلف اوقات میں مختلف خواہشیں تھیں۔ ہمارے گھر پر بار ایٹ لاء کی تختی لگی ہوئی تھی۔ شروع میں بار ایٹ لاء بننا چاہتی تھی۔ پھر ایڈیٹر بننے کا شوق تھا۔ کچھ عرصہ غیر تجرباتی طور پر فارن آفس میں بھی کام کیا۔ پھر سیاست دان بن گئی۔

سوال: فلم دیکھتی ہیں۔؟

بے نظیر بھٹو: کبھی کبھی متنازعہ فلمیں دیکھتی ہوں۔ پچھلے دنوں الزبتھ کے دور کی فلم دیکھی لیکن انہوں نے برصغیر کا صحیح انداز میں ذکر نہیں کیا، وہ سب گول کر گئے۔ ٹی وی نہیں دیکھ سکتی۔ کوئی بھی چینل نہیں دیکھتی۔ (واضح رہے کہ اس وقت کوئی پاکستانی پرائیویٹ چینل نہیں تھا)۔ آصف کو فلمیں بہت پسند ہیں۔ وہ ڈراؤنی فلمیں دیکھتے ہیں۔ میں پڑھتی رہتی ہوں۔

سوال: موسیقی پسند ہے، گنگناتی ہیں۔؟

بے نظیر بھٹو: نعت پسند ہے یا پھر تحریک کے دنوں میں جب سفر کرتی تھی تو پرانے محمد رفیع وغیرہ کے گیت سن لیتی تھی۔

سوال۔ پھول کون سا پسند ہے۔؟

بے نظیر بھٹو: بھٹو صاحب کو گلاب پسند تھا۔ گھر میں ہر طرح کے گلاب تھے۔ مجھے بھی گلاب پسند ہے۔

سوال: پرندہ کون سا پسند ہے۔؟

بے نظیر بھٹو: طوطا (انہوں نے بے ساختہ کہا) والد صاحب بھی طوطے رکھتے تھے۔ ہمارے ہاں زنان خانے میں طوطوں کا بڑا سا پنجرہ تھا۔ ایک بار مرتضیٰ نے ٹوٹو گن سے طوطے پر فائر کر دیا تو والد صاحب بتاتے ہیں کہ میں بہت روئی اور کئی دن تک اداس رہی۔ کسی طور نہیں مان رہی تھی۔ مجھے بڑی مشکلوں سے منایا گیا۔ طوطے کی ایک اور بات بتاؤں۔ حامد ناصر چٹھہ صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ میں نے سوچا اب طوطا دو یا تین سو کا ہو گیا ہوگا۔ میں نے

کہا میں تین لوں گی۔ جب طوطے لے چکی تو پتہ چلا۔ ایک طوطا بیس ہزار روپے کا ہے۔ انہوں نے یہ خصوصیت بتائی تھی کہ باتیں کرتا ہے لیکن وہ تو یہاں آ کر بولا ہی نہیں۔ یعنی میرے ساتھ فراڈ ہو گیا۔

سوال: رنگ کون سا پسند ہے۔؟

بے نظیر بھٹو: سبز رنگ پسند ہے۔ ویسے نیلا اور سفید بھی پسند کرتی ہوں۔

سوال: اور جانور کون سا اچھا لگتا ہے۔؟

بے نظیر بھٹو: مجھے بلیاں بہت پسند ہیں۔

سوال۔ کھانے میں کیا پسند ہے۔؟

بے نظیر بھٹو۔ دال چاول پسند ہیں بلکہ کھانے سے مجھے بہت رغبت ہے۔ کھانے سے کبھی نہیں اکتاتی۔ بندوں سے اکتا سکتی ہوں۔

سوال۔ کھانے میں اور کیا پسند ہے۔؟

بے نظیر بھٹو: بچپن سے دال چاول کھاتی ہوں اور چاولوں میں چینی ملا کر اب بھی کھاتی ہوں۔ کھانے کا بہت شوق ہے۔ قلفی، گڑ کے چاول، ملتان کا سوہن حلوہ، کچی پکی کھجوریں (ڈوکے) ہاں ڈوکے بہت پسند ہیں۔

سوال: پسندیدہ مشروب کون سا ہے۔؟

بے نظیر بھٹو: آئس کریم سوڈا اور دوسرے نمبر پر فانٹا پسند ہے لیکن مجبوراً ڈائٹ کوک پینا پڑتی ہے۔

سوال: سمندر کا کنارا کیسا لگتا ہے۔؟

بے نظیر بھٹو: بہت اچھا لگتا ہے۔ نمکین ہوا بہت پسند ہے۔ ڈر بھی لگتا ہے۔ سمندر پر بیگم صاحبہ کا ایک ہٹ ہے۔ کئی سال ہو گئے وہاں نہیں گئے۔ اس بار ضرور جائیں گے۔ سمندر کی لہریں بہت بھلی لگتی ہیں۔

سوال: وقت کونسا پسند ہے۔ شام، صبح یا تاروں بھری رات۔؟

بے نظیر بھٹو: اب تو مجھے شام بہت اچھی لگتی ہے۔ صحافیوں کی طرح ہو گئی ہوں۔ رات بھی بہت اچھی لگتی ہے۔

سوال: کبھی کھل کر قہقہہ لگایا ہے۔؟

بے نظیر بھٹو: یاد نہیں پڑتا کہ کب قہقہہ لگایا تھا۔ شاید نوجوانی میں لگایا ہوگا۔

سوال: کب اداس اور کب خوش ہوتی ہیں۔؟

بے نظیر بھٹو: جب کوئی پاس آتا ہے اور پھر دور ہونے لگتا ہے۔ جب کوئی پاس آنے والا کسی کی باتوں میں آجاتا ہے تو اس پر اداس ہو جاتی ہوں۔

سوال: انتہائی دکھی کرنے والا اور انتہائی خوش کن لمحہ کون سا تھا۔؟

بے نظیر بھٹو۔ جب بھٹو صاحب کو شہید کیا گیا، وہ انتہائی دکھی کر دینے والی گھڑی تھی اور جب بلاول پیدا ہوا تو بہت خوشی ہوئی۔ وہ خوشی ناقابل فراموش ہے۔ لوگ کہتے ہیں آپ اکیلی بہتر ہیں۔ زرداری کی وجہ سے بہت مسائل پیدا ہوئے۔ میں سمجھتی ہوں، ایسا کچھ نہیں۔ زرداری صاحب میرے لئے بہت اچھے ہیں۔ وہ ذرا ہاتھ کے کھلے ہیں۔ تینوں ٹائم تازہ کھانا چاہتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں ایک ہی کھانا کھا لیا جائے۔ اس پر تلخی ہو جاتی ہے۔ مشورہ دینے والے نہیں سمجھتے کہ آدمی اکیلا نہیں رہ سکتا۔ جب والد صاحب شہید ہوئے تو زندگی بہت مشکل ہو گئی تھی۔ آصف علی زرداری نے مجھے سہارا دیا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ مجھے ان کی وجہ سے تقویت ملتی ہے۔ وہ بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میں تو ان کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتی۔

سوال: آپ کیا کچھ پکا لیتی ہیں۔؟

بے نظیر بھٹو: یہاں کی بہت سی ڈشیں پکا لیتی ہوں۔ پکانے کی ترکیب پڑھ کر سب کچھ پکا لیتی ہوں۔ چائنیز ڈش نہیں بنا سکتی۔

سوال: ہندوستان کے ساتھ دوستی ہونی چاہیے یا نہیں۔؟

بے نظیر بھٹو: ٹھیک ہے کہ ہمارے اور ان کے غریب عوام پس رہے ہیں۔ اس میں ان کا کیا

قصور ہے؟ لیکن کشمیر میں جو مجاہدین کی قربانیاں ہیں ان کو بھلا کر دوستی نہیں ہونی چاہیے۔ پہلے مسئلہ کشمیر حل ہو پھر دوستی کریں۔ لیکن یہ دوستی تو محض اپنے کارخانوں کی چینی بھیجنے کے لیے ہو رہی ہے۔ تجارت بھی ہونی چاہیے۔ اس سے عوام کو سہولت ملے گی۔ ہماری پارٹی لبرل پارٹی تھی۔ درمیان میں کچھ ایسی پالیسی آئی جس سے ایک تاثر ابھرا کہ ہم سخت گیر ہیں لیکن اصل میں ایسا نہیں۔ ہم دوبارہ پارٹی کے اس لبرل تاثر کو ابھاریں گے۔ ہم معاشی استحکام کی بات کرتے ہیں۔ نواز شریف کی طرح قوم پر اور قرضے لاد کر نہیں جانا چاہتے۔

سوال: آپ خوش لباس خاتون ہیں۔ لباس خود پسند کرتی ہیں۔؟

بے نظیر بھٹو۔ نہیں کوئی لے آتا ہے لیکن صبح پہننے کے وقت خود پسند کرتی ہوں۔ جو سامنے آجائے پہن لیتی ہوں۔

سوال: اور جیولری؟

بے نظیر بھٹو۔ اب تو بھول گئی ہوں۔ کبھی کوئی تقریب ہو، شادی یا پارٹی پر پہن لیتی ہوں۔ نیکلس، دوسری جیولری، اجرک بہت پسند ہے۔ پہلے دوپٹہ سر سے ڈھلک جاتا تھا۔ خیال آیا کہ اوپر ٹوپی پہن لوں پھر سوچا لوگ کیا کہیں گے۔

سوال: تسبیح کہاں ہے، کیا پڑھتی ہیں۔؟

بے نظیر بھٹو: (انہوں نے فوراً جیب سے سفید موتیوں کی تسبیح نکالی اور کہا) جو کچھ پڑھتی ہوں وہ بتاؤں گی نہیں۔

سوال: خواب دیکھتی ہیں۔؟

بے نظیر بھٹو: خوفناک خواب دیکھتی ہوں۔ جب ہماری حکومت کو توڑا گیا تو میں نے اس سے پہلے خواب دیکھا۔ سڑک ہے، میں کراچی میں ہوں، بہت بڑا گھر ہے کوئی مجھے قتل کرنے کے لیے آرہا ہے۔ میری پھوپی مجھے چیخ چیخ کر بلا رہی ہیں۔ خبردار کر رہی ہیں۔ میں پوچھتی ہوں۔ آپ کیسے، آپ تو فوت ہو چکی تھیں۔ وہ کہتی ہیں مجھے آنا تھا۔ بتانے کے لیے میں آگئی۔ میرے اکثر خواب سچے ہوتے ہیں۔

سوال: آپ پڑھتی بہت ہیں۔؟

بے نظیر بھٹو: ہاں پڑھتی ہوں۔لیکن اب لائبریری نہیں بناتی۔کتاب پڑھ کر آگے دیتی ہوں۔علم پھیلتا رہنا چاہیے۔

سوال: کیا پڑھتی ہیں؟

بے نظیر بھٹو: بائیوگرافی، فکشن اور شاعری بھی۔

سوال: زبان کونسی جانتی ہیں؟

بے نظیر بھٹو: اب تو سب زبانیں ٹوٹی پھوٹی بول لیتی ہوں۔پہلے میں فارسی بولتی تھی، انگریزی اور فرانسیسی، گھر میں شروع ہی سے انگلش بولی۔بعد میں سندھی سیکھی۔اب تو سندھی بھی بول لیتی ہوں۔

سوال۔آپ تصوف کی طرف مائل ہیں۔؟

بے نظیر بھٹو: ہاں! میں صوفیائے کرام کی دھرتی کی ہوں۔صوفی بھائی چارے کا درس دیتے ہیں۔معاف کر دیتے ہیں۔نفرت نہیں کر سکتے۔میں مزاروں پر جاتی ہوں، دعاؤں پر یقین رکھتی ہوں۔ستار اور پتھروں پر یقین نہیں رکھتی لیکن آپ کی تحریر دیکھ کر آپ کے دل کا حال بتا سکتی ہوں۔

سوال: آپ کے وزراء کیسے تھے۔؟

بے نظیر بھٹو: میرے وزراء بہت اچھے تھے۔بس مصطفیٰ کھر بہت پریشان کرتے تھے۔چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کا اپنے سیکریٹریز سے جھگڑا ہو جاتا تھا۔میرے سیاسی انکلز نے اس لیے میری مخالفت کی کہ یہ چھوٹی سی لڑکی کہاں سیاست میں آگئی۔میں 24 برس کی تھی جب سیاست میں آئی اور انہیں یہ قبول نہیں تھا۔شیر افگن بھی لائق تھے لیکن میانوالی کے ڈی سی کی وجہ سے پریشان رہتے تھے۔لغاری نے اپنے رشتہ دار کی مرضی کا ڈی سی لگا دیا تھا۔ہم اپنے ورکروں سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ہم پر تو ورکر دوستی کی وجہ سے کیس بنے۔ہم انہیں ساتھ رکھتے ہیں اور نواز شریف وغیرہ ملازمتوں سے نکال دیتے ہیں۔

سوال: محترمہ غصہ آتا ہے۔؟

بے نظیر بھٹو: بہت آتا ہے یہ میری کمزوری ہے اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کبھی کبھی تو سر میں درد ہوتا ہے۔

سوال: اردو قومی زبان ہے۔؟

بے نظیر بھٹو: سرکاری زبان ہے اب حکومت کیا کیا سکھائے۔ انگریزی بہت ضروری ہے۔

سوال: اپنی کونسی عادت ناپسند ہے؟

بے نظیر بھٹو: میں بیک وقت کئی کام کرنا چاہتی ہوں۔ یہ اچھا نہیں۔

سوال: آپ کے مشیر، نواز شریف کے مشیروں سے بہترین نہیں۔ اس میں کتنی صداقت ہے۔؟

بے نظیر بھٹو: ہو سکتا ہے، ہمارے مشیر اتنے تیز نہ ہوں، جتنے نواز شریف کے ہیں لیکن میں یہ بات بالکل نہیں مانتی۔ اگر ہم کھرل صاحب کو اربوں روپے دے دیتے تو ہمارے مشیر بھی اچھے ہوتے، ہم بھی اخبارات میں دکھائی دیتے، ہم نے جمہوری راستہ اختیار کیا۔

سوال: نظر بندی کے واقعات کیسے تھے۔؟

بے نظیر بھٹو: نظر بندی بہت بری لگتی ہے۔ وہ بہت برے دن تھے۔ اب میں بددعائیں نہیں دیتی۔ پہلے بددعائیں دیتی تھی۔

سوال: آپ لمبی لمبی تقریریں کیوں کرتی ہیں اور مشترکہ اجلاس میں چیخ و پکار کیوں کی تھی؟

بے نظیر بھٹو: مجھے مشترکہ اجلاس میں ہنگامہ کر کے دکھ ہوا لیکن یہ لوگ کسی کی نہیں سنتے۔ ہماری وجہ سے وہ مشترکہ اجلاس نہیں رہا۔ بلکہ اپوزیشن کا شو بن گیا۔ ان میں اور ہم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہم مکھی بھی نہیں مار سکتے۔ یہ انسانوں کو مار سکتے ہیں۔ اب کتنے ماورائے عدالت قتل ہوئے۔ یہ ڈکٹیٹر ہیں۔ سب کچھ حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ ہم قومی خزانے کو قوم کی امانت سمجھتے ہیں اور یہ اس سے گھر بناتے ہیں۔

سوال: گاؤں کیسا لگتا ہے۔؟

بینظیر بھٹو: مجھے گاؤں بہت پسند ہے۔ بچپن یاد آجاتا ہے۔ آپ کے انٹرویو نے مجھے ہلکا پھلکا کر دیا ہے۔ سیاسی انٹرویوز دے دے کر تنگ آچکی ہوں۔ آپ کا بہت شکریہ۔

محترمہ شہید سے طویل ترین ملاقات

1999ء میں مارچ کے مہینے کا تیسرا ہفتہ تھا۔ مجھے دوپہر کو محترمہ کے سٹاف نے بتایا کہ آپ کی شام کو محترمہ سے ملاقات ہے۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی بتا دیا گیا کہ شام ساڑھے چھ بجے ہونے والی ملاقات صرف بیس منٹ کی ہوگی۔ خیر طے شدہ پروگرام کے مطابق میں ایف ایٹ، اسلام آباد میں واقع زرداری ہاؤس پہنچا۔ محترمہ کے سٹاف نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں محترمہ تشریف لے آئیں بھٹو کی بیٹی نے گولڈن لباس پہنا ہوا تھا، پاؤں میں جوگرز تھے، صاف دکھائی دے رہا تھا کہ محترمہ ورزش کر کے آرہی ہیں۔ وہ پسینے میں شرابور بیٹھ گئیں اور پھر گفتگو کا آغاز ہو گیا۔ آپ کی یاددہانی کے لئے عرض کرتا چلوں کہ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سیف الرحمٰن خوف کی علامت بنا ہوا تھا۔ سیف الرحمٰن نامی انوکھا کردار محترمہ بےنظیر بھٹو اور جناب آصف علی زرداری کے خلاف گھناؤنے کھیل میں پیش پیش تھا۔ اس شام محترمہ بہت خوشگوار تھیں گفتگو کے آغاز میں کہنے لگیں ”جب یہ گھر بن رہا تھا تو آصف اس کی دیواریں اونچی بنوا رہے تھے اور میں بہت تنقید کرتی تھی مگر آج یہ سوچتی ہوں کہ آصف درست تھے، آصف بہت دوراندیش ہیں۔۔“

محترمہ نے گفتگو کے آغاز میں آصف علی زرداری کو زبردست انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا اس مرحلے پر انھوں نے آصف علی زرداری کے بارے میں تاریخی مگر تعریفی جملے کہے۔ بچوں کے بارے میں بڑی باتیں ہوئیں۔ وقت بیس منٹ سے آگے بڑھ کر تیسویں منٹ کو چھونے لگا تو سٹاف کا ایک بندہ اندر داخل ہوا اور کہنے لگا کہ سید اقبال حیدر آئے ہیں اور وہ ملنا چاہتے ہیں محترمہ نے جواباً کہا کہ۔۔ ”ابھی تو ہم تازہ جوس پی رہے ہیں، انہیں بٹھائیں۔۔“ سٹاف نے کہا کہ انکی کراچی کی فلائٹ ہے۔ اس پر محترمہ نے فرمایا کہ۔۔ ” ہماری گفتگو لمبی ہے اقبال حیدر سے کہیں کہ وہ کراچی چلے جائیں، ان سے پھر ملاقات ہو

جائے گی۔۔'' محترمہ بے نظیر بھٹو نے تھوڑے سے وقفے کے بعد اپنے سٹاف سے کہا کہ۔۔
'' آج اعتزاز احسن سمیت جتنے لوگوں سے میری ملاقاتیں ہیں انھیں منسوخ کر دیں اور ان لوگوں کو اطلاع بھی کر دیں۔۔'' بس اس کے بعد محترمہ نے ٹھنڈی سانس لی اور بڑے اطمینان سے باتیں شروع کر دیں اس روز محترمہ نے اپنے گھر کی باتیں کیں اس میں ان کے بچپن اور زمانہء طالبعلمی کی باتیں بھی شامل تھیں۔ آصف علی زرداری کی بہادری کے قصے بھی تھے اور بچوں کے بارے میں باتیں بھی تھیں۔ انہوں نے اس شام اپنی پارٹی کے ایک ایک بندے پر بحث کی۔ خاص طور پر پنجاب پیپلز پارٹی کے معاملات زیرِ بحث رہے۔ انہوں نے میری بہت سی باتوں سے اتفاق کیا اور کچھ باتوں پر برملا کہا۔۔'' نہیں میں اس سے اتفاق نہیں کرتی۔۔'' پیپلز پارٹی سندھ کے کچھ معاملات بھی زیرِ بحث آئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اس شام اپنے اور اپنے خاندان کے خلاف ہونے والی سازشوں کا تذکرہ کیا۔ اس مرحلے پر ہم سوچ وبچار کرتے رہے کہ دشمنوں کی فلاں چال کو کیسے ناکام بنایا جا سکتا ہے۔ ایک ایک چال کا حساب لگایا گیا اور پھر ہر ایک چال کا جواب تیار کیا گیا چونکہ محترمہ بچوں کے حوالے سے خاصی پریشان تھیں ان کا کہنا تھا کہ آصف علی زرداری پہلے ہی پسِ دیوارِ زنداں ہے اب یہ میرے خلاف سازشوں کا جال بن رہے ہیں۔ جونہی محترمہ نے سازشوں کو بے نقاب کیا تو میں نے ان سے گزارش کی کہ آپ ملک سے باہر چلی جائیں جس سے انہوں نے اتفاق کیا اور پھر وہ باہر چلی گئیں وہ گئیں تو تھوڑے عرصے کے لئے تھیں مگر پھر حالات کے جبر نے ان کا راستہ روک لیا کیونکہ پاکستان میں ایک آمر نے پھر سے اقتدار پر قبضہ کر لیا 12 اکتوبر 1999ء کے بعد حالات وواقعات ہی بدل گئے۔

جی ہاں! تو میں محترمہ سے طویل ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ نشست جب پانچویں گھنٹے کو چھونے لگی تو میں نے اجازت لینے کی کوشش کی مگر محترمہ نے مجھے منع کر دیا پھر میں ہر پندرہ بیس منٹ بعد اٹھنے کی کوشش کرتا رہا بالآخر یہ کوششیں ایک گھنٹے بعد کامیاب ہوئیں۔ محترمہ نے یہ کہتے ہوئے مجھے چھٹی دی کہ۔۔'' لگتا ہے آج آپ کو نیند بہت آئی ہوئی

ہے۔ ''میں اس چھ گھنٹے طویل نشت کو کبھی نہیں بھول سکتا چونکہ مجھے دنیا کی ایک عظیم شخصیت کے پاس اتنے گھنٹے بیٹھنے کا شرف حاصل ہو رہا تھا اور ساتھ ہی میں محترمہ کی گفتگو سے بہت کچھ سیکھ بھی رہا تھا میری زندگی میں یہ نشست ہمیشہ آباد رہے گی اور میں اس کیلئے محترمہ کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔ محترمہ کے ٹائیٹ شیڈول میں سے اتنے گھنٹوں کا نکل آنا خوش قسمتی سے کم نہیں تھا کیونکہ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی تھی تو مختصر وقت کیلئے ہوتی تھی۔ خدا محترمہ شہید کو بلند مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

بی بی کی اہل فکر و فن سے محبت

پاکستان پیپلز پارٹی اہل فکر و فن کا ہمیشہ ہی سے خیال رکھتی رہی ہے اس سلسلے میں ملک بھر کے شاعروں' ادیبوں اور فنون لطیفہ سے وابستہ افراد کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو بھی پیپلز پارٹی کے اس رویئے کی سخت حامی تھیں۔ انہوں نے شعر و ادب سے وابستہ افراد اور فنکاروں کو نہ صرف مختلف عہدوں پر فائز کیا بلکہ بعض کو تو انتخابات کیلئے ٹکٹ بھی جاری کئے۔ مثلاً اسلم گورو داسپوری' اعتزاز احسن' فخر زمان' قیصر خان نظامانی اور شفیع محمد شاہ کے علاوہ مخدوم امین فہیم کو انتخابی میدان میں اتارا گیا۔ پیپلز پارٹی کلچرل ونگ کے عہدیداروں میں فخر زمان اور اداکار مصطفیٰ قریشی ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔

نوابزادہ کا حقہ اور حکومتی پریشانی!

الیکشن 2002ء سے ڈیڑھ سال قبل اے آر ڈی قائم ہوئی، تحریک بحالی جمہوریت کے پلیٹ فارم پر پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) نے نوابزادہ نصر اللہ خان کی سربراہی میں جدوجہد کی۔ پاکستان میں جمہوریت کے حوالے سے جدوجہد کرنے والوں میں نوابزادہ نصر اللہ خان کا تذکرہ بطور خاص کیا جاتا ہے۔ چونکہ محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف ملک سے باہر تھے لہٰذا دو مخدومین یعنی مخدوم امین فہیم اور مخدوم جاوید ہاشمی کو نوابزادہ نصر اللہ خان کی سپردگی میں دے دیا گیا۔ 2002ء کے انتخابات میں کوئی بھی واضح اکثریت حاصل نہ کر سکا۔ ان انتخابات میں پرویز مشرف کی تخلیق کردہ مسلم لیگ (ق) خفیہ اداروں،

انتظامیہ اور عدلیہ کی پوری کوشش کے باوجود ضرورت کی نشستیں حاصل نہ کر سکی جس کے باعث پرویز مشرف کیلئے اپنی حامی حکومت قائم کرنا خاصا مشکل ہو گیا۔ نوابزادہ نصراللہ خان نے اسلام آباد میں نوید ملک کی رہائش گاہ پر ڈیرے ڈال دیئے، وہاں ہر رات اے آر ڈی کے رہنما مختلف سیاستدانوں سے ملاقاتیں کرتے، ایم ایم اے سے بھی مذاکرات ہوتے مگر ایم ایم اے دونوں طرف مذاکرات کر رہی تھی، جب مہینے سے زیادہ وقت ہو گیا اور پرویز مشرف تمام حربوں کے باوجود حکومت قائم کرنے میں ناکام نظر آئے تو انہوں نے اپنے معتمد خاص طارق عزیز سے کہا کہ نوابزادہ صاحب کو حقے سمیت ایک ہفتے کیلئے کہیں لے جائیں ہم حکومت قائم کر لیں گے، ایسا تو نہ ہو سکا مگر جنرل حسین مہدی نے کرشمہ دکھایا اور پیپلز پارٹی توڑ دی۔ پیپلز پارٹی کے کچھ ممبران نے بے وفائی کا مظاہرہ کیا اور رات کے اندھیرے میں پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کے نام سے ایک گروپ قائم کر دیا جس کے سہارے حکومت قائم ہوئی۔ میر ظفراللہ جمالی بھاری بھرکم جسم کے باوجود صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے حکومت بنا سکے، بعد میں انہیں بھی رخصت ہونا پڑا، ان کی جگہ پاکستان کے ایک غیر رہائشی بابو نے لے لی۔

جس رات جمہوریت کیلئے جیلیں کاٹنے والوں نے محض اقتدار کیلئے بے وفائی کی، اس رات وفا آنسو بہاتی رہی، میں مایوس ہو کر سو چکا تھا کہ لاہور سے میرے دوست سہیل وڑائچ نے مجھے فون کیا اور کہنے لگے آپ نے کیا کروا دیا ہے، جواباً میں نے بے وفاؤں میں سے سہیل وڑائچ کے دوستوں کا نام لیا جس پر وہ کہنے لگے مجھے دکھ ہے۔ اس بے وفا رات کے اگلے روز ایرانی سفارتخانے میں افطار پارٹی تھی وہاں میں نے فیصل صالح حیات سے پوچھا کہ آپ نے یہ کیوں کیا؟ اس پر مخدوم فیصل صالح حیات کہنے لگے ہم سیاست عزت کیلئے کرتے ہیں ناہید خان سے بے عزتی کروانے کیلئے نہیں، خیر فیصل صالح حیات اقتدار میں چلے گئے، ان کے مخالف سیدہ عابدہ حسین، سید فخر امام اور صغریٰ امام پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ عابدہ حسین کے خاندان کو پرویز مشرف نے خاص طور پر ٹارگٹ کیا اور تینوں یعنی

ماں، باپ اور بیٹی کو الیکشن جیتنے نہ دیا۔ اب فروری 2008ء کے الیکشن کے بعد پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی ہے تو صغریٰ امام کو سینیٹر بنا دیا گیا ہے۔ بات نوابزادہ نصر اللہ خان کے حقے سے شروع ہوئی تھی، اب ان کے بیٹے نوابزادہ منصور احمد خان جمہوری پارٹی کے سربراہ ہیں اور شاکی ہیں کہ انہیں آل پارٹیز کانفرنس میں مدعو نہیں کیا جاتا، پیپلز پارٹی کے اکابرین کو اس پر یقیناً سوچنا ہوگا۔

شگفتہ جمانی کی زبانی

محترمہ بے نظیر بھٹو شہید جہاں خود بڑی بہادر تھیں وہاں وہ اپنے ساتھیوں کے حوصلے بڑھاتی رہتی تھیں۔ کالے کرتوتوں کا مالک جام صادق سندھ پر حکمرانی کر رہا تھا اس نے پیپلز پارٹی کے نام لیواؤں پر سندھ کی دھرتی تنگ کر رکھی تھی مردوں کے علاوہ عورتوں پر بھی ظلم ڈھائے جا رہے تھے شگفتہ جمانی پر جبر کے پہاڑ توڑے گئے مگر شگفتہ جمانی نے محترمہ بے نظیر بھٹو کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا پھر ایک مرتبہ محترمہ شہید شگفتہ جمانی سے کہنے لگیں "مجھے پتہ ہے کہ میری وجہ سے آپ پر سختیاں کی جاتی ہیں میں آپ کے حوصلے کی قدر کرتی ہوں"

---یہ بھی ایک انداز تھا۔

مسئلہ کشمیر پر مہارت رکھنے والی اور اس مسئلے کے حوالے سے بین الاقوامی شہرت کی حامل دانشور پروفیسر تقدیس گیلانی ایک روز بتانے لگیں کہ میں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کا ایک اور انداز دیکھا ہے، میں نے کہا، تقدیس گیلانی وہ کونسا انداز ہے؟

پروفیسر صاحبہ بتانے لگیں کہ میں 2003ء میں وکٹوریہ شیفر کی کتاب کی تقریب کے سلسلے میں لندن میں تھی چونکہ وکٹوریہ شیفر کی محترمہ بے نظیر بھٹو سے بھی دوستی تھی لہٰذا محترمہ بے نظیر بھٹو بھی تقریب میں بطور خاص مہمان کے مدعو تھیں۔ پروفیسر تقدیس گیلانی کے بقول کتاب کی تقریب سے چند روز قبل میں نے لندن میں شلوار قمیض میں ملبوس دو خواتین کو ایک سٹور میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا کیونکہ یہ دونوں خواتین بڑی پرکشش تھیں میں ان کے پیچھے لپکی، کیا دیکھتی ہوں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی بہن صنم بھٹو کے ہمراہ اپنے بچوں کیلئے

شاپنگ کر رہی ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے شلوار قمیض جبکہ صنم بھٹو نے ٹراوٴذر شرٹ پہن رکھا تھا اسی سٹور میں محترمہ بے نظیر بھٹو سے کھڑے کھڑے میں نے بہت سی باتیں کیں۔ میں نے انھیں وکٹوریہ شیفر کی کتاب کی تقریب رونمائی میں آنے کا پوچھا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں اور سردار قیوم آزاد کشمیر سے خاص طور پر آئے ہیں۔ جواب میں محترمہ کہنے لگیں۔۔ وکٹوریہ شیفر میری دوست ہے مگر میں اس کی کتاب کی تقریب میں شریک نہیں ہوسکتی کیونکہ میری تھوڑی دیر بعد دوبئی کی فلائٹ ہے، میری والدہ کا آپریشن ہے مجھے دوبئی پہنچنا ہے مگر اب میں وہاں مقیم اپنے بچوں کیلئے جلدی جلدی سے چیزیں خرید رہی ہوں۔۔۔''

پروفیسر گیلانی کہنے لگیں کہ میں نے محترمہ بے نظیر بھٹو سے کہا کہ بچوں کی شاپنگ تو آپ دوبئی سے بھی کر سکتی ہیں جس پر محترمہ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ نہیں تحفے لے جانے چاہئیں اس سے محبت بڑھتی ہے۔ تقدیس گیلانی کہنے لگیں کہ میں بہت حیران ہوئی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو اتنی مصروفیات کے باوجود اپنے بچوں کیلئے خود خریداری کر رہی ہیں، ان کا یہ عمل ماں کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔

قارئین کی دلچسپی کیلئے میں یہاں یہ بتا تا چلوں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو بچوں سے والہانہ محبت تھی وہ اپنے ملنے والوں کو بعض اوقات حیران کر دیتیں کہ وہ اچانک سالگرہ کے تحفے لے کر پہنچ جاتیں، لوگ اس بات پر حیران رہ جاتے کہ محترمہ کو فلاں بچے کی سالگرہ کیسے یاد رہ گئی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کی ایک اور عادت تھی کہ جن دنوں وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہی تھیں تو وہ شام کو گھر لوٹتے وقت اکثر و بیشتر مرتضیٰ بھٹو کی بیٹی فاطمہ کیلئے چاکلیٹ لے لیتی تھیں۔ ایک روز مرتضیٰ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اچانک بی بی نے بریک لگانے کو کہا مرتضیٰ نے گاڑی روک دی۔ محترمہ ایک سٹور میں گئیں اور فاطمہ کیلئے چاکلیٹ اور دوسری چیزیں لے آئیں۔ اس پر مرتضیٰ ناراض ہوا اور کہنے لگا یہ کیوں؟

اس کا جواب محترمہ بے نظیر بھٹو نے کچھ اس طرح دیا۔۔۔ ''مرتضیٰ آپ کو یاد ہے

ہماری دو پھوپھیاں تھیں ایک پھوپھی ہمارے لئے چیزیں لاتی تھیں اور دوسری خالی ہاتھ آ جاتی تھیں اور آپ کو یہ بھی یاد ہے کہ ہمیں ہمیشہ وہ پھوپھی اچھی لگتی تھیں جو ہمارے لئے چیزیں لے کر آتی تھیں۔۔" محترمہ بے نظیر بھٹو بچوں پر ہمیشہ مہربان رہتی تھیں وہ بلاول، آصفہ اور بختاور کو اکثر آئس کریم کھلانے لے جاتی تھیں۔ بلاول کو تو نماز جمعہ کیلئے خود چھوڑ کر آتی تھیں محترمہ نے اپنی زندگی کو ضوابط کے مطابق ڈھالا ہوا تھا وہ اپنی سیاست اور گھر کو مکمل وقت دیتی تھیں۔ محترمہ کی نیند بہت کم تھی محترمہ بے نظیر بھٹو کے پڑھنے کی رفتار بہت تیز تھی انہیں مطالعہ کی عادت تھی خود بہت اچھا لکھتی تھیں، خود مصنف تھیں انکی ذہانت کی پوری دنیا معترف ہے۔

"ہنسی مذاق"

1993ء کے الیکشن میں ڈاکٹر شیر افگن نیازی آزاد حیثیت میں جیت کر قومی اسمبلی میں پہنچے، انہوں نے حکومت کو جوائن کیا مگر پیپلز پارٹی میں شامل نہ ہوئے، ڈاکٹر صاحب کی وجہ شہرت آئین پر مہارت ہے سو بہت سے لوگ انہیں قانون میں پی ایچ ڈی کرنے والا سمجھتے ہیں حالانکہ ایسی بات نہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے انہیں قانون کا وزیر بنا دیا، ڈیڑھ مہینے بعد ڈاکٹر صاحب نے گذارش کی کہ مجھے کوئی اور محکمہ دیا جائے میں آرتھوپیڈک سرجن ہوں لاء گریجویٹ نہیں، اس سے پہلے محترمہ بے نظیر بھٹو جب بھی ڈاکٹر شیر افگن سے سوال کرتی تھیں کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے کس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی تو وہ فوراً کہتے تھے "چاہ گل خان والہ یونیورسٹی" اس پر محترمہ بے نظیر بھٹو ہنستیں اور کہتیں ڈاکٹر صاحب یہ کس ملک کی یونیورسٹی ہے میں تو دنیا کی بڑی یونیورسٹیوں کو جانتی ہوں۔ پھر ایک دن پول کھل گیا کہ ڈاکٹر صاحب کسی یونیورسٹی کا نام نہیں اپنے گاؤں کا نام لیتے ہیں اور انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ انہوں نے نشتر میڈیکل کالج ملتان سے ایم بی بی ایس کیا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی دوسری حکومت کو جب فاروق لغاری نے ختم کیا تو ڈاکٹر شیر افگن نیازی اور مخدوم احمد عالم انور پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب نے یہ کہا کہ محترمہ اب آپ کی حکومت ختم ہو چکی ہے مگر ہم آپ کی پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں تو بی بی کہنے لگیں ڈاکٹر

صاحب آپ تو کب کے شامل ہو چکے ہیں۔

قمر زمان کائرہ کا کمرہ

پارلیمنٹ لاجز میں J-212 قمر زمان کائرہ کا کمرہ تھا، اس کمرے میں روزانہ شام کو ہماری نشست ہوتی تھی، سید نیر حسین بخاری، زمرد خان، مرتضیٰ ستی، میجر (ر) ذوالفقار گوندل، چوہدری منظور احمد اور میں مستقل شرکاء ہوتے تھے کبھی کبھار چوہدری شریف، لالہ باقر، طارق سلطان یا پھر دو تین صحافی شامل ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی چوہدری اعتزاز احسن، سید قربان علی شاہ اور خالد اقبال میمن بھی اس کمرے کا رخ کرتے تھے۔ اس کمرے میں بہت بحث ہوا کرتی تھی، اگلی صبح کے پروگرام ترتیب پاتے تھے، گویا اپوزیشن کا پورا پروگرام یہیں پہ ترتیب پاتا تھا، پھر ایک ممبر کے ذریعے مسلم لیگ (ن) والوں کو آگاہ کر دیا جاتا تھا، سو پرویز مشرف اور ان کے حواریوں کی حکومت کو جتنا ٹف ٹائم دیا جاتا تھا اس میں اس کمرے کا بڑا دخل تھا۔

حاکم علی زرداری کا حوصلہ

ان دنوں بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری پس دیوار زنداں تھے کہ ایک روز میری قابل احترام دوست چندی بی بی (سیدہ عابدہ حسین) نے مجھے فون کیا کہ آپ گھر تشریف لائیں۔ میں ان کے اسلام آباد میں واقع گھر چلا گیا ان کے ڈرائنگ روم میں آصف علی زرداری کے والد اور بے نظیر بھٹو کے سسر حاکم علی زرداری تشریف فرما تھے۔ ان کے ساتھ سید فخر امام بیٹھے تھے جبکہ ایک صوفے پر آصف علی زرداری کی سوتیلی والدہ ٹیمی زرداری براجمان تھیں۔ یہاں ہم دیر تک سیاست پر گفتگو کرتے رہے۔ اگلے دن حاکم علی زرداری کے انٹرویو کا وقت طے ہوا اور وہ میرے سٹوڈیو میں تشریف لائے میں حاکم علی زرداری سے سرائیکی اور پنجابی بولتا رہا مجھے آصف علی زرداری کے بارے میں تو علم تھا کہ وہ بہت سی زبانیں بولتے ہیں مگر اس دن حاکم علی زرداری صاحب نے بھی مجھے حیران کر دیا وہ انتہائی خوبصورت انداز میں پنجابی اور سرائیکی بولتے رہے۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ حاکم

علی زرداری نے جہاد کشمیر میں حصہ لیا تھا۔ ستر کی دہائی میں حاکم علی زرداری قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے سیدہ عابدہ حسین اس زمانے سے حاکم علی زرداری کی شناسا ہیں۔ حاکم علی زرداری جب انٹرویو کیلئے آئے تو ان سے بہت سی باتوں کے علاوہ آصف علی زرداری کے بارے میں بھی باتیں ہوئیں۔ اس مرحلے پر حاکم علی زرداری نے کہا کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے مگر مجھے فخر ہے کہ وہ کسی بھی جبر کے سامنے نہیں جھکا۔ مجھے اپنی بہو بے نظیر بھٹو پر بھی فخر ہے میں حاکم علی زرداری کی ان باتوں کو سن کر اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ بہت بلند حوصلہ شخص ہیں۔ حاکم علی زرداری کی ایک بیٹی فوزیہ کی شادی راولپنڈی میں کرنل حبیب (مرحوم) کے صاحبزادے اقبال حبیب کے ساتھ ہوئی ہے۔ اقبال حبیب قومی اسمبلی کی رکن فوزیہ حبیب کے بھائی ہیں۔ یہاں ایک ہی گھر میں بھابھی اور نند کا نام ایک ہی ہے یعنی فوزیہ۔

مشکل حالات اور سینٹرل انفارمیشن بیورو

محترمہ بے نظیر بھٹو خصوصی کی ہدایات پر سنٹرل انفارمیشن بیورو قائم کیا گیا ہے اس کی سربراہ فرزانہ راجہ تھیں، محترمہ بے نظیر بھٹو کی عادت تھی کہ وہ صبح سویرے پارٹی کے مختلف لوگوں کو ہدایت میل پر بھیج دیتی تھیں، فرزانہ راجہ کو بھی ہدایات آتی تھیں، ہم اکثر مساوات بلڈنگ زیرو پوائنٹ اسلام آباد میں بیٹھ کر ان ہدایات کی روشنی میں بہت سا کام کرتے۔ فرزانہ راجہ نے اس مقصد کے لئے باقاعدہ سٹاف رکھا ہوا تھا، میں ان کے ساتھ مشاورت میں شریک ہوتا تھا، فرزانہ راجہ کو بیک وقت بہت سا کام کرنا پڑتا تھا ایک طرف وہ اخبارات میں شائع شدہ مواد کی سمری محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھیجتی تھیں اور دوسری طرف پارٹی کے موقف کو اخبارات میں پیش کرتی تھیں، پھر فرزانہ راجہ کو لاہور بھی جانا پڑتا تھا چونکہ وہ صوبائی اسمبلی کی ممبر تھیں اور صوبہ پنجاب کیلئے پیپلز پارٹی کی سیکرٹری اطلاعات بھی تھیں انہیں کئی مشکلات درپیش تھیں مگر وہ اس کے باوجود سینٹرل انفارمیشن بیورو کو کامیابی سے چلاتی رہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ پیپلز پارٹی کی میڈیا مہم میں اس سینٹرل انفارمیشن بیورو نے بہت بڑا کردار ادا کیا اگرچہ محترمہ کے حوالے سے روزانہ کی بنیاد پر خبریں فرحت اللہ بابر، نذیر ڈھوکی اور کیپٹن

واصف روانہ کرتے تھے۔ بے نظیر بھٹو کے اس میڈیا آفس کا بھی بڑا کردار رہا ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو اور سیاسی خواتین

محترمہ بے نظیر بھٹو عورتوں کے حقوق کی بڑی علمبردار تھیں۔ انہوں نے اپنے دونوں ادوار میں عورتوں کیلئے بہت کام کیا۔ مثلاً فرسٹ ویمن بینک اور ویمن پولیس سٹیشن جیسے اقدامات کئے۔ سیاسی میدان میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے کئی خواتین کو متعارف کروایا اور بہت سی خواتین کو حوصلہ صرف اور صرف بے نظیر بھٹو کی وجہ سے ملتا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے سیاست میں عورتوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اس سلسلے میں انہوں نے بہت سی خواتین کو ڈائریکٹ الیکشن لڑوایا۔ بے نظیر بھٹو کی اپنی نندیں فریال تالپور اور ڈاکٹر عذرا فضل پیچو ڈائریکٹ الیکشن لڑتی ہیں۔ خود محترمہ بے نظیر بھٹو اور ان کی والدہ بیگم نصرت بھٹو ڈائریکٹ الیکشن لڑتی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اشرف عباسی اور ڈاکٹر فہمیدہ مرزا کے علاوہ شمشاد ستار بچانی' سسی پلیجو اور دیگر خواتین شامل ہیں سندھ ہی سے روبینہ قائم خانی' شگفتہ جمانی' فرح ناز اصفہانی' فوزیہ وہاب' شازیہ عطا مری' توقیر فاطمہ بھٹو' شہلا رضا' نفیسہ شاہ اور مہرین بھٹو شامل ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے پنجاب سے سیدہ عابدہ حسین' ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان' محترمہ ثمینہ خالد گھرکی' خالدہ محسن قریشی، بیگم شہناز جاوید' نیلم جبار' راحیلہ بلوچ' ناصرہ صدیق، حنا ربانی کھر' سیدہ صغریٰ امام اور فوزیہ بہرام سمیت چند خواتین کو ڈریکٹ الیکشن لڑوایا۔ ان میں ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان اور حنا ربانی کھر اور سیدہ صغریٰ امام پچھلی حکومتوں میں شامل تھیں۔ مگر ان خواتین کو باصلاحیت ہونے کی بنیاد پر محترمہ بے نظیر بھٹو نے نہ صرف اپنی پارٹی میں قبول کیا بلکہ انہیں ٹکٹ سے بھی نوازا۔ ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان نے اقوام متحدہ کے ساتھ بہت عرصہ کام کیا ہے جبکہ حنا ربانی کھر اقتصادیات کی ماہر ہیں ایک دنیا ان کی صلاحیتوں کی معترف ہے بلاشبہ حنا ربانی کھر نے خود کو اپنی صلاحیتوں کے باعث منوایا ہے اسی طرح سیدہ صغریٰ امام باصلاحیت سیاستدان ہیں ان کی تربیت میں سیدہ عابدہ حسین اور فخر امام کا سایہ شفقت موجود ہے جبکہ سیدہ عابدہ حسین ایک منجھی ہوئی سیاستدان اور

کامیاب سفارت کار کے طور پر خود کو منوا چکی ہیں۔ ان خواتین کے علاوہ پنجاب سے محترمہ بے نظیر بھٹو نے کئی خواتین کو جدو جہد کے صلے میں ٹکٹ جاری کئے خاص طور پر بیلم حسنین‘ بیگم نسیم چوہدری‘ فوزیہ حبیب‘ ناہید خان، مہرین انور راجہ‘ فرزانہ راجہ‘ ساجدہ میر‘ نرگس فیض ملک‘ عظمیٰ بخاری‘ فائزہ ملک اور پلوشہ بہرام کے علاوہ شبینہ ریاض شیخ کا نام لیا جاسکتا ہے جبکہ یاسمین رحمان‘ شہناز وزیر علی‘ صائمہ کھر، نرگس اعوان اور رخسانہ بنگش قابل ذکر ہیں اسی طرح صوبہ سرحد سے ڈاکٹر فائزہ رشید اور فرحت خان‘ بلوچستان سے ڈاکٹر ظل ہما شامل ہیں۔ آزاد کشمیر سے شاہین ڈار اور ملتان سے بشریٰ النقوی بھی بے نظیر بھٹو کی پیروی کرتے ہوئے سیاست میں داخل ہوئیں۔ پچھلے دور میں بے نظیر بھٹو کے حکم پر فرح پرویز صالح نے خواتین میلہ کروایا تھا اب بھی خواتین کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کیلئے حکومت بی بی کے مشن کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ خواتین ہی کی بہتری کیلئے بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام شروع کیا گیا ہے۔

تین خواتین سیکرٹری اطلاعات

محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہر فیصلے کے پیچھے کچھ نہ کچھ مقاصد ضرور ہوتے تھے، وہ بہت دوراندیش تھیں۔ انہوں نے اپنی آمد سے قبل پارٹی کی کئی کمیٹیاں بنائیں اور تبدیلیاں کیں۔ ایک بڑی تبدیلی کے طور پر مرکزی سیکرٹری اطلاعات شیری رحمان کو بنایا جبکہ پنجاب میں فرزانہ راجہ اور سندھ میں ڈاکٹر فہمیدہ مرزا کو سیکرٹری اطلاعات مقرر کیا۔ محترمہ کا یہ فیصلہ بہت اچھا تھا، اس سے میڈیا میں صورتحال بہتر ہوئی اور تینوں خواتین نے بڑے متحرک انداز میں میڈیا مہم چلائی۔

فوزیہ وہاب اور یوسف رضا گیلانی

میں ہر ہفتے اڈیالہ جیل جایا کرتا تھا جہاں مخدوم جاوید ہاشمی اور سید یوسف رضا گیلانی اسیری کے ایام گزار رہے تھے، جیل سپرنٹنڈنٹ ان دونوں پر بہت سختیاں کرتا تھا چونکہ میں نے ان دونوں کی کتابوں کو دیکھنا ہوتا تھا لہٰذا مجھے سختیوں کے باوجود جانا پڑتا تھا۔ میں سید

یوسف رضا گیلانی کی کتاب ''چاہ یوسف سے صدا'' کی نوک پلک سنوارنے کیلئے جاتا تو کئی سیاسی معاملات زیر بحث آتے۔ یوسف رضا گیلانی پر نیب نے جو کیس بنایا تھا وہ لوگوں کو نوکریاں دینے کا کیس تھا، گیلانی صاحب مجھے سرائیکی میں کہا کرتے تھے کہ سائیں مجھ پہ نوکریاں دینے کا مقدمہ ہے اور میں جیل سے لوگوں کی نوکریوں کیلئے سفارش کر رہا ہوں اور ابھی کل ہی میں نے ایک بندے کی نوکری کروائی ہے۔ پھر ایک دن کہنے لگے کہ یار! یہ فوزیہ وہاب نے اچھا نہیں کیا، میں نے کہا کیا؟ انہوں نے کہا وہ قومی اسمبلی کی اس کمیٹی میں شامل تھیں جس نے میرے خلاف فیصلہ دیا اور فوزیہ وہاب وہاں خاموش رہیں، خاموشی کا مطلب تائید کرنا ہے۔ بس پھر فوزیہ وہاب اور یوسف رضا گیلانی کی ناراضگی شروع ہوگئی، اسی دوران یہ بات یوسف رضا گیلانی نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو بتادی، محترمہ بھی فوزیہ وہاب پر سیخ پا ہوئیں اس کے بعد فوزیہ وہاب نے صلح کی کوششیں شروع کر دیں۔ فوزیہ وہاب اور یوسف رضا گیلانی کے مابین صلح کروانے میں سب سے بڑا کردار میں نے ادا کیا۔ اور میرے ہی کہنے پر یوسف رضا گیلانی نے ناراضگی ختم کی، اگر وہ ناراض رہتے تو شاید اس مرتبہ فوزیہ وہاب قومی اسمبلی تک نہ پہنچتیں۔ ان کے قومی اسمبلی تک پہنچنے میں اس ناراضگی کے خاتمے کا بڑا دخل ہے۔ آج کل فوزیہ وہاب پیپلز پارٹی کی مرکزی سیکرٹری اطلاعات ہیں۔ واضح رہے کہ اسلام آباد میں فوزیہ وہاب کا پہلا انٹرویو میرے ہی کہنے پر روزنامہ اوصاف کیلئے ہوا، میرے دوستوں حنیف صابر، ظفر ہاشمی اور فرخ نواز نے مہربانی کرتے ہوئے یہ انٹرویو کیا۔ اس کے علاوہ بھی میں نے میڈیا کی دنیا میں کئی جگہوں پر فوزیہ وہاب کو متعارف کروایا۔

......اور شاہراہ دستور میدانِ جنگ بن گئی

29 ستمبر 2007ء کی صبح مسلم لیگ (ق) کا ٹولہ، ثناء خوان پرویز مشرف بن کر الیکشن کمیشن میں داخل ہو چکا تھا، یہ ٹولہ انہیں غیر آئینی طریقے سے صدارتی امیدوار بنانا چاہتا تھا، الیکشن کمیشن میں اس وقت کے وزیراعظم شوکت عزیز، چوہدری شجاعت حسین، پنجاب

کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی اور وزراء کی پوری فوج موجود تھی۔ باہر سپریم کورٹ کے سامنے وکلاء، صحافی، سول سوسائٹی اور سیاسی کارکن سراپا احتجاج تھے۔ اتنے میں پولیس نے بے رحمانہ تشدد کا آغاز کر دیا اور یوں شاہراہِ دستور میدانِ جنگ بن گئی کئی وکلاء کے سر پھٹ گئے، کئی صحافی اور سیاسی کارکن زخمی ہو گئے، چوہدری اعتزاز احسن کو مارا پیٹا گیا، اس مار پیٹ کے دوران چوہدری صاحب کی عینک ٹوٹ گئی، علی احمد کرد زخمی ہو گئے، زمرد خان کا بازو ٹوٹ گیا اور میرے سر سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا، مجھے میرے دو ساتھیوں حامد میر اور اسلم خان نے شاہراہ دستور سے زخمی حالت میں اٹھایا جبکہ عصمت ہاشوانی نے ایمبولینس میں سوار کر کے پولی کلینک پہنچا دیا۔ اسی دوران اے آر وائی ون ورلڈ پر محسن رضا نے یہ خبر چلا دی کہ مظہر برلاس سمیت کئی صحافی زخمی، اس خبر نے میرے دونوں فون مصروف کر دیئے، مجھے بیگم کلثوم نواز نے لندن سے فون کیا، محترمہ بے نظیر بھٹو نے میری خیریت پوچھی، پیپلز پارٹی کی پوری قیادت ہسپتال میں میرے اور زمرد خان کے ارد گرد تھی۔ سمیعہ راحیل قاضی اور مسرت شاہین نے بھی خیریت دریافت کی۔ ابتدائی طبی امداد کے بعد میں اور زمرد خان آفیسرز وارڈ میں منتقل ہو گئے جہاں ہم سارا دن عیادت کرنے والوں سے ملتے اور رات گئے اڑھائی تین بجے اگلے دن کی پلاننگ کرتے، پولی کلینک کے ڈاکٹرز پر بڑا پریشر تھا کہ وہ ہمیں ہسپتال سے نکال دیں مگر ہم بھی بڑے ضدی تھے، پھر جب عید آئی تو زمرد خان اور میں نے باہمی مشاورت سے اپنے اپنے گھر منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ پولی کلینک کی ڈاکٹر انیس کوثر اور ان کی ساتھی ڈاکٹر آمنہ نے ہمیں گلدستے پیش کئے، میں آج تک ان دونوں ڈاکٹرز کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں اور ان کا احترام کرتا ہوں۔ نرسنگ سٹاف میں سے یعقوب نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ پولی کلینک میں، مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کی قیادت کے علاوہ سول سوسائٹی، وکلاء برادری اور صحافیوں نے ہمارا بہت خیال رکھا، اور ہماری عیادت کی۔ مخدوم جاوید ہاشمی، چوہدری نثار علی خان اور اقبال ظفر جھگڑا سمیت کئی لیگی اکابرین تشریف لائے۔ اس وقت کی حکومت میں شامل صرف دو وزیر میری خیریت

پوچھ سکے۔ ان میں چوہدری شہباز حسین اور ظفر اقبال وڑائچ شامل تھے البتہ ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان نے میری ہر طریقے سے مدد کی، میں ان کے تعاون کا شکر گزار ہوں۔ جس روز تشدد ہوا اسی شام ایاز امیر نے اے آر وائی پر خصوصی پروگرام کیا جس میں، میں نے خون آلود شرٹ کے ساتھ شرکت کی۔ اس سے اگلے روز صحافتی برادری نے اسلام آباد میں ایک بڑے مظاہرے کا اہتمام کیا جس میں سول سوسائٹی بھی شریک ہوئی۔ خواتین اور بچے ہمارے ہاتھ چومتے رہے۔ اس مظاہرے میں مخدوم جاوید ہاشمی، حافظ حسین احمد اور راجہ پرویز اشرف سمیت کئی سیاسی رہنما شریک ہوئے۔ صحافیوں پر تشدد کے خلاف لاہور، کراچی، پشاور، کوئٹہ، حیدر آباد، ملتان، راولپنڈی اور مظفر آباد سمیت تمام چھوٹے بڑے شہروں میں ملک گیر مظاہرے ہوئے۔ میں اپنے دوست فرخ نواز کا خصوصی طور پر شکر گزار ہوں، کہ وہ میرے زخمی ہونے کی خبر سن کر اس وقت کے وزیر اعظم شوکت عزیز کی گاڑی کے سامنے احتجاجاً لیٹ گیا۔ وزیر اعظم کے سکواڈ نے اس پر گن تان لی۔ میں صحافیوں کی ایسی بہادری کو سلام کرتا ہوں۔ بعد میں، میں نے اور فرخ نواز نے وزیر اعظم، وزیر داخلہ اور آئی جی اسلام آباد کے خلاف مقدمے کے لیے درخواست دی۔ اس مقدمے کے اندراج کیلئے سپریم کورٹ میں بحث جاری تھی کہ ایمر جنسی لگ گئی۔ جسٹس افتخار چوہدری خود انصاف کے طلبگار بن گئے۔ اب انہیں انصاف مل چکا ہے مگر ہماری درخواست ہنوز وہیں کی وہیں ہے۔

پولی کلینک میں خفیہ ملاقاتیں

میں جن دنوں اسلام آباد کے پولی کلینک ہسپتال میں زیر علاج تھا تو مسلم لیگی رہنما چوہدری نثار علی خان دو تین مرتبہ خیریت دریافت کرنے آئے۔ مخدوم جاوید ہاشمی بھی آتے تھے مگر انہیں ملنے کوئی اور بھی آتا تھا یہ کوئی اور سینیٹر نیلوفر بختیار تھیں ان دنوں نیلوفر بختیار مسلم لیگ ق کے اکابرین سے سخت نالاں تھیں کیونکہ ایک چھلانگ لگانے کے باعث ان کی پارٹی نے انہیں بڑا بدنام کیا تھا اور وہ سیاسی وابستگی بدلنا چاہتی تھیں اس مقصد کے لیے ملاقات کی غرض سے میرے کمرے کا انتخاب کیا گیا۔ مخدوم جاوید ہاشمی اور نیلوفر بختیار میں

تیسرا فریق میں ہوتا تھا اس دوران میں خصوصی انتظامات اس طرح کرواتا تھا کہ کوئی بھی وزٹر میری طرف نہ آئے آفیسرز وارڈ کے دونوں طرف میرے بندے کھڑے ہوتے تھے جو کسی کو بھی آگے آنے نہیں دیتے تھے اس طرح پولی کلینک میں خفیہ سیاسی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔صدارتی الیکشن کے موقع پر بے نظیر بھٹو کی قریبی ساتھی، سحر کامران جدہ سے پاکستان تشریف لائیں۔انہی دنوں صدارتی الیکشن میں نیلوفر بختیار نے آصف علی زرداری کو ووٹ دے کر پرانی محبت کو زندہ کیا۔پرانی محبت اس طرح کہ نیلوفر بختیار کی والدہ مسز علی ملک اور والد کرنل علی ملک بھٹو صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔مسز علی ملک نے جمہوریت کے لیے ہونے والی جدوجہد میں بڑا بھرپور کردار ادا کیا تھا۔آصف علی زرداری کو صدارت کیلئے ووٹ دینے والوں میں سمیرا ملک، گلشن سعید، کشمالہ طارق اور ماروی میمن بھی شامل تھیں۔

عوامی رنگ اور محترمہ کی بہادری

ایک لمبی جلاوطنی کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو اٹھارہ اکتوبر 2007ء کو کراچی ایئرپورٹ پر اتریں۔اس روز کراچی میں لوگوں کا سیلاب تھا، مخالفین سے انسانوں کی محبت کا یہ منظر دیکھا نہ گیا اور پھر بھٹو مخالف اور پاکستان مخالف قوتوں نے آدھی رات کو جلوس میں دھماکے کروا دیئے۔پیپلز پارٹی کے بے شمار کارکن موت کے منہ میں چلے گئے، بڑی تعداد میں لوگ زخمی ہو گئے، زخمی ہونے والوں میں سیدہ عابدہ حسین بھی شامل تھیں، محترمہ کے ٹرک کو بمشکل بچایا گیا۔اس واقعہ کے اگلے روز محترمہ بے نظیر بھٹو نے پریس کانفرنس کی اور خود کو نڈر ثابت کرتے ہوئے شہید کارکنوں کے گھروں پر گئیں، ہسپتال میں جا کر زخمیوں کی عیادت کی، محترمہ نے دھماکوں کے باوجود اپنا سفر نہ چھوڑا، وہ پاکستان کے کونے کونے میں گئیں، جب وہ کوئٹہ گئیں تو وہاں پر بھی دھماکے کروائے گئے مگر وہ بے خوف و خطر کوئٹہ کے بازاروں میں اپنے وطن کے عام انسانوں سے گفتگو کرتی رہیں، ریڑھی والوں سے فروٹ خریدتی رہیں، کوئٹہ میں نواب اکبر بگٹی کے صاحبزادوں سے تعزیت کی، پشاور میں پٹھانوں والی ٹوپی پہن کر تقریر کی۔ان کی پشاور آمد سے پہلے بھی دھماکے کروائے گئے۔ وہ لاہور میں چند

روز نظر بند رہیں، ان کی مسافت ہمیشہ دشمنوں کو پریشان کیئے رکھتی تھی۔ جب ایمرجنسی لگی ہوئی تھی تو وہ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی رہائش گاہ پر گئیں اور وہاں پرچم لہرانے کی بات کی، اسی روز وہ آج ٹی وی کے سامنے صحافیوں کے ساتھ احتجاج میں شریک ہوئیں جہاں پریس کلب کے سیکرٹری افضل بٹ نے احتجاج کا اعلان کر رکھا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو، شیری رحمان کے ہمراہ تشریف لائیں، یہاں پر صحافیوں نے خوب نعرے بازی کی، پورے اسلام آباد کے صحافیوں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کے اس جذبے کو بہت سراہا۔

صرف ایک کیمرہ

محترمہ بے نظیر بھٹو جلسوں اور پریس کانفرنسوں کے علاوہ ہر وقت بہت سے کیمروں کا سامنا کرنے سے گریز کرتی تھیں، اٹھارہ اکتوبر کو ان کی وطن آمد کے بعد اسلام آباد کے زرداری ہاؤس میں ان سے ملنے کیلئے جتنے بھی سفارت کار یا سیاستدان آتے یا پھر جو خصوصی اجلاس ہوتے تھے ان کی کوریج صرف ایک کیمرہ کرتا تھا جس کا بندوبست میرے ذمے تھا۔ کوآرڈینیشن فرزانہ راجہ کرتی تھیں پھر ہم بعد میں ڈی ویز بنا کر چینلز کو فراہم کرتے تھے۔ اس کا ایک فائدہ یہ تھا کہ تمام چینلز پر کوریج ایک طرح کی ہوتی تھی۔

پارلیمنٹ ہاؤس کی یادگار تقریب

ملک میں ایمرجنسی لگی ہوئی تھی یہ نومبر کے پہلے عشرے کی بات ہے چونکہ تین نومبر 2007ء کو ملک میں جنرل پرویز مشرف نے ایمرجنسی کا نفاذ کر دیا تھا۔ جنرل صاحب نے ایک مرتبہ پھر آئین کو پامال کیا اور من مانیاں شروع کر دیں، محترمہ بے نظیر بھٹو ان من مانیوں کے خلاف سراپا احتجاج تھیں، اس سلسلے میں انہوں نے پیپلز سیکرٹریٹ اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس کی اور اس پریس کانفرنس میں پارٹی قیادت کو ہدایت کی کہ وہ بھرپور احتجاج کریں، اس پریس کانفرنس کے بعد ڈاکٹر فہمیدہ مرزا، فوزیہ حبیب، نرگس فیض ملک اور دیگر خواتین نے بھرپور احتجاج کیا۔ واضح رہے کہ ان دنوں محترمہ بے نظیر بھٹو کی سکیورٹی کے تمام معاملات کی نگرانی موجودہ وزیر داخلہ رحمان ملک کر رہے تھے، رحمان ملک سکیورٹی کے امور

میں مہارت رکھتے ہیں انہیں دنیا کے بڑے بڑے ادارے سکیورٹی امور پر ماہر خیال کرتے ہیں۔ تین نومبر کی ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد غالباً نومبر کے پہلے عشرے کے آخری دنوں میں پیپلز پارٹی کی فارن لیزان کمیٹی نے ایک استقبالیے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس استقبالیے کا انعقاد پارلیمنٹ ہاؤس کے سینٹ لاؤنج میں کیا گیا تھا، اس استقبالیے میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے غیر ملکی سفیروں سے خطاب کرنا تھا اور ملاقات کرنی تھی۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد پارلیمنٹ ہاؤس جانے والے تمام راستوں کو بند کر دیا گیا تھا لہٰذا اس شام جہاں ملکی مہمانوں کو دقت کا سامنا کرنا پڑا وہاں غیر ملکی سفارت کاروں کو بھی سفر کی صعوبت برداشت کرنا پڑی۔ پہلے تو کوئی راستہ نہیں کھول رہے تھے پھر بہت احتجاج کے بعد ریڈیو پاکستان کے ساتھ والا راستہ کھول دیا گیا مگر سختی بہت کر دی گئی۔ پیپلز پارٹی کی قیادت پارلیمنٹ ہاؤس کے گیٹ نمبر 1 پر مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی یہاں اکبر خواجہ، انور بیگ اور پلوشہ بہرام پیش پیش تھے جبکہ مخدوم امین فہیم، سید یوسف رضا گیلانی، راجہ پرویز اشرف، ڈاکٹر فہمیدہ مرزا، ڈاکٹر عذرا افضل پیچوہو، فرزانہ راجہ اور دیگر راہنما بھی چشم براہ تھے۔ سب لوگ محترمہ بے نظیر بھٹو کی آمد کے منتظر تھے، فرزانہ راجہ نے بہت خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا جبکہ ڈاکٹر فہمیدہ مرزا مجھے کہنے لگیں کہ مصروفیت کے باعث میرے کپڑے پریس نہیں تھے سو میں وہی لباس پہن کر آ گئی ہوں جو سارا دن پہنے رکھا تھا۔ اس مرحلے پر ہم سب گپ شپ میں مصروف تھے کہ میں نے ڈاکٹر فہمیدہ مرزا سے کہا کہ میں یوسف رضا گیلانی کا استاد ہوں، سامنے کھڑے ہوئے یوسف رضا گیلانی نے برجستہ کہا۔ ''جی ہاں یہ استادوں کے استاد ہیں۔'' اتنی دیر میں سبز لباس میں ملبوس محترمہ بے نظیر بھٹو بڑے خوشگوار موڈ میں تشریف لائیں، ہم سب انہیں ایک چھوٹے سے جلوس کی صورت میں سینٹ لاؤنج تک لے گئے، یہاں محترمہ بے نظیر بھٹو غیر ملکی سفارت کاروں سے فرداً فرداً ملیں اور پھر انہوں نے خطاب کیا۔ انہوں نے اپنے اس خطاب میں پاکستان کی تصویر پیش کی اور اس تصویر میں پاکستان کی جمہوری صورتحال کو بھی پیش کیا، یہ تقریب اس حوالے سے یادگار رہے کہ نو سال بعد محترمہ

بے نظیر بھٹو نے پارلیمنٹ ہاؤس میں قدم رنجا فرمایا تھا۔ اس تقریب کو کئی حوالوں سے یادگار کہا جا سکتا ہے چونکہ اس استقبالیے کے بعد محترمہ بہت دیر تک صحافیوں کے ساتھ تشریف فرما رہیں۔ اس تقریب کی یادگاری کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ سینیٹر اکبر خواجہ کئی دنوں تک مجھ سے اس تقریب کی سی ڈی کی ڈیمانڈ کرتے رہے، بالآخر انہیں میں نے سی ڈی فراہم کر دی۔

محترمہ کا سٹنگ پلان

محترمہ بے نظیر بھٹو شہید سٹنگ پلان کا بہت خیال رکھتی تھیں، وہ ہمیشہ جب بھی کوئی کانفرنس ہوتی، پارٹی میٹنگ ہوتی یا دیگر سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مذاکرات ہوتے، نشستوں کی ترتیب پر بہت توجہ دیا کرتی تھیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی بے شمار مصروفیات کے باوجود کبھی بھی نشستوں کی ترتیب نہیں بھولتی تھیں، میں نے انہیں آخری مرتبہ زرداری ہاؤس اسلام آباد میں نشستوں کی ترتیب درست کراتے ہوئے دیکھا، میاں محمد نواز شریف اور دوسرے سیاسی اکابرین محترمہ بے نظیر بھٹو سے مذاکرات کیلئے زرداری ہاؤس آئے ہوئے تھے اس مرحلے پر ایک پریس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا، اس پریس کانفرنس میں محترمہ بے نظیر بھٹو اس وقت تک کھڑی رہیں جب تک وہ اپنی مرضی کے ترتیب شدہ پلان کے مطابق لوگوں کو نہ بٹھا پائیں۔ انہوں نے بیٹھنے والوں کی ترتیب کے علاوہ نشستوں کے پیچھے کھڑے ہونے والوں کو بھی ترتیب دیا، سو یہ پریس کانفرنس ایک بھرپور اور جداگانہ پریس کانفرنس محسوس ہونے لگی کیونکہ اس میں ملک کی اہم سیاسی قیادت مختلف سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

قصہ بہن بھائی کا......!

پیپلز پارٹی کے اہم رہنما چوہدری ذکاء اشرف اور مسلم لیگ (ن) شعبہ خواتین کی سربراہ عشرت اشرف بہن بھائی ہیں، یہ دونوں چوہدری اشرف کی اولاد ہیں، چوہدری اشرف بھٹو دور میں حیدرآباد سے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے، ایم کیو ایم کے رہنما شیخ آفتاب پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر اس وقت حیدرآباد سے ایم پی اے

بنے تھے۔ بیگم عشرت اشرف جب بھی اندرون سندھ میں خواتین کے اندر مسلم لیگ کیلئے کام کرتی تھیں تو اس بات کا شکوہ محترمہ بے نظیر بھٹو ذکاء اشرف سے کرتی تھیں۔ ذکاء اشرف آصف علی زرداری کے کلاس فیلو ہیں اور آج کل زرعی ترقیاتی بینک کے سربراہ ہیں جبکہ عشرت اشرف قومی اسمبلی کی رکن ہیں۔ الیکشن 2008ء کی مہم جب عروج پر تھی تو محترمہ بے نظیر بھٹو نے 24 دسمبر کو رحیم یار خان میں جلسہ کیا، 24 دسمبر کی شام وہ ذکاء اشرف کے گھر چلی گئیں رات انہوں نے وہیں قیام کیا۔ میاں نواز شریف کا 25 دسمبر کو رحیم یار خان میں جلسہ تھا، وہ 24 دسمبر کی شام رحیم یار خان پہنچ گئے اور انہوں نے بیگم عشرت اشرف کے گھر قیام کیا۔ اس طرح ملک کے دونوں بڑے لیڈر 24 اور 25 کی درمیانی شب ایک ہی علاقے میں رہے، ایک قائد بہن کے گھر پر تھا تو دوسری قائد بھائی کے گھر پر تھی۔ ملکی اخبارات نے اس خبر کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ یہ شب بسری ثابت کرتی ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو ذکاء اشرف پر بہت اعتماد تھا جبکہ نواز شریف کو عشرت اشرف پر۔ عشرت اشرف کے خاوند جعفر اقبال قومی اسمبلی کے سابق ڈپٹی سپیکر ہیں جب پرویز مشرف نے غاصبانہ طریقے سے 12 اکتوبر 1999ء کو اقتدار پر قبضہ کیا تھا تو جعفر اقبال قائم مقام سپیکر تھے۔ انہوں نے واضح لفظوں میں کہا کہ میں اسمبلی کا اجلاس ضرور بلاؤں گا، ان کی اس دھمکی کے بعد پرویز مشرف کو قومی اسمبلی ختم کرنا پڑی۔ بہت بعد میں لندن میں ایک فنکشن کے دوران عشرت اشرف اور جعفر اقبال سے بے نظیر بھٹو نے کہا کہ آیئے ڈپٹی سپیکر صاحب آپ ہی اسمبلی تڑوانے کے ذمہ دار ہیں۔ جعفر اقبال کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ پرویز مشرف نے انہیں ٹارگٹ کیا اور الیکشن نہ جیتنے دیا۔

بے نظیر بھٹو شہید اور امام ضامن

محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی عادت تھی کہ وہ کبھی بھی گھر سے امام ضامن کے بغیر نہیں نکلتی تھیں۔ ان کا اس سلسلے میں اتنا یقین تھا کہ وہ آصف علی زرداری کو رخصت کرتے وقت بھی آصف علی زرداری کے بازو پر امام ضامن باندھتی تھیں۔ جہاں تک محترمہ کا اپنا تعلق ہے اس

سلسلے میں گزارش کرتا چلوں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کسی صورت بھی امام ضامن کے بغیر گھر سے نہیں نکلتی تھیں۔ایک رات امام ضامن ختم ہو چکے تھے جبکہ اگلی صبح محترمہ بے نظیر بھٹو کو اسلام آباد سے کسی دوسری جگہ کیلئے روانہ ہونا تھا۔اب سوال یہ پیدا ہو گیا کہ رات کے دو بجے کہاں سے امام ضامن تیار کروائے جائیں۔اس سلسلے میں نرگس فیض ملک سے رابطہ قائم کیا گیا امام ضامن کی تیاری کے سلسلے میں نرگس فیض ملک نے ایف ٹین کے ایک درزی سے رابطہ قائم کیا مگر اس درزی کی رہائش گاہ ٹینچ بھاٹہ پنڈی میں تھی سورات کے ڈھائی بجے ٹینچ بھاٹہ سے درزی کو جگا کر ایف ٹین میں اس کی دوکان پر لایا گیا یوں محترمہ بے نظیر بھٹو کیلئے رات ساڑھے تین بجے امام ضامن تیار ہوئے جو چار بجے سحری کے وقت زرداری ہاؤس اسلام آباد پہنچائے گئے۔

توقیر کائرہ سے آخری ملاقات

میری کائرہ خاندان کے تمام افراد سے محبت ہے توقیر ہمارا دوست اور بھائی تھا اس سے آخری ملاقات 27 دسمبر ہی کو ہوئی۔میں نے اس سے کم ملنے کا شکوہ کیا تو کہنے لگا ''ہمیں بی بی کی مصروفیات کے ساتھ چلنا پڑتا ہے'' توقیر کائرہ 27 دسمبر کی شام ہم سے اس وقت بچھڑ گیا جب محترمہ شہید ہوئیں وہ محترمہ کو بچانے کے لئے کود پڑا اور اس نے جمپ لگایا مگر وہ اپنی قائد کے ساتھ ہی شہید ہو گیا خدا نے بے نظیر بھٹو شہید کو کیسے کیسے بھائی عطا کیے ہوئے تھے جو لمحوں میں جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہوتے تھے میں جب تعزیت کے لیے لالہ موسیٰ گیا تو وہاں قمر زمان کائرہ، تنویر اشرف کائرہ اور ندیم اصغر کائرہ کے ساتھ توقیر کائرہ کے بارے میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

خون میں ڈوبا ہوا پاکستان!

بدقسمت ملک کے باسیو! میں بھی تمہاری دھرتی کا ایک فرد ہوں میں نے محترمہ کی شہادت سے چند روز پہلے لکھا تھا کہ...... ''آج کل جلسوں سے خطاب کے دوران ایسے لگتا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے اندر باپ کی روح اتر آئی ہو......'' یہ جملہ لکھتے وقت مجھے قطعاً اندازہ

نہیں تھا کہ محترمہ کی روح بہت جلد باپ کی روح سے ملنے والی ہے۔ اب مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی کیا لکھوں، سوچ رہا ہوں غم پہ کیا لکھا جا سکتا ہے، دکھ کی کہانی کیسے بیان کی جا سکتی ہے۔ سوگ کی زبان کیا ہوتی ہے؟ 27 دسمبر کی شام سے میرے ملک کی ہر گلی میں اداسی ہے ہر گھر میں آشکبار آنکھیں ہیں ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے موت کی ہوا نگر نگر پھر گئی ہو جیسے بستیوں پر اداسی کا موسم اتر آیا ہو، پنچھی درختوں پر سہمے سہمے ہیں۔ دریاؤں کی روانی میں آہ وزاری شامل ہوگئی ہے 27 دسمبر کی شام میرے ملک کیلئے شام غریباں تھی میں نے بہت سال پہلے اظہر سہیل کی کتاب ''ایجنسیوں کی حکومت'' پڑھی تھی۔ 27 دسمبر کی شام مجھے اس حکومت کا یقین ہو گیا۔

میں چونکہ پنڈی اسلام آباد میں رہتا ہوں میرے لئے 27 دسمبر کا دن عجیب تھا اس روز میں اپنی صحافتی مصروفیات کے باعث اپنی پوری ٹیم کی نگرانی کرتا رہا۔ صبح سویرے ہی سے کام شروع کر دیا تھا کہ آج پنڈی شہر میں محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف آرہے ہیں۔ قومی تاریخ کے اس المناک دن کی دوپہر میں اپنے چھوٹے بھائی عمار برلاس کے ہمراہ اسلام آباد میں پیپلز سیکرٹریٹ گیا، وہاں سے نرگس فیض ملک کی قیادت میں خواتین کے جلوس کو رخصت کیا اور خود سینیٹر لطیف کھوسہ اور پلوشہ بہرام کے پاس بیٹھ گیا، کچھ دیر بعد دفتر چلا گیا گویا بے تابی اور بے چینی سارا دن میرے ساتھ رہی، پہلے نواز شریف پر فائرنگ کی خبر ملی پھر وہ خبر آگئی جس نے کہرام مچا دیا، بھٹو کی بیٹی شہید ہوگئی، میرا وطن اجڑ گیا، پاکستان خون میں ڈوب گیا۔ جدھر دیکھو ہر آنکھ آشکبار، جدھر دیکھو سہم ہی سہم، جدھر دیکھو اداسی ہی اداسی ...... ہائے نفرتوں کا بیج کس نے بویا، وہ کون ہے، جس نے ملک کو خون میں نہلا دیا؟ یہ سوال ہوتا رہے گا کہ گزشتہ آٹھ سالوں سے ملک کے چپے چپے پر دہشت گردی ہو رہی ہے اقتدار کی ہوس اتنی بھی نہیں ہونی چاہیے کہ لوگوں کی لاشوں پر حکومت کی جائے، ملک مقتل بنا دیا جائے۔ بے شک محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے ذمہ دار وہی لوگ ہیں جنہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار تک پہنچایا تھا جنہوں نے شاہنواز بھٹو کو زہر دیا تھا اور جنہوں نے

مرتضیٰ بھٹو کے سینے کو گولیوں سے چھلنی کیا تھا۔ بے نظیر بھٹو کی شہادت سے بڑا سانحہ کیا ہو سکتا ہے کہ اس سے پورا ماحول سوگوار ہو گیا ہے۔ ماحول کی سوگواری بتاتی ہے کہ بے نظیر بھٹو کا عوام سے سچا رشتہ تھا جو رشتہ اس کے باپ نے جوڑا تھا بیٹی نے نبھا دیا۔ وہ بیٹی جس پر جتنا ناز کیا جائے کم ہے وہ پاکستان کی نہیں برصغیر کی عظیم رہنما تھیں وہ برصغیر ہی کی نہیں دنیائے اسلام کی عظیم رہنما تھیں اور اگر دنیائے اسلام سے نکلیں تو ان کا شمار دنیا کے عظیم ترین رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ بلاشبہ پاکستان سمیت اسلامی دنیا کے پاس ان جیسا رہنما نہیں۔ اس کی ذہانت کا اندازہ کیجئے کہ مغرب کی عظیم درس گاہوں میں ان کے لیکچرز کا انتظار ہوتا تھا اور جب وہ لیکچر دیتی تھیں تو ہال میں خاموشی ایسے اترتی تھی جیسے بے نظیر کے علاوہ یہاں کوئی نہیں۔

27 دسمبر کی شام بے نظیر بھٹو نے لیاقت باغ میں اپنے خطاب کے دوران دفاع وطن کا بڑا تذکرہ کیا انہوں نے لاہور اور پنجاب کا ذکر کیا۔ راولپنڈی کے بارے میں کہا کہ اس شہر نے مجھے دکھ بھی دیئے مجھے خوشیاں بھی دیں۔ محترمہ کو کیا پتہ تھا کہ انہیں زندگی کا آخری دکھ اسی شہر میں ملنے والا ہے وہ اپنی زندگی کی آخری خوشی ہاتھ ہلا کر دیکھ رہی تھیں کہ یہ خوشی، لمحے میں دکھ میں بدل گئی ایک گولی ان کی گردن میں پیوست کیا ہوئی، سانس اکھڑ گئی بی بی ناہید خان کی گود میں گر گئیں منہ سے خون نکلنا شروع ہو گیا، عالم اسلام کی عظیم رہنما جدا ہو گئیں بقول محسن نقوی۔

یہ کس نے ہم سے لہو کا خراج پھر مانگا
ابھی تو سوئے تھے مقتل کو سرخرو کر کے

بے نظیر بھٹو کو شہید کرنیوالے اس کے بڑے جلسے نہ دیکھ سکے، ان سے محترمہ کا استقبال بھی نہ دیکھا گیا وہ جس روز کراچی آئیں اس روز بھی انہیں موت کی وادی میں دھکیلنے کی کوشش کی گئی۔ اس مرحلے پر نواز شریف کو خراج تحسین پیش کرنا ضروری ہے وہ جاوید ہاشمی اور راجہ ظفر الحق کے ہمراہ فوری طور پر ہسپتال پہنچے۔ جہاں میاں نواز شریف کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ انہوں نے پی پی پی کے کارکنوں کے ساتھ جدوجہد کرنے کا وعدہ کیا۔

میں 27 اور 28 دسمبر کی درمیانی رات زرداری ہاؤس کے اس کمرے میں پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کے درمیان بیٹھا تھا جہاں محترمہ سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ آج اس کمرے میں مخدوم امین فہیم اداس تھے۔ راجہ پرویز مشرف، رحمان ملک، نیئر بخاری اور شیخ منصور سب اداس تھے۔ چوہدری یاسین، نذیر ڈھوکی اور کیپٹن واصف کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شیری رحمان کہہ رہی تھیں دنیا اجڑ گئی۔ فرزانہ راجہ اور پلوشہ بہرام سوگوار تھیں۔ رخسانہ بنگش کہہ رہی تھیں سیاست میں کچھ نہیں رہا نرگس فیض ملک دھاڑیں مار کر رو رہی تھیں چوہدری مجید، لطیف اکبر اور مطلوب انقلابی بھی اداس تھے۔ اگلے روز سول سوسائٹی نے مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر فرزانہ باری، سرور باری، ماروی سرمد، ارشد بھٹی اور فوزیہ اسی طرح نعیم مرزا اور عالیہ مرزا، سب کے سب چہرے اداس تھے۔ عالیہ مرزا تو دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

آمروں کے ملک میں سوائے اداسی کے ہو بھی کیا سکتا ہے۔ آمروں کے دیس میں ایجنسیوں کا راج ہے آمروں کے دیس میں رہنا کتنا مشکل ہے۔ انصاف بہت مہنگا ہے۔ لکھنا بہت مشکل ہے۔ آمروں کے دیس میں جنتا کی خدمت کا سوچنا بھی جرم ہے یہی جرم محترمہ بے نظیر بھٹو کا تھا۔ خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

مسافت زیست کے دکھ

اگر بے نظیر بھٹو شہید کے دکھوں اور خوشیوں پر بات کی جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کی خوشیاں ان کے دکھ کسی نہ کسی طرح سیاست سے جڑے ہوئے تھے مگر پھر بھی خوشیوں میں مسکراہٹ ہوتی ہے، غم میں آنسو ہوتے ہیں، دکھوں میں تکالیف ہوتی ہیں سو مسکراہٹوں، آنسوؤں اور دکھوں کی کہانی ہر انسان کی کہانی ہے پورے سماج کی کہانی ہے شاید یہ اس لیے ہے کہ جب انسان کی تخلیق ہو رہی تھی تو انسانی بت پر انتالیس روز غم کی بارش برسائی گئی اور خوشی کی بارش صرف ایک دن ہوئی۔ فرشتوں نے دکھ اور سکھ کے تناسب میں اتنا بڑا تضاد دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ خدایا اس مخلوق کو آپ اتنے پیار سے بنا رہے ہیں اور پھر اس پر غم کی اتنی بارش کیوں؟ فرشتوں کا سوال ختم ہوا تو خدائے لم یزل نے جواب دیا ”ہاں اس

کی زندگی میں غم اور خوشی اسی حساب سے ہونگے''۔

سو دوستو! اس اصول کے تحت ہر ایک کو غم اور خوشی کی اسی کیفیت میں جینا ہے انسان روتا ہوا بلکتا ہوا دنیا میں آتا ہے اور آنسوؤں کی برسات میں چلا جاتا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے غم اور خوشی کا تناسب وہی تھا جو طے شدہ تھا۔ ہاں آپ اس لمحہ پر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ بڑے انسانوں کے دکھ بھی بڑے ہوتے ہیں اکیس جون 1953ء کو کراچی میں پیدا ہونے والی شہزادی کو کیا علم تھا کہ شہزادیوں کے مقدر میں چھوٹے نہیں بڑے دکھ ہوتے ہیں اسے کیا خبر تھی کہ شہزادیوں کو سفر کی صعوبتیں آنسوؤں کے ساتھ سہنا پڑھتی ہیں۔ بے نظیر بھٹو والدین کی بڑی لاڈلی بیٹی تھیں خاص طور پر ذوالفقار علی بھٹو اپنی اس بیٹی سے بڑی محبت کرتے تھے۔ یہ محبت آخری دموں تک قائم رہی اسی محبت کے طفیل بی بی باپ کی طرح مزاروں پر جایا کرتی تھیں، وہ کبھی داتاؒ دربار جاتیں تو کبھی بری امامؒ پر حاضری دیتیں اسی طرح کبھی عبداللہ شاہ غازیؒ اور کبھی سیہون شریف چلی جاتیں۔ ایک ملاقات میں خود محترمہ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگیں کہ مجھے مزاروں پر حاضری دے کر سکون حاصل ہوتا ہے میں اسی لیے مزاروں پر جاتی ہوں وہاں جا کر دعائیں کرتی ہوں وہاں سے اٹھنے والی مہک مجھے سکون دیتی ہے۔ اسی ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ انہیں نعتیں بہت پسند ہیں انہیں بچپن میں پنکی کہا جاتا رہا پھر جب بڑی ہوئیں تو والدہ نے پنکی کی بجائے بے نظیر کہنا شروع کر دیا۔ بے نظیر بھٹو کو اپنے پاپا کی طرح گلاب کا پھول پسند تھا وہ بھی سرخ گلاب، اب جب بے نظیر بھٹو کی قبر پر سرخ گلابوں کا ڈھیر دیکھتا ہوں تو بے اختیار محسن نقوی کا مصرع یاد آ جاتا ہے کہ

تجھ کو گلاب جیسا کفن کون دے گیا

بے نظیر بھٹو کو طوطے بہت پسند تھے جس گھر میں محترمہ کا بچپن گزرا وہاں زنان خانے میں طوطوں کا ایک بڑا پنجرہ تھا ایک مرتبہ مرتضیٰ نے ایک طوطے پر فائر کر دیا تو پنکی بڑی روئی بڑے دنوں تک اداس رہیں کسی طور پر بھی نہیں مان رہی تھیں اسے بڑی مشکلوں سے منایا گیا مگر پھر یوں بھی ہوا کہ بے نظیر بھٹو جب بھی گھر والوں سے روٹھتی تھیں تو وہ کھانا نہیں کھاتی

تھیں اس مرحلے پر مرتضیٰ کام آتا تھا چونکہ بے نظیر بھٹو گھر کے کسی اور فرد کے کہنے پر کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھیں بالآخر بھٹو صاحب مرتضیٰ کو بھیجتے تھے، مرتضیٰ بھٹو جا کر یوں مخاطب ہوتا۔ بہنا آپ کا موقف درست ہے آپ نے کھانے کا بائیکاٹ درست کیا ہے میں آپ کے موقف کی تائید کرتا ہوں اور میں بھی کھانے کا بائیکاٹ کرتا ہوں یہ سنتے ہی بے نظیر بھٹو کے چہرے پر پریشانی بکھر جاتی، وہ اپنے بھائی کو بھوکا نہیں دیکھ سکتی تھیں پھر وہ کہتیں اچھا مرتضیٰ تم کھانا کھالو مگر مرتضیٰ مشن کے مطابق کہتا جب تک تم کھانا نہیں کھاؤ گی میں بھی نہیں کھاؤں گا بس پھر وہ مرحلہ آجاتا جب بے نظیر بھٹو راضی ہو جاتیں بے نظیر بھٹو کا بچپن اپنے بہن بھائیوں سے محبتوں میں گزرا، طوطوں اور گلابوں سے پیار کرتے گزرا، انہیں بلیاں بہت پسند تھیں، محترمہ دال چاول شوق سے کھاتی تھیں۔ وہ دیہاتی بچوں کی طرح چاول میں چینی ملا کر آخری دنوں تک کھاتی رہیں بچپن میں ان کا شوق پڑھنا بھی تھا، انہوں نے اپنے باپ سے بہت کچھ سیکھا۔ بے نظیر بھٹو کی خوشیوں کا عرصہ ان کے والد کے جیل جانے سے قبل ہی کہا جا سکتا ہے کیونکہ بھٹو صاحب نے جب بے نظیر بھٹو کی 25 ویں سالگرہ کا کیک جیل میں کاٹا تو باپ نے بیٹی کو بتایا دیا کہ بیٹی اب ڈکٹیٹر ضیاء الحق الیکشن نہیں کروائے گا کیونکہ اسے آج پتہ چل گیا ہے کہ تم 25 سال کی ہوگئی ہو، اب تم الیکشن لڑ سکتی ہو اور وزیراعظم بن سکتی ہو، وقت نے بھٹو صاحب کی بات کو درست ثابت کیا وہ خود تختہ دار پر جھول گئے مگر ضیاء الحق الیکشن نہ کروا سکا، اس نے وعدے پر وعدہ کیا مگر ہر دفعہ ضیاء الحق کی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو باپ کی شہادت کے بعد ایک ایسے سفر پر نکلیں جس میں دکھوں کا سامنا تھا جس میں تکلیفوں کے سوا کچھ نہیں تھا، شہزادی کے راستے میں دکھ ہی دکھ تھے۔ ان دکھوں کے باوجود بے نظیر بھٹو کی زندگی کے ذاتی پہلو اور بھی تھے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو بچوں سے خاص لگاؤ تھا وہ بچوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھیں مثلاً وہ اپنی بھتیجی فاطمہ کے لیے ہمیشہ چاکلیٹ یا ٹافیاں لے کر جاتیں۔ ایک مرتبہ گھر جاتے ہوئے وہ چاکلیٹ لینے کے لیے رکیں تو مرتضیٰ بھٹو نے کہا کہ۔۔۔۔ یہ آپ کیوں لے کر

جاتی ہیں؟ بہن بھائی کا سوال سن کر بولیں ۔۔۔۔۔۔ ’’مرتضیٰ یہ اچھی بات ہے بچوں کے لیے کچھ لے کر جائیں جو خالی ہاتھ جاتا ہے بچے اسے پسند نہیں کرتے آپ کو یاد ہوگا ہماری دو پھوپھیاں تھیں ایک خالی ہاتھ آتی تھی جب کہ دوسری کوئی نہ کوئی چیز لے کر آتی تھیں اور وہ پھوپھی ہمیں اچھی لگتی تھیں۔ بے نظیر بھٹو کو اپنے بچوں سے بڑی محبت تھی ایک دفعہ کہنے لگیں ۔۔ سارا دن سیاست کے جھمیلوں میں گزرتا ہے جب رات ہوتی ہے تو تنہا ہوتی ہوں اس وقت بچے بہت یاد آتے ہیں کوشش کرتی ہوں خود کو بہت مصروف رکھوں مگر پھر بھی بچے تو بچے ہوتے ہیں ان کے کھلونے، ان کی تصویریں، ان کی یادیں مجھے اداس کر دیتی ہیں۔‘‘

اب جب بے نظیر بھٹو ساری یادوں کو سمیٹ کر ابدی نیند سو چکی ہیں ان کا بیٹا بلاول پیپلز پارٹی کا چیئرمین بن چکا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ محترمہ کو اپنے بیٹے سے بڑی توقعات ہوں گی۔ انہوں نے خود بلاول پر بڑی توجہ دی بلکہ آپ کو حیرت ہوگی کہ دن رات سیاست میں مصروف رہنے والی بے نظیر بھٹو بعض اوقات بچوں کو ہوم ورک کراتی تھیں اور اگر ٹائم مل جاتا تو انہیں کھانا بھی خود تیار کر کے دیتی تھیں۔

شہید بے نظیر بھٹو بچپن میں بیرسٹر بننا چاہتی تھیں، پھر وہ ایڈیٹر بننا چاہتی تھیں، انہیں امور خارجہ سے بڑی دلچسپی تھی انہوں نے خارجہ امور کے لیے کچھ عرصہ فارن آفس میں بھی کام کیا۔ ٹی وی کے کچھ پروگراموں میں اسی حوالے سے شرکت بھی کی، مگر ان کی منزل قسمت نے سیاست لکھی تھی وہ بالآخر سیاست دان بن گئیں۔ سیاست میں جا کر بھی انہوں نے اپنی دلچسپیاں نہیں چھوڑیں۔ وہ اخبارات کے لیے لکھتی رہیں، وہ یونیورسٹیوں میں لیکچرز بھی دیتی رہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے لیکچرز کا باقاعدہ انتظار کیا جاتا تھا رہی بات قانون کی تو ان کی آدھی سے زیادہ زندگی تو مقدمات لڑتے گزری۔ وقت شہادت بھی وہ سولہ کروڑ عوام کا مقدمہ لڑنے نکلی تھیں ان کے لیے ریاض الرحمٰن ساغر کا شعر ہے کہ

ڈھونڈیں گے کہاں بی بی ہم تجھ سی عظیم عورت
شائستہ، پڑھی لکھی، پرعزم، فہیم، عورت

اب جب بے نظیر بھٹو ہم میں نہیں ہیں تو ان کی عظمت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان کی شہادت پر دنیا بھر میں افسوس ہوا، ہمارا پورا ملک اداس رہا، ان کے سیاسی دشمنوں نے بھی ان کے لیے قرآن خوانیاں کیں۔ پاکستان کی ساٹھ سالہ تاریخ میں اتنا سوگوار ماحول پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا، اسی موسم اور ماحول پر قندیل کا شعر ہے کہ

تاریکیوں سے ربط بڑھانے لگے ہیں لوگ
خود اپنے ہی چراغ بجھانے لگے ہیں لوگ

آپ نے دیکھا کہ اب اس دور میں محترمہ کا چہرہ زیادہ پرنور ہو گیا تھا۔ اب ان کی تقریروں میں باپ کی روح بھی اتر آئی تھی بے نظیر بھٹو کو سبز رنگ بہت زیادہ پسند تھا پھر نیلا اور سفید رنگ پسند تھا۔ انہیں آئس کریم سوڈا پینے کا بہت شوق تھا وہ فانٹا بھی پیتی تھیں اور مجبوری کے عالم میں وہ ڈائٹ کوک بھی پی لیتی تھیں۔ ایک دن کہنے لگیں میں بھی صحافیوں کی طرح ہو گئی ہوں مجھے شام اچھی لگتی ہے اور راتوں کو دیر تک جاگنے کی وجہ سے اب راتیں بھی اچھی لگتی ہیں۔ محترمہ کی زندگی میں دکھ اتنے تھے کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں تھا کہ انہوں نے آخری بار قہقہہ کب لگایا تھا کہنے لگیں کہ شاید جوانی میں لگایا ہو۔ اگرچہ محترمہ ملک سے باہر بہت عرصہ رہیں مگر ملک کی سوغاتوں کو بھلا نہیں پائی تھیں مثلاً ملتان کے سوہن حلوے سے مستفید ہونا بھی انہیں اچھا لگتا تھا انہیں کچی پکی کھجوریں یعنی ڈوکے بہت پسند تھے۔ انہیں دنیا کی خوش لباس عورتوں میں شمار کیا جاتا تھا مگر حیرت یہ ہے کہ وہ لباس خود نہیں خریدتی تھیں مگر صبح پہننے کے وقت اس کا انتخاب خود کرتی تھیں۔ محترمہ کو یقین تھا کہ ان کے خواب سچے ہوتے ہیں جب ان کی حکومت ٹوٹی تو کہنے لگیں مجھے خواب آیا تھا کہ میں کراچی میں ہوں ایک سڑک ہے اور ایک بہت بڑا گھر ہے کوئی مجھے قتل کرنے کے لیے آ رہا ہے مجھے پھوپھی چیخ چیخ کر خبردار کر رہی ہیں اور میں پوچھتی ہوں پھوپھی آپ تو فوت ہو چکی ہیں وہ مجھے کہنے لگیں مجھے تمہیں بتانے کے لیے آنا تھا سو آ گئی ہوں ۔۔۔۔۔۔ محترمہ فارسی بولتی تھیں، پھر فرانسیسی اور انگریزی، بعد میں سندھی سیکھی، اردو بھی بولتی تھیں وہ آٹو بائیوگرافی، فکشن اور شاعری بھی

پڑھتی تھیں اور ساتھ کہتی تھیں کہ علم پھیلتا رہنا چاہیے۔انہیں علم سے اتنا لگاؤ تھا ایک مرتبہ کہنے لگیں۔۔۔۔۔۔میں آپ کی تحریر دیکھ کر دل کا حال بتا سکتی ہوں۔محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنے وطن سے بہت محبت تھی جب بھی ان کے گاؤں کا تذکرہ آتا وہ ہمیشہ کہتیں مجھے بچپن یاد آ گیا ہے۔کیا کہا جا سکتا ہے ایک عظیم عورت اور عظیم لیڈر کی شہادت پر فقط یہ کہ

ہر آنکھ اشکبار ہے بی بی کی موت پر

قاتل کون؟

ہمارے بدقسمت ملک میں کچھ ایسا انتظام کر دیا گیا ہے کہ کبھی کوئی سچی بات اور کسی واقعہ کی تحقیقات کی حقیقی تفاصیل عوام تک نہیں پہنچ پاتیں سب سے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو اسی لیاقت باغ میں عین اس وقت گولی ماردی گئی جب وہ بہت بڑے جلسہء عام میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے قاتل ایسا ماہر نشانہ باز تھا کہ پستول کی گولی عین دل پر لگی وزیراعظم گرے اور تڑپ کر مر گئے قاتل کو جس کا نام بعد میں سعید اکبر بتایا گیا اسی وقت گولی ماردی گئی حالانکہ سیکورٹی اسے پکڑ کر اس سے راز اگلوا سکتی تھی آخر اس شخص کو وزیراعظم سے ایسی بڑی کیا دشمنی تھی کہ اس نے خاص اس وقت وزیراعظم کی جان لینا ضروری سمجھا جب وہ مجمع عِام میں کوئی اہم اعلان کرنے والے تھے برسوں باتیں چلتی رہیں کہ تحقیقات ہو رہی ہیں اخبارات میں سٹوریاں چھپتی رہیں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ حقیقت کیا تھی پھر لوگ سب کچھ بھول بھال گئے تحقیقات کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ معلوم یہی ہوا کہ کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ پھر جنرل ضیاء کا طیارہ ہوا میں راکھ ہو گیا اس کے ساتھ امریکی سفیر اور کئی پاکستانی جرنیل راکھ ہو گئے اس کی کیا تحقیقات ہوئیں اور کیا نتائج برآمد ہوئے آج تک کوئی بات سامنے نہ آ سکی۔ بیچارے لیاقت علی خان تو ایسے مہاجر تھے کہ شاید ان کے بعد حکومت میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ان کا مخلص جاں نثار ہو اور جو قتل کے راز تک پہنچنے میں ذاتی دلچسپی لے مگر جنرل ضیاء نے میاں نواز شریف کو اپنا روحانی بیٹا کہا تھا اور میاں صاحب بھی خود کو کافی عرصہ تک اسی تعلق پر فخر کرتے رہے پھر جنرل ضیاء کا حقیقی بیٹا اعجاز الحق بھی صاحب

اختیار رہا اور ابھی کل تک وفاقی وزیر تھا مگر اس نے بھی شاید کوئی دلچسپی نہ لی کہ طیارہ کیس کی تہہ تک پہنچا جائے اخبارات میں کہانیاں آتی رہیں اور پھر سب کچھ پتہ نہیں کونسی فائلوں میں دفن ہو کر اندھیرے پاتالوں میں اتار دیا گیا۔ اصل حقائق کیا تھے، واللہ عالم بالصواب لیکن بعض مبصرین کا خیال ہے کہ تحقیقات لیاقت علی خان کے کیس میں بھی ہوئی ہونگی اور جنرل ضیاء کے طیارہ کیس میں بھی مگر چلتے چلتے آگے کچھ ایسی پردہ نشین قوتوں کے دروازے تک سراغ جاتے ہونگے جن کے بعد آگے جانا ناممکن ہو جاتا ہوگا اور سوچ کے بھی پر جلنے لگتے ہونگے۔

محترمہ کی شہادت کے پیچھے کام کرنے والی شرمناک سازش کھل سکے گی یا نہیں اس پر ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے اقوام متحدہ سے تحقیقات کرانے کے لیے درخواست کی اور اب شاید یہ بات یقینی مرحلہ تک پہنچ گئی ہے کہ اقوام متحدہ کا تفتیشی ادارہ اس ذمہ داری کو نبھائے گا۔ پہلے سرکاری ترجمان بیٹھ جاتا تھا اور روز نئی کہانیاں سناتا تھا اور یہ کہانیاں متضاد ہوتی تھیں چونکہ کیس ابھی زیر تفتیش ہے اس لیے اس پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اقوام متحدہ سے ہی تحقیقات کیوں؟ یہ سوال بھی اٹھایا جا رہا ہے ق لیگ اس کے خلاف ہے اس کا کہنا ہے کہ اس سے ملک کے تحقیقاتی ادارے بے وقار ہو جاتے ہیں دنیا کیا کہے گی کہ یہ کیسا ملک ہے جس میں ایک قتل کی تحقیقات بھی نہیں ہو سکتیں بالکل اسی طرح کی بات بعض کم فہم یا گمراہ کن سوچ رکھنے والے کالم نگار بھی لکھ رہے ہیں۔ سب سے پہلے پاکستان کے صدر جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف نے اس کی مخالفت کی تھی۔ ہمارے نزدیک پاکستان پیپلز پارٹی کا اقدام بڑا درست اور حقیقت پسندانہ ہے۔

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ محترمہ صرف پاکستان کی نہیں اقوام عالم کی لیڈر تھیں ایسی بین الاقوامی شخصیت کا قتل بہت بڑا جرم ہے اور اس کی تحقیقات بین الاقوامی طور پر کرانا ضروری ہے اس مقتدر بین الاقوامی ادارے نے پہلے بھی اس طرح کے کیس اپنے ہاتھ میں لئے ہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ پاکستانی عدالتیں کوئی اچھا پس منظر نہیں رکھتیں ان پر مقتدر قوتیں اثر انداز ہو جاتی ہیں اس کا سب سے بڑا ثبوت جناب ذوالفقار علی بھٹو کا کیس ہے جسے اب

بڑی حد تک عدالتی قتل تسلیم کر لیا گیا ہے اور پھر یہ کہ آج وکلاء سول سوسائٹی اور سیاسی پارٹیاں پی سی او ججز کی حیثیت پر برابر اعتراضات کر رہی ہیں پس ان اداروں پر بات چھوڑنا کسی طرح جائز نہیں۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ ملکی ادارے اگر تحقیقات کرتے ہیں اور بات کسی خاص آدمی تک پہنچتی ہے تو پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت پر الزام لگایا جاسکتا ہے کہ چونکہ پارٹی کی حکومت ہے اس لیے اس نے تفتیشی ادارے پر اثر انداز ہو کر اپنی مرضی کے نتائج حاصل کر لیے ہیں۔

ان وجوہات کی بناء پر ہم سمجھتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کا اقدام درست اور مبنی بر انصاف ہے۔ اس کے بعد ہم سوچتے ہیں کہ اس قتل کے پیچھے کس طرح کے لوگوں کے ہاتھ ہو سکتے ہیں جیسا کہ ہم نے کہا ہے معاملہ عدالت میں ہے اس لیے ہم جو کچھ کر رہے ہیں یہ کسی طرح عدالتی کام میں مداخلت نہیں یہ چند اندازے اور امکانات ہیں جو آئے روز تجزیات کی صورت میں اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور یہ تجزیئے ان اشارات پر مبنی ہیں جو محترمہ کے تحریر کردہ بیانات سے اخذ کئے جاسکتے ہیں جن کے اقتباسات ہم نے ابھی ابھی شامل کتاب کئے ہیں۔

۴۔ سب سے پہلی بات جو بکثرت کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ محترمہ نے مذہبی انتہاء پسندوں کے خلاف باتیں کی ہیں اور اپنے آپ کو اس سوچ کا مخالف کیا ہے اس لیے یہ ان ہی مذہبی انتہا پسندوں کی واردات ہے اور یہ وہی مذہبی دہشت گردی ہے جس کی کارستانیاں ہمارے معاشرے میں عام ہیں۔ اس سلسلے میں ہم تھوڑا تفصیل میں جائیں گے۔

قدامت پسند مذہبی گروہوں اور فرقوں میں یہ سوچ عام ہے کہ اسلام میں عورت کی سربراہی ناجائز ہے یہ لوگ عورت کی سربراہی تو کجا اس کے بے پردہ ہونے کے بھی خلاف ہیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اعتدال پسند ہیں اور جدید علوم سے واقفیت کی بناء پر ان کی تعلیمات میں نئے دور کے مسائل کا حل موجود ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس جدید عالم دین کی سوچ بھی دیگر علماء سے مختلف نہیں ان کی کتاب اسلامی ریاست

میں وضاحت ہے کہ قرآن وحدیث کی نصوص صریحہ سے یہ بات ثابت ہے کہ مسلمان عورت کسی ملک کی سربراہ تو کجا، اسمبلی کی ممبر اور کسی ادارے کی سربراہ بھی نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ بعد میں جماعت اسلامی ہی کے بعض علماء نے اسمبلی کی ممبری کے لیے گنجائش نکال لی اور اسی جماعت کے امیر قاضی حسین احمد نے اپنی دختر نیک اختر کو اسمبلی میں لا بٹھایا لیکن ملک کی سربراہ کے لیے یہ لوگ آج بھی جواز کا فتویٰ نہیں دے سکتے یہ تو علماء کی معتدل جماعت کا حال ہے، باقی علماء اس معاملہ میں سخت ہیں محترمہ نے اپنی تحریر میں سعودی عرب کے جس نابینا عالم کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے میرے متعلق فتویٰ دیا کہ مسلمان ملک کی سربراہی کرنا عورت کے لیے غیر اسلامی فعل ہے۔ سعودی عرب میں انہیں کوئی عام عالم نہیں سمجھا جاتا تھا یہ وہاں کے مفتیٔ اعظم تھے اور ان کا اسم گرامی شیخ عبدالعزیز بن باز تھا ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے کہ ”تم میں سے کوئی اگر ظلم کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو زبان سے اس کے خلاف جہاد کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہیں رکھتا تو دل سے اسے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے“ جہادی لوگ اس حدیث کو ہر مسلمان پر نافذ ہونے والا حکم بتاتے ہیں ہم نے دیکھا کہ کچھ مہینے پہلے گوجرانوالہ میں ایک خاتون وزیر کو ایک نوجوان نے قتل کر دیا تھا اور اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کر رہا تھا۔ محترمہ کے ساتھ چونکہ بہت پہلے لال مسجد پر حملے کے جواز میں بھی ایک بیان منسوب کیا گیا تھا اس لیے زیادہ شہرت اسی بات کو دی گئی کہ محترمہ مذہبی دہشت گردی کا شکار ہوئی ہیں بعض سرکاری حلقوں نے یہ بھی کہا تھا کہ قبائلی لیڈر بیت اللہ محسود نے محترمہ پر قاتلانہ حملے کرنے کا اعلان کیا تھا اس پر پیپلز پارٹی کے لوگوں نے جنوبی وزیرستان کے سینیٹر صالح شاہ کے ذریعے بیت اللہ محسود سے رابطہ کیا تھا اور بیت اللہ محسود نے اس بیان کی پرزور تردید کر دی تھی۔

اسامہ بن لادن نے بھاری رقم دے کر محترمہ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک لانے والوں کی خرید و فروخت کا اہتمام کیا تھا اس لیے یہ گمان بھی رہا کہ محترمہ کا قتل القاعدہ کے

دہشت گردوں کے ذریعے ہوا اگر چہ یہ گمان بھی خارج از امکان نہیں لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ محترمہ پر پہلے کراچی میں حملہ ہوا پھر راولپنڈی میں کامیاب حملہ ہوا ان دونوں حملوں میں جائے وقوعہ فوراً دھوڈالا گیا حالانکہ عام قتل بلکہ چوری کی واردات میں بھی شواہد کو مٹایا نہیں جاتا مگر ان حملوں کے شواہد فوری طور پر مٹا دیئے گئے اگر یہ لال مسجد والے یا القاعدہ والے مذہبی دہشت گردوں کی واردات تھی تو پھر کیا شواہد بھی وہی مٹا رہے تھے؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ بہر حال معلوم ہوا ہے کہ اقوام متحدہ کے تفتیشی ادارے نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لینے کا عندیہ دیا ہے خدا کرے غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تحقیقات ہوں اور اصل مجرم بے نقاب ہو جائیں۔

یوسف رضا گیلانی وزیر اعظم کیسے بنے......؟

محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد پیپلز پارٹی کے شریک چیئر مین آصف علی زرداری نے جہاں پاکستان کھپے کا نعرہ لگایا تھا وہاں محترمہ کا سوگ 40 روز تک منانے کا اعلان کیا تھا۔ انہی سوگ کے دنوں میں پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم آنسوؤں کے ساتھ رواں رہی، اٹھارہ فروری کو الیکشن تھے اور سولہ فروری کی رات میں آصف علی زرداری سے ملنے کیلئے لاہور میں واقع ذکاء اشرف کے گھر گیا، ہماری ملاقات رات ساڑھے گیارہ بجے شروع ہوئی جو کافی دیر تک جاری رہی۔ اس دوران دوسرے کمرے میں آصف علی زرداری کی پولیٹیکل سیکرٹریز رخسانہ بنگش اور فوزیہ حبیب موجود تھیں جبکہ باہر میرے دوست شعیب بھٹہ اور جمیل سومرو کے علاوہ منور انجم بھی موجود تھے۔ آصف علی زرداری سے بہت دیر گفتگو ہوتی رہی، اٹھارہ فروری کو الیکشن ہوئے تو پیپلز پارٹی بڑی جماعت کے طور پر سامنے آئی، ساتھ ہی آصف علی زرداری نے اسلام آباد میں پیپلز پارٹی کے نومنتخب اراکین اور مرکزی قیادت کا اجلاس طلب کر لیا، ایک سطح پر مسلم لیگ (ن) کے ساتھ انڈرسٹینڈنگ ہوئی کہ قومی سطح پر آزاد اراکین کے ساتھ پیپلز پارٹی رابطہ کرے اور پنجاب میں منتخب ہونے والے آزاد ایم پی ایز کے ساتھ مسلم لیگ (ن) رابطہ کرے، ہم مرکزی سطح پر رابطوں میں مصروف ہو

گئے۔ کچھ آزاد ممبران میرے ساتھ رابطے میں تھے سو میں انہیں آصف علی زرداری کے قابل اعتماد ساتھیوں کے حوالے کر رہا تھا، ایک دن مجھے فون آیا کہ میں سہ پہر سوا تین بجے میریٹ ہوٹل پہنچ جاؤں جب میں وہاں پہنچا تو آصف علی زرداری کے تین ڈاکٹرز وہاں موجود تھے۔ ان میں سے ایک مرد اور دو خواتین تھیں، گفتگو کا آغاز ہوا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی زندگی میں وزارت عظمیٰ کیلئے سوچنا نہیں پڑتا تھا اب سوال پیدا ہو گیا ہے کہ کسے وزیراعظم بنایا جائے۔ میں نے جواباً ان سے پوچھا کہ آپ کے پاس کتنے نام ہیں؟ انہوں نے میرے سامنے چار نام رکھے، اگرچہ میری سب سے شناسائی تھی مگر ان میں سے دوستی صرف یوسف رضا گیلانی کے ساتھ تھی، سو میں نے چاروں کے مثبت اور منفی پہلو بیان کرتے ہوئے سب سے سودمند وزیراعظم کے طور پر یوسف رضا گیلانی کا نام اوپر رکھا۔ تینوں ڈاکٹرز میں سے ایک نے کہا میرا بھی یہی خیال ہے، دوسرے دو ڈاکٹرز خاموش رہے۔ آصف علی زرداری کی زندگی میں بہت سے ڈاکٹرز ہیں اور وہ ڈاکٹرز پر اعتماد بھی بہت کرتے ہیں۔ میں نے اسی شام یوسف رضا گیلانی سے کہا کہ میں نے آپ کا کام کر دیا ہے اب آپ کا کام اتنا ہے کہ آپ صرف خاموشی اختیار کر لیں، یوسف رضا گیلانی نے میری بات پر عمل کیا اور آخری وقت تک خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اس سارے عرصے میں یوسف رضا گیلانی کیلئے راستے ہموار کرنے کی خاطر ہم کئی چالیں چلتے رہے، آصف علی زرداری کے انتہائی قریب سمجھے جانے والے ایک ڈاکٹر میرے ساتھ مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ اس دوران بڑے بڑے صحافیوں نے کئی وزیراعظموں کے اعلانات بھی کر دیئے، میں نے اپنے نوجوان ساتھی فرخ نواز سے کہا کہ آپ وزیراعظم کے امیدوار کی حیثیت سے صرف یوسف رضا گیلانی کا نام لیں سو انہوں نے چینل فائیو پر یوسف رضا گیلانی کے بارے میں خبر بریک کی۔ ایسی ہی خبر میں نے پرویز مشرف کے جانے کے بارے میں دی تھی اور وہ خبر بھی اس نوجوان صحافی کے ذریعے ہی بریک کروائی گئی۔ جس رات یوسف رضا گیلانی کا بطور وزیراعظم اعلان کیا گیا ہم اکٹھے زرداری ہاؤس سے خواجہ

عدنان کے گھر گئے، ہم زرداری ہاؤس سے تو صحافیوں سے بچ گئے مگر جب خواجہ عدنان کے گھر پہنچے تو جیو کے سبوخ سید کھڑے تھے، پھر مجھے یوسف رضا گیلانی نے کہا کہ اب کیا کیا جائے؟ میں نے ان سے کہا کہ آپ چند جملے کہہ دیں کیونکہ جن دنوں میں زخمی تھا تو سبوخ سید میرے پاس بڑی محبت سے آئے تھے۔

''وہ رات''

یہ 17 اور 18 اگست کی درمیانی رات تھی، میں حسب معمول میریٹ ہوٹل میں اپنے دوستوں کے ساتھ کافی پینے گیا ہوا تھا۔ رات اڑھائی بجے مجھے میرے پیارے دوست ڈاکٹر قیوم سومرو نے اشارے سے اپنی طرف بلایا، میں اپنے دوستوں کے پاس سے اٹھا اور ڈاکٹر صاحب کی طرف چلا گیا، ڈاکٹر صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور حال چال پوچھنا شروع کر دیا، میں نے انہیں پوچھا اس وقت خیریت، آپ کیسے؟ وہ مجھے کچھ بتائے بغیر رخصت ہو گئے، میں واپس آ کر دوستوں کے ساتھ میز پر بیٹھ گیا، تھوڑی ہی دیر میں میاں نواز شریف کے قریبی ساتھی شیر اعظم خان (جنہیں بعد میں قتل کر دیا گیا) تشریف لائے اور مجھے الگ ٹیبل پر لے گئے۔ میں ڈاکٹر قیوم سومرو اور شیر اعظم خان کی ایک ہی وقت میں میریٹ ہوٹل میں موجودگی سے بہت کچھ سمجھ گیا پھر مجھے شیر اعظم خان نے بتایا کہ کل دوپہر پرویز مشرف استعفیٰ دے رہے ہیں، میں نے یہ خبر نوجوان صحافی اور اپنے دوست فرخ نواز کو دی جنہوں نے وزیراعظم کی خبر کے بعد یہ دوسری بڑی خبر بریک کی جبکہ بڑے بڑے صحافی آخری وقت تک راشد قریشی کے چکروں میں پڑے رہے اور انکار کرتے رہے کہ وہ استعفیٰ نہیں دیں گے۔ اس خبر پر فرخ نواز کو ان کے چینل کی طرف انعام بھی ملا۔

سیاست کا پی ایچ ڈی۔۔۔۔۔آصف علی زرداری

پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین آصف علی زرداری نے پارٹی کی قیادت بڑے مشکل حالات میں سنبھالی بی بی کی شہادت کے بعد آصف علی زرداری کے سامنے مشکلات ہی مشکلات تھیں مگر انہوں نے بڑے حوصلے اور ہمت سے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے

اپنی سیاست کو آگے بڑھایا۔ اس سلسلے میں پہلے یوسف رضا گیلانی کو متفقہ وزیراعظم بنوایا، بلوچستان، سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد میں کامیاب اتحادی حکومتیں بنائیں۔ آصف علی زرداری نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث تمام جماعتوں کو اکٹھا کیا، موجودہ عہد میں پیپلز پارٹی کا وزیراعظم ہے، صدر بھی پیپلز پارٹی کا ہے، چیئرمین سینٹ فاروق نائیک بھی پیپلز پارٹی سے ہیں، قومی اسمبلی کی سپیکر ڈاکٹر فہمیدہ مرزا کا تعلق بھی پیپلز پارٹی سے ہے، سینٹ میں قائدِ ایوان سید نیّر حسین بخاری ہیں، اس کے علاوہ چاروں صوبوں میں پیپلز پارٹی شریک اقتدار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات میں بھی پیپلز پارٹی اقتدار کا حصہ ہے۔ یہ سب آصف علی زرداری کی کامیاب سیاسی حکمت عملیوں کے باعث ہے۔ میں آصف علی زرداری کا شروع ہی سے قدردان ہوں مگر اس دن تو اس نے میرا دل ہی جیت لیا جب صدارتی حلف کے وقت اپنے باپ کے قدموں کو چھوا۔ اگر آصف علی زرداری پہلے سونا تھا تو اس دن کندن ثابت ہوا۔ مسلم لیگ (ن) کے مرکزی راہنما، مخدوم جاوید ہاشمی کہتے ہیں کہ میں بھٹو کے نظریات کو سمجھتا تھا۔ شہید محترمہ کی سیاست سے بھی مجھے آگاہی تھی مگر آصف علی زرداری کی سیاست کو سمجھنے کے لیے مجھے پی ایچ ڈی کی ضرورت ہے کیونکہ آصف علی زرداری ہی اس وقت سیاست کا پی ایچ ڈی ہے۔ جاوید ہاشمی کی بات اس لیے سچ ہے کہ پچھلے برس نیویارک میں ایک عشائیے کے موقع پر جب آصف علی زرداری ہال میں داخل ہوئے تو میرے پاس بیٹھے ہوئے بوڑھے swiss writer نے کہا کہ .That is Bhutto style اس وقت میرے دوست خواجہ سہیل اور علی نواز میمن میرے ساتھ بیٹھے تھے جبکہ دوسری ٹیبل پر پنجاب اسمبلی کی اراکین نرگس اعوان اور شبینہ ریاض شیخ تشریف فرما تھیں۔

شہادت پر لکھے گئے
کالموں سے انتخاب

اسد اللہ غالب

انداز جہاں

محترمہ سے مرحومہ تک!

محترمہ بے نظیر بھٹو کو کسی سفاک قاتل نے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ میں نے محترمہ کے قتل کی خبر انٹرنیٹ پر لگائی تو چند منٹ بعد ہی ایک ای میل آئی۔ دنیا کی کسی ویب سائٹ نے ان کے نام کے ساتھ محترمہ کا لفظ نہیں لکھا، آپ نے یہ لفظ کیوں استعمال کیا ہے''۔

میں نے کہا: وہ اس دنیا میں نہیں رہیں، اب تو انہیں معاف کر دیں''۔

ابھی ایک ڈیڑھ ماہ پہلے میرے ایک بزرگ قلمکار نے مجھ سے کہا تھا کہ کوئی کالم نویس ان کو محترمہ نہیں لکھتا آپ اس لفظ سے کیوں پرہیز نہیں کرتے، 1986ء میں وہ طویل جلاوطنی سے واپس آئیں تو میں چند ماہ بعد ایک قومی روزنامے میں اداریہ نویسی کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ اس اخبار کے نیوز ڈیسک سے لیکر رپورٹرز تک حتیٰ کہ تمام کالم نویس میرے اداریوں میں لفظ محترمہ دیکھ کر چلا اٹھتے تھے۔ ایک بزرگ تو میرے گلے پڑ گئے اور کہنے لگے: تمہیں معلوم ہے کہ کس شخص کی کرسی پر بیٹھے ہو۔ میں نے کہا: جی ہاں! وہ بھڑ سے گئے اور کہا تو پھر بھی لفظ محترمہ لکھتے ہوئے شرم نہیں آتی۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں ملک کے دائیں بازو سے تعلق رکھتا ہوں کچھ لوگ مجھے، اسلامی کن ٹٹا'' بھی کہتے ہیں۔ 1970ء سے مجھے بھٹو سے نفرت کا سبق پڑھایا گیا۔ 1977ء میں مجھ جیسے نوجوانوں کو سڑکوں پر لا کھڑا کیا گیا۔ ہم نے اپنے اوپر گولیاں چلانے والوں کے سامنے گریباں کھول دیئے۔ ہم نے بنگلہ دیش نامنظور تحریک چلائی۔ 1988ء تک ہم ایک اور معرکے کیلئے تیار تھے۔ پہلے ہم بھٹو کو مطعون کرتے تھے، اب بھٹو کی بیٹی کے خلاف بکنے لگے۔ ہم نے جلد ہی اس کی حکومت کو چلتا کیا۔ وہ پھر اقتدار میں آئی تو پھر باؤلے ہو گئے اور اسے اقتدار سے نکال کر دم لیا۔ پھر اس کا گھیرا اس قدر تنگ کیا کہ وہ ایک بار پھر جلاوطنی پر مجبور ہوگئی [illegible]

بھٹو فساد ختم ہو چکا، اب مشرف اور اینٹی مشرف الیکشن ہوگا۔ نواز شریف نے کوشش بھی کی کہ اپنے ماضی کے داغوں کو دھو ڈالے۔ اس نے 8 جنوری کا دن مشرف کے خلاف ریفرنڈم قرار دیدیا، لیکن دائیں بازو کے اسلامی (یا غیر اسلامی) کن ٹٹوں کو معلوم تھا کہ فساد کا اصل مزہ تو بھٹو اور اینٹی بھٹو نعرے بازی میں ہے۔ میں نے اس سازش کی بو اعجاز الحق کی ایک محفل میں سونگھی تھی اور پھر چار قسطوں میں اس سازش کو بے نقاب کیا تھا، ان کالموں کی وجہ

سے بیگم نے مجھے اپنے جسم سے کاٹ کر پرے پھینک دیا، اب میں تنہا تھا اور تنہا ہوں

ے قاتلوں کو جانتا ہوں اور قاتل بھی اپنا چہرہ چھپانے کی کوئی ضرورت
کیسے سفاک قاتل ہیں۔ حسینؓ کا سر ایک طشتری میں سجا کر یزید کے
ے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔

بلا کا منظر ہے شام غریباں کا سماں ہے۔ چاروں طرف ہو کا عالم طاری
ک سناٹا ہے۔ میں قلم کاغذ لے کر بیٹھا ہوں۔ آنسوؤں کی جھڑی لگی
ں رو رہا تھا جب بھٹو کی پھانسی کی خبر سنی تھی۔ اس صبح کے اندھیرے میں،
ں کے سامنے سے اپنی گاڑی میں لاہور کی طرف روانہ ہوا تھا جیل کے
معمولی نقل و حرکت تو نہیں تھی لیکن لاہور پہنچا تو پتہ چلا کہ بھٹو کو پھانسی
نے قوم کو اس وقت بھی بلکتے دیکھا تھا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو قتل کر دیا تھا تو
ر چھلک اٹھا، میں اس نوجوان کے بہت قریب تھا، وہ ایک بن کھلے
گیا۔ محترمہ نے جلاوطنی سے واپسی سے پہلے القاعدہ کے خلاف بیانات
ا۔ وہ سر کے بل ٹکرانے کے موڈ میں تھیں۔ کراچی میں ان کا شاندار
نصف شب کے سمے ایک دھماکے نے ڈیڑھ سو انسانوں کو نگل لیا،
یہ ان کو نشانہ بنانے کی ایک کوشش تھی۔ انہوں نے بار بار ان خطرات کا
ان میں ڈٹی رہیں اور گزشتہ شام دستِ قاتل کے سامنے جس طرح تن
ں پر تقدیر بھی عش عش کر اٹھی۔ محترمہ ایک بلٹ پروف گاڑی میں سوار

سے دائیں بازو نے
لیکن میں ''محترمہ''
محسوس نہیں کر رہے۔
دربار میں اسی طنطنے
آج ایک اور کر
ہے۔ ایک وحشت نا
ہے، میں اس دن بھی
میں سنٹرل جیل پنڈی
باہر کوئی زیادہ اور غیر
دے دی گئی، میں
میرے صبر کا دامن چھ
پھول کی طرح مرجھا گ
دیئے تو میرا ماتھا ٹھن
استقبال ہوا، لیکن عین
محترمہ جانتی تھیں کہ
ذکر بھی کیا، مگر وہ مید
کر کھڑی ہوئیں، اس

تھیں ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ بھی کر دی تھی لیکن باہر محترمہ کے جیالے رقص رومی میں مصروف تھے۔ انہیں دیکھ کر محترمہ سے نہ رہا گیا، انہوں نے گاڑی کی چھت کھلوائی۔ جیالوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلائے۔ ساتھ ہی ان کی سانس کی ڈور کیا رُکی کہ نبض کائنات ہی رک گئی۔ ٹی وی چینل کے مبصرین کہہ رہے تھے کہ محترمہ گولی لگنے سے بے ہوش تو نہیں، لیکن ان کی سانس بند ہے۔ دوبئی سے آصف علی زرداری نے کہا کہ محترمہ کیلئے دعا کریں۔ آؤ دعا کریں کہ یہ وقت دعا ہے۔ مگر یہ دعاؤں کی قبولیت کا وقت شاید نہیں ہے۔

میں محترمہ کو صرف چار مرتبہ ملا ہوں۔ میری ان کی کوئی جان پہچان نہیں۔ وزیر اعظم ہاؤس میں ایک اخباری پینل کے ساتھ ان کا انٹرویو کرتے ہوئے انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، حاجی نواز کھوکھر کے گھر پر ایک محدود ضیافت میں بھی ان سے ملاقات ہوئی، گلزار خاں کے بنگلے میں انہیں محو گفتگو دیکھا، گیارھویں غیر جانبدار کانفرنس میں شرکت کیلئے وہ کارتا ہینا گئیں، تو جہاز میں ان سے ملاقات ہوئی۔ فرحت اللہ بابر ان کے میڈیا مشیر تھے اور میرے پرانے جاننے والے۔ ان دنوں محترمہ کے خلاف فرانس کے محلات اور سوئس اکاؤنٹوں کا شور مچا ہوا تھا۔ محترمہ اس پر سخت جز بز دکھائی دیتی تھیں اور میڈیا سے شاکی تھیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں ایک ایسے اخبار سے تعلق رکھتا ہوں، جو عام آدمی کے نزدیک آپ کا مخالف ہے، لیکن اس اخبار نے آپ پر یہ الزامات نہیں لگائے، یہ اتفاق کی بات ہے کہ یہ الزامات بائیں بازو کے میڈیا میں اچھالے جا رہے تھے۔ میں نے محترمہ سے کہا تھا کہ میڈیا کو اجتماعی طور پر لتاڑنے کے بجائے جرات سے کام لیں اور اسی اخبار کے ایڈیٹر کو ہی مطعون کریں جو ان پر کیچڑ اچھال رہا ہے۔ محترمہ کو یہ نکتہ یا مشورہ پسند آ گیا۔ یہ الگ قصہ ہے کہ متعلقہ میڈیا مالکان اس کے بعد سے مجھ سے شاکی رہے ہیں کہ میں نے محترمہ کو ان کے خلاف بھڑکایا۔

محترمہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ان کا معاملہ ان کے خدا کے سپرد ہو چکا ہے اب خدا جانے اور وہ جانیں اور خدا غفور الرحیم ہے۔ ہمیں ان کی نہیں، اپنی فکر کرنی چاہیے اور اپنے

نامہ اعمال کو کھنگالنا چاہیے۔ یہ سوال بہت پوچھا جائے گا کہ محترمہ کا قاتل کون ہے۔ ہوسکتا ہے اس سوال کا جواب کبھی نہ ملے لیکن اگر خدانخواستہ ہمارے پٹرول پمپ مستقل بند رہے، ہماری گلیوں اور ہماری سڑکوں پر اندھیروں کا اسی طرح راج رہا، الیکشن کے ذریعے اسلام آباد کے تخت پر غیر جمہوری قبضہ ہوگیا اور اس کا کوئی ایسا نتیجہ نکلا کہ ہمیں 16 دسمبر 1971ء جیسا ایک اور صدمہ سہنا پڑے تو پھر محترمہ کے قاتل کا سفاک اور خونیں چہرہ خود بخود بے نقاب ہو جائے گا۔ میں اس سے زیادہ کھلے لفظوں میں قاتل کی طرف اشارہ نہیں کرسکتا اور اگر آپ بھی اس پہیلی کو بوجھنے میں کامیاب ہوگئے ہیں تو آیئے ہم سب مل کر عہد کریں کہ محترمہ کے قاتل کے ذلیل اور رذیل منصوبوں کے سامنے دیوار بن جائیں، محترمہ کے قاتل کیلئے یہی سزا کافی ہے کہ ہم اس کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیں۔ ہم اس قاتل کیخلاف متحد ہو جائیں تو یقین جانیں کہ محترمہ کبھی نہیں مریں گی۔ وہ منوں مٹی کے نیچے جانے کے باوجود ہمارے درمیان موجود ہیں ہمارے دل کی دھڑکنوں میں ہماری تارنفس میں، ہماری آنکھوں کے سپنوں میں زندہ ہیں، محترمہ کو میں مرحومہ کیسے کہوں!

اسد مصطفیٰ

کالم ڈاٹ کام

نوحہ

یہ کالم نہیں دکھ اور غم کا وہ اظہار ہے، جب جذبات الفاظ پر حاوی ہو جاتے ہیں اور بے ربطی اسلوب تحریر ٹھہرتی ہے۔ غم کا یہ نوحہ، آنکھوں سے لہو کے آنسوؤں کی طرح ٹپک رہا ہے۔ میرے چاروں اور دکھ اور درد کی کیفیت ہے۔ مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا جوان ہر طرف ہچکیاں بندھی ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی جدائی میں ایسا لگتا ہے سارا پاکستان رو رہا ہے۔ در و دیوار رو رہے ہیں۔ گلیاں محلے رو رہے ہیں۔ شہر ویران رو رہے ہیں۔ گاؤں رو رہے ہیں اور کھیت کھلیان رو رہے ہیں۔ سندھی پنجابی بلوچی کشمیری اور پٹھان رو رہے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ زمین و آسمان رو رہے ہیں۔ اداسی تو اس ملک کے نصیب میں بہت دنوں سے لکھی ہے۔ مگر یہ کیسی اداسی ہے جس نے آس اور امید کے جلتے دیئے بجھا دیئے ہیں۔ جس نے پیاسی زمین پر جھومتی ہوئی کالی گھٹاؤں کو بے نام ونشان جزیروں پر بھیج دیا ہے اور جس نے دسمبر کی یخ بستگی کے آگے بند باندھے ہوئے سورج کی تمازت پر برف کا طوفان انڈیل دیا ہے۔ ہماری بے نظیر کے ہمراہ تو روشنیوں کا سیلاب تھا۔ محبت اپنائیت اور خلوص کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ آخر کس نے میرے پاکستان کے سنبھلتے ہوئے جہاز کے پیندے میں پھر ایک شگاف کر دیا ہے۔ کیوں ہمارے در و بام کو روشن کیے ہوئے چراغوں اور قندیلوں پر آندھیوں کی قیامت نازل کر دی گئی ہے اور آخر کیوں ہمارے زندہ رہنے کی خواہش پر موت مسکرانے لگی ہے۔ ایسا لگتا ہے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ کاش یہ خواب ہی ہوتا مگر یہ تو ایک تلخ حقیقت ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جو بے نظیر بھٹو اس ملک کی محبت میں اپنا باپ اور دو سگے بھائی گنوا بیٹھی تھی۔ وہ بھی اس قربانی میں ان کے ساتھ شریک ہو گئی ہے۔ آسمان گواہ رہنا کہ وہ تو اس ملک کی سلامتی اور ترقی کے سوا کچھ نہیں چاہتی تھی۔ آسمان گواہ رہنا کہ اس نے تم سے کبھی اپنی زندگی کی بھیک نہیں مانگی تھی۔ وہ تو یہ جلتا ہوا

ملک بچانے آئی تھی۔ اس کی آمد سے صبح کی کرنیں امید کے روشن دان سے جھانکنے لگی تھیں۔ صدر پرویز مشرف سے معاملات طے پا جانے کے بعد تو ایسا لگتا تھا کہ شاید قدرت ہم پر مہربان ہوگئی ہے اور اب امن وامان اور ترقی وخوشحالی کا وہ سورج طلوع ہوگا جس کی کرنوں میں یہ ملک ہمیشہ جگمگ کرتا رہے گا مگر وائے رے ناکامی! ہائے رے افسوس! آپ بھی دکھ کی اس گھڑی میں میرے ہمنوا ہو جایئے۔

نوحہ لکھنا پڑا کہ ہوئی مات ہے
یہ خزاں دیدہ موسم کی برسات ہے
زرد جاڑے میں پھیکی سی ہے چاندی
اور اداسی بھری آج کی رات ہے
اس نے جاں دے کے جو کچھ دیا ہے ہمیں
ایک انمول سی کوئی سوغات ہے
روشنی اس کے دم سے مقدر میں تھی
اور اب میرے چاروں طرف رات ہے

اسلم کھوکھر

ضرب قلم

جمہوریت کی شام غریباں

کیا جمہوریت کی بحالی کا یہی تیسرا مرحلہ تھا؟ کہ جمہوریت کی خاطر بھٹو خاندان جسے داستان عبرت بنا کر رکھ دیا گیا تھا اس خاندان کی آمریت کے خلاف جلائی گئی مشعل جو کہ اس خاندان نے اپنے لہو سے روشن کی تھی وہ آخری مشعل بھی بجھا دی گئی۔ یہ ملک اور اس کی بقا جمہوریت میں ہی ہے۔ لیکن جمہوریت کا چراغ گل کرنے والے کو کیا معلوم کہ یہ داستان نہ تو رکے گی اور نہ ہی قربانیوں کا سلسلہ رکے گا۔ جمعرات کے روز جب محترمہ بے نظیر بھٹو کو شہید کیا گیا تو پاکستان ہی نہیں دنیا بھر میں پاکستان اور پاکستان کے اندر جمہوریت اور امن وامان کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ جب محترمہ کا قتل ہوا تو ذوالفقار علی بھٹو شہید کی روح پر کیا گزری ہوگی کہ پہلے انہیں محض اس جرم کی سزا دی گئی کہ اس نے وطن عزیز کو پہلا آئین دیا اور ایٹم بم کی بنیاد رکھنے کے جرم کی پاداش میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اس خاندان کی قربانیوں کا سلسلہ کیا محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد رک جائے گا؟ اس قومی سانحے کے بعد دنیا بھر میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے۔ جو کہ قاتلوں کی آغوش میں بیٹھے ہوئے تھے اور اس سانحے کے بعد ان کے دلوں سے بھی آہ اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ محترمہ جب سے پاکستان آئی ہیں ان کا استقبال دھماکوں سے ہوا ہے۔ حکمرانوں کی تمام سیکورٹی اور تمام انتظامات کہاں تھے؟ کیا حکمران اس سانحے کی ذمہ داری سے دست کش ہو سکتے ہیں۔ اسی روز جب محترمہ کی زندگی کا چراغ گل کر دیا گیا اس روز محترم نواز شریف پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا۔ یہ حملے اور یہ انداز کس بات کے اشارے ہیں؟ اس ملک کی سرزمین پر تمہارے قدم ابھی نہیں پڑنے چاہئیں تھے۔ آج کبھی القاعدہ کا نام سامنے آتا ہے اور کبھی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ قتل بھی انہی لوگوں کی باقیات نے کیا ہے جنہوں نے بھٹو کو قتل کیا تھا اس سانحے پر جس قدر بھی دکھ افسوس اور مذمت کی جائے کم ہے۔ کہنے والے

کہتے ہیں کہ جس ملک میں پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان، قائداعظم محمد علی جناح غیر محسوس انداز میں قتل اور پھر ایک نہیں سینکڑوں سانحات کا علم نہیں ہوسکا۔ کیا اس طرح محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کو بھی قصہ پارینہ بنا کر رکھ دیا جائے گا۔ جب سے برائے نام الیکٹرانک میڈیا نے پیمرا کے کالے قوانین کی پابندی کرتے ہوئے مناظر دکھائے ہیں اس وقت سے لیکر اب تک جو المناک روح فرسا مناظر دکھائے ہیں یہ دراصل محترمہ بے نظیر بھٹو کا جسد خاکی نہیں تھا۔ جمہوریت کا جنازہ تھا حالانکہ جمہوریت کی بحالی کے لئے انہوں نے آمروں سے ہاتھ بھی ملانے سے گریز نہیں کیا اس سرزمین کو کتنے شہیدوں کا اور خون چاہیے کیا ملک قاتلوں، دہشت گردوں کے لئے بنا تھا کہ وہ دندناتے پھریں اور کوئی ان کو لگام دینے والا نہ ہو۔ وہ جسے چاہیں جب جہاں چاہیں اور جیسے چاہیں اپنی مذموم خواہشات کی صلیب پر لٹکاتے رہیں اور عوام کی لاشیں اٹھاتے رہیں۔ موجودہ انتخابات میں کس قدر خوبصورت ماحول بنا ہوا تھا کہ ملک کی دونوں بڑی سیاسی اور جمہوری پارٹیاں جو کہ باری باری آمریت کی ڈسی ہوئی تھیں۔ آخر کار دونوں پارٹیوں نے سیاسی تشنج کی کیفیت سے باہر آکر ملکر جمہوریت کے لئے جدوجہد کی اور جب ''میثاق جمہوریت'' کا معاہدہ ہوا تو بڑی حد تک آمریت کمزور ہوگئی تھی اور موجودہ انتخابات تک کے معاہدے کا سفر اور معاہدہ تارتار ہوا لیکن یہ بات خوش آئند تھی کہ دونوں پارٹیوں کے کارکن، عہدیدار ایک دوسرے کے خلاف زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی نشتر زنی کی بجائے ایک دوسرے کے لئے فراخدلی کے جذبات رکھتے تھے اور ملکر ملک کو بچانے اور جمہوریت کی بحالی کرنے کے لیے پرعزم تھے۔ صرف سیاسی یتیموں کو دھچکا لگا تھا اور ان قوتوں کے لئے منظر ناقابل قبول تھا جو کہ اقتدار پر اپنی گرفت تاحیات برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ انتخابات میں دھاندلی اور امن وامان کا بھی بھانڈا پھوڑا گیا اور محترمہ نے ایک نہیں سو بار اپنی جان کو خطرے سے آگاہ کیا تھا لیکن 18 اکتوبر کے فقید المثال استقبال میں بم دھماکے کے باوجود انکو جو جیمرز فراہم کیے گئے تھے وہ آمروں کی طرح ناقابل اعتبار اور ناقابل بھروسہ تھے۔ جس سے انہوں نے آگاہ بھی کیا۔

نہ جانے اس سانحے کی تحقیقات کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو پہلے سانحات کا ہوتا رہا ہے۔لیکن ایک بات طے ہے ان تمام سیاسی یتیموں کو شامل تفتیش کیا جائے جو لیاقت باغ کے جلسے میں بم دھماکے کی اطلاع دے رہے تھے حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہر دور کے وزراء یہ اطلاع ضرور دیتے ہیں کہ فلاں کے جلسے میں نہ جائیں کیونکہ وہاں پر خودکش بم دھماکوں کا خطرہ ہے اور یہ کہ اتنے خودکش حملہ آور فلاں علاقے میں داخل ہو گئے ہیں لیکن یہ وزراء امن وامان کے ذمہ دار اور بری خبریں دینے والے آمروں کے مخبران خودکش حملہ آوروں کو گرفتار کرنے سے قاصر رہتے ہیں ایسے موقعے پر ایک ناگ کی طرف سے صوبائی تعصبات کی آگ کو ہوا دینے کی کوشش بھی قابل مذمت ہے۔ خدارا ایسے موقعے پر ملک کو بچایئے اس ملک کو اللہ تعالیٰ سے حفظ وامان میں رکھنے کی دعائیں کرنی چاہئیں کہ حالات کس نہج کی طرف جارہے ہیں اور سندھ کے ہی نہیں ملک بھر کے عوام اس قدر جذباتی ہیں کہ سندھ کے غریب مزدور کسانوں اور ہاریوں نے اعلان کیا ہے کہ آج کے بعد جس کے گھر میں بھی بیٹی پیدا ہو وہ اس کا نام بےنظیر رکھیں گے۔سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں اگر عوام کے زخموں پر مرہم نہ رکھا گیا تو پھر کیا ہوگا؟ کیونکہ محترمہ کو چاروں صوبوں کی زنجیر بھی کہا جاتا ہے اور وہ واقعی چاروں صوبوں کی وفاقیت کنفیڈریشن کو ہر حال میں برقرار رکھنا چاہتی تھیں لیکن انہیں اس قسم کی موت دے کر کیا ان کے نام کی مالا چھیننے والے پرامن رہ سکتے ہیں اور ان حالات کی آڑ میں پاکستان کی دشمن قوتیں کیا اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل نہیں کریں گی۔اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ذی شعور اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے ملک کی بہتری کے لئے سوچیں اور قاتلوں کے عبرت ناک انجام کیلئے دعا کریں۔شام چھ بج کر پانچ منٹ پر جب یہ خبر سنی تو سچ پوچھیں یہ شام کا منظر جب تاریکی پوری طرح زمین پر آمریت نما تسلط جمالیتی ہے۔ایک لمحے کو جمہوریت پر مسلط کی گئی شام غریباں سے بہتر کوئی اور تشبیہ ذہن میں نہیں آتی۔شام غریباں مسلط کرنے والوں کا انجام بھی یزید سے مختلف نہیں ہوگا۔

اطہر مسعود

دیدۂ بینا

انا للہ وانا الیہ راجعون

کاپی پریس جارہی تھی کہ راولپنڈی کے لیاقت باغ میں بے نظیر بھٹو کو خودکش حملے میں قتل کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بے نظیر بھٹو افغانستان کے صدر حامد کرزئی سے ملاقات میں امن کی یقین دہانی کرائیں تو انہیں کیسے زندہ چھوڑا جاسکتا تھا۔ وزارت داخلہ کے ترجمان یہ کہتے رہے کہ وہ محفوظ ہیں لیکن غیر سرکاری ذرائع اس امر پر مصر تھے کہ بے نظیر بھٹو سیاست کی نذر ہو کر اپنے باپ اور بھائیوں کے پیچھے چلی گئی ہیں۔ بے نظیر بھٹو کی ماں، خاوند اور بچے جس کرب سے گزریں گے وہ ناقابل بیان ہے مگر اس کے اثرات پاکستانی سیاست پر انمٹ نقوش چھوڑیں گے۔ ہمارا نہیں خیال کہ انتخابات اب مقررہ تاریخ پر ہوسکیں گے تاہم جو لوگ ان انتخابات کے مخالف اور بے نظیر ونواز شریف کے جلسوں سے خوفزدہ تھے شاید ان کی سنی گئی اللہ تعالیٰ ہمارے ملک اور مسلمانوں کو کسی بڑی تباہی سے محفوظ رکھے۔ آمین! عید کے موقع پر اہل خاندان اپنے والدین کا ذکر کر رہے تھے ہم سب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ ہمارا اپنے والدین سے کوئی موازنہ نہیں ...... ہماری بی بی (ماں) کے پاس اگر ایک روپیہ ہوتا تھا تو وہ اس میں سے آٹھ آنے مستحق لوگوں کو دے دیتی تھیں، ہمارے پاس ایک ہزار ہوتے ہیں اور ہم ایک سو روپے دیتے ہیں یعنی وہ اپنی آمدنی کا نصف غریبوں پر خرچ کرتیں اور افسوس کرتیں کہ انہوں نے بہت کم خرچ کیا ہے ہم اپنی آمدنی کا دسواں حصہ خرچ کر کے فخر کرتے ہیں کہ بڑا خرچ کر لیا اور چاہتے یہ ہیں کہ لوگ ہماری دریادلی کا تذکرہ کریں۔ کیا نواز شریف اور بینظیر بھٹو کے ادوار حکومت میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں جو پرویز مشرف کے دور میں بند ہوگئیں؟؟ پھر بھی کیا وجہ ہے کہ لوگ ان دونوں لیڈروں کیلئے ہر جگہ دیدہ ودل فرش راہ کرتے ہیں آنکھیں بچھاتے ہیں ان کا والہانہ استقبال کرتے ہیں؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ لوگوں کو اس بات کا یقین ہے کہ اگر نواز

بینظیر ادوار حکومت میں ان کو قومی وسائل میں سے چار آنے ملتے تھے تو اب 10 پیسے ملتے ہیں۔ ان دونوں حکومتوں میں اگر قومی دولت ایک کروڑ تھی تو قوم پر 25 لاکھ خرچ ہو جاتے تھے۔ اب اگر 10 کروڑ ہے تو ایک کروڑ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ اعداد و شمار کے حساب سے تو جنرل پرویز مشرف کے دور حکومت میں خرچ ہونے والی رقم کا نواز شریف اور بینظیر کے دور حکومت میں خرچ ہونے والی رقوم سے کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن لوگوں کو یہ بات نہیں بھولتی کہ تب انکے حکمرانوں کی جیب میں اگر سو روپیہ ہوتا تھا تو وہ پچیس قوم پر خرچ کرتے تھے جبکہ موجودہ حکمرانوں کی جیب میں اگر ایک ہزار تھا تو انہوں نے لوگوں پر ایک سو روپیہ خرچ کیا...... تب اگر 75 روپے غیر ترقیاتی کاموں یا سرکاری اللوں تللوں پر خرچ ہوتے تھے تو اب کے 9 سو روپے انہی کاموں پر استعمال ہوتے رہے تو سو یہی بات لوگوں کو نہیں بھولتی اور یہی بات جنرل پرویز مشرف کے حامیوں کی مخالفت میں جا رہی ہے۔ حساب رقم کا نہیں نیت کا ہے۔ ہماری ماں کے ہاتھوں خرچ ہونے والے آٹھ آنے ہمارے ہاتھوں خرچ ہونے والے ایک سو روپے سے یقیناً بدرجہا زیادہ ہیں اور اللہ کے ہاں ان کی مقبولیت بھی زیادہ ہے۔ نواز شریف اور بینظیر کے متعلق بھی لوگ یہی سوچتے ہیں کہ ان کے دور میں آمدنی کم تھی لیکن وہ اپنی آمدنی کا ایک چوتھائی عوام پر خرچ کر رہے تھے لیکن ان کے بعد آنیوالوں نے ساری دنیا سے دولت اکٹھی کی بے پناہ وسائل ان لوگوں کے پاس موجود تھے لیکن عوام پر خرچ اس تناسب سے نہیں کیا گیا لوگوں پر اگر پیسے خرچ زیادہ ہوئے تو اس سے زیادہ کھائے پیئے گئے۔ اگر پرانے حکمرانوں کا دس پرسنٹ ایک کروڑ تھا تو اب کے پانچ پرسنٹ بھی کم از کم 5 کروڑ تھے اور یہ ساری چیزیں لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں کچھ کہانیاں زبان زد عام ہیں اور کچھ پردۂ افلاک سے نمودار ہونے والی ہیں۔ دراصل بینظیر بھٹو اور نواز شریف کو احساس تھا کہ وہ عوام کو جوابدہ ہیں، کل ان سے ووٹ لینے جانا ہے جبکہ جنرل مشرف کے حامی جی ایچ کیو کے کلے پر انحصار کیے ہوئے تھے اور عوامی جوابدہی کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہماری والدہ اگر اپنی آمدنی کا

پچاس فیصد مستحقین پر خرچ کرتی تھیں تو ان کے ذہن میں اللہ کی جوابدہی کا احساس تھا تو جو حکومتیں اپنے عوام پر اپنی آمدنی کا زیادہ سے زیادہ خرچ کرتی ہیں انہیں عوامی جوابدہی کا احساس ہوتا ہے اور اب تمام فلاسفر اس بات پر متفق ہیں کہ عوامی جوابدہی کا احساس بھی دراصل اللہ کے ہاں جوابدہی کا ہی پر تو ہے کیونکہ مخلوق خدا یعنی عوام دراصل زمین پر اپنے خالق یعنی اللہ کے خلیفہ اور نمائندہ ہیں۔

سوال یہ ہے کہ نظام کو بدلا کس طرح جائے اس کے دو ہی طریقے ہیں ایک انقلاب اور دوسرا انتخاب۔ جدید دور میں انقلاب فرانس، انقلاب روس اور انقلاب ایران کی تفصیلات سب کے سامنے ہیں۔ یہ انقلابات کتنی دیر میں آئے اور ان میں کتنی عوامی قوت شامل تھی اور انقلابات کا حتمی نتیجہ کیا نکلا؟؟ دوسری طرف جن ملکوں میں جمہوریت ہے۔ انتخاب کے ذریعے تبدیلیاں آئیں، ان ممالک میں عوام کو کیا ملا؟ اگر دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن اگر طے کر لیا جائے کہ عقل استعمال ہی نہیں کرنی اور خالی زبانی جمع خرچ سے انقلاب کے دعوے کرنے ہیں تو تبدیلی کس طرح آئے؟ ہماری بائیکاٹ پارٹیوں نے کچھ علاقوں میں شناختی کارڈ جمع کرنا شروع کر دیئے ہیں تا کہ لوگوں کو ووٹنگ میں حصہ لینے سے روکا جاسکے۔ ان کی اس کارروائی کے اخلاقی اور قانونی جواز سے قطع نظر اگر یہ پارٹیاں 8 فروری تک 10 لاکھ شناختی کارڈ بھی اکٹھے کر سکیں تو ہم انہیں بڑی حد تک کامیاب گردانیں گے۔ لیکن ہمارے اندازے کے مطابق وہ شاید ہی چند ہزار کارڈ اکٹھے کر پائیں گے...... 16 کروڑ آبادی کے ملک میں قریباً 7 کروڑ رجسٹرڈ ووٹر ہیں اگر 7 کروڑ رجسٹرڈ ووٹروں کے ایک لاکھ کارڈ بھی اکٹھے ہو جائیں تو ان کا تناسب کوئی 0.14٪ بنتا ہے یعنی دس ہزار میں سے 14 ووٹ اور اگر 16 کروڑ لوگوں میں سے دو لاکھ کارڈ اکٹھے کر لئے جائیں تو ان کا تناسب اس سے بھی کم ہو جائے گا۔ تو کیا 10 ہزار میں سے 10 لوگوں کو ساری قوم کا نمائندہ سمجھ لیا جائے۔؟؟ عوامی رائے کا مظہر مانا جائے۔؟؟

اس دلیل کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ موجودہ طریق انتخاب پر اعتماد کیسے کیا جائے؟ کہ

تین لاکھ کے حلقہ انتخاب میں ایک امیدوار 65 ہزار دوسرا 79 ہزار، تیسرا 75 چوتھا 81 ہزار دولٹ لیتا ہے تو 81 ہزار ووٹ لینے والا جیتے گا یعنی 2 لاکھ 19 ہزار ووٹوں کی مخالفت کے باوجود اپنے حلقے کا نمائندہ کہلائے گا......؟؟ یہ جواب سر ماتھے پر لیکن 3 لاکھ لوگوں میں سے کتنے لوگ ایسے ہوں گے کہ 81 ہزار لوگ ان کے نام اور کام پر متفق ہوں اور جو لوگ اس نظام کے مخالف ہیں ان کو اپنے حلقے میں کتنے لوگوں کی حمایت حاصل ہے؟؟ یوں بھی اگر جمہوریت چلتی رہے تو آخر کار دو جماعتی نظام قائم ہو جاتا ہے جس طرح امریکہ، برطانیہ، بھارت، فرانس وغیرہ میں دو دو بڑی جماعتیں ہیں ہم بھی اس منزل کے قریب تھے اور اگر طالع آزما جرنیل بار بار مداخلت نہ کرتے تو اب تک شاید ہمارے ہاں بھی دو جماعتی نظام قائم ہو چکا ہوتا اور ووٹ ضائع نہ ہوتے اور آئندہ بھی اگر یہ نظام دو تین انتخابات تک بغیر کسی مداخلت کے چلتا رہے تو یقیناً ہم ایک اصلی جمہوریت کی منزل پر پہنچ جائیں گے۔

رہی یہ بات کہ اکثریت گمراہ بھی ہو سکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والے ہیں جن کا قول صادق ہے کہ میری قوم کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی اور اس کی اکثریت کبھی گمراہ نہیں ہوگی پھر لوگ اپنی دلیل کے حق میں امام حسینؓ اور یزید کی مثال دیتے ہیں کہ امام عالی مقامؓ کے ساتھ صرف 72 تن تھے جبکہ یزید کے ساتھی ہزاروں کی تعداد میں تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یزید کسی انتخاب کے ذریعے حکمران نہیں بنا تھا، اگر وہ واقعتاً اکثریت کی رائے کا ترجمان ہوتا تو اس کی حکومت کا انجام وہ نہ ہوتا جو ہوا، پھر اس مثال اور موجودہ دور میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ امام حسین ختمی مرتبت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے تھے اور آج کے دور کے بائیکاٹیوں میں سے کوئی ان کے حقیقی پیروکار ہونے کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کی امامت پر ان کے نانا کی مہر تھی جبکہ ہمارے آج کے امام خود بھی بے امام ہیں...... جن پر بوجوہ اعتبار کیا جا سکتا تھا وہ بھی اپنے اسلاف کی میراث کو ترک کر چکے ہیں، سو عوامی حکمرانی کا ایک ہی طریقہ باقی بچتا ہے اور وہ ہے عوامی ووٹ کے ذریعے برسر اقتدار آنا اور معاملات کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا اس

کے علاوہ جو بھی طریق اپنایا جائے گا وہ قانونی اور اخلاقی طور تو کمزور ہوگا ہی شرعی طور پر بھی اس کی حیثیت کافی کمزور ہوگی۔ بات سیدھی کرنی چاہیے اور سچی بھی کہ کتم ان شہادۃ اللہ کے نزدیک ظلم سے بڑھ کر ہے۔ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَهَا دَةً عِندَهُ مِنَ اللهِ......

بہر حال یہ بحث کافی طویل ہے اور ایک کالم کی تنگنائے میں اس کا احاطہ کرنا اتنا آسان نہیں لیکن پھر بھی ایک بات جو طے ہے وہ یہ کہ ہر دور کا اپنا اپنا یزید ہوتا ہے تو اپنا اپنا امام حسین رضی اللہ عنہ، ہر یزید کا طریقہ واردات بھی اپنا اپنا ہوتا ہے تو جواباً ہر امام حسین رضی اللہ عنہ کا طریق کار بھی جدا جدا ہوتا ہے۔ مصطفویت ہمیشہ بولہبیت سے ستیزہ کار رہتی ہے اور رہی ہے۔ آخر کار کامیابی مصطفویت کی ہوتی ہے۔ یا حسینیت کی۔ قرآن مجید نے یہ طے کر دیا ہے کہ حق آتے ہی باطل مٹ جاتا ہے۔ کائنات میں یہ کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ کہ فرعون موسیٰ علیہ السلام کو شکست دے یا امام حسین رضی اللہ عنہ کا نام مٹ جائے اور یزید کا زندہ رہے۔ لیکن ضرورت ہمیشہ اس بات کی ہوتی ہے کہ جب بھی حق و باطل کا مقابلہ ہو تو علم کو بروئے کار لایا جائے اور عقل استعمال کی جائے۔ مقابلے کے نام پر مقابلے سے فرار کسی شخص کی سادہ دلی تو ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا فائدہ آخر کار حق کو نہیں باطل کو ہی پہنچتا ہے۔ کیونکہ آپ کے چند سو چند ہزار یا چند لاکھ ووٹ وہ تبدیلی لا سکتے ہیں جو بائیکاٹ کرنے کی صورت میں مخالف باطلانہ قوتوں کو فائدہ دیں گے۔ اب لوگ کیا کریں؟؟ دین اور عقل کا نام لے کر باطل اور جہالت کو فروغ دینے والوں کا ساتھ دیں یا عام سادہ لوح دنیا داروں کا انتخاب کریں جو اگرچہ بڑے دعوے اور وعدے نہیں کرتے لیکن انکی جدوجہد یقیناً انقلاب کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ ایک عظیم اسلامی انقلاب کی۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

آسناتھ کنول

خواب اور انقلاب

وہ ایک ماں بھی تھی!

عیداور کرسمس کی چھٹیاں منا کر 27 دسمبر کی شام نارووال سے واپسی ہوئی، ٹرین کے سفر میں موجودہ سیاسی صورتحال پر اظہار خیال ہوتا رہا، بے نظیر بھٹو کی دلیری کی بات بھی ہوئی کہ اتنے مشکل حالات کے باوجود جلسوں میں جاتی ہیں۔ میں نے کہا، خدا انہیں سلامت رکھے۔ کسی بھی بات سے بے خبر ہم تقریباً آٹھ بجے لاہور پہنچے اسٹیشن سے باہر آئے تو ایک صاحب لوگوں کو آگے جانے سے روک رہے تھے ہم اس کے قریب پہنچے تو اس نے ہمیں بھی روکا، اور کہا آپ واپس سٹیشن پر چلے جائیں ابھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ٹریفک بند ہے، مظاہرے ہو رہے ہیں۔ ہم تھوڑے سے اس کے قریب ہوئے جناب ایسا کیوں ہو رہا ہے، ہوا کیا ہے، وہ جلدی جلدی بولا جناب بم دھماکہ ہوا ہے اور بے نظیر بھٹو اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ہم کچھ دیر تو سکتے کی کیفیت میں کھڑے رہے۔ ہم اس اندوہناک خبر پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔ آگے بڑھے تو لوگوں کو افراتفری کے عالم میں ادھر ادھر بھاگتے دیکھا صرف پرائیویٹ گاڑیاں اکا دکا چل رہی تھیں۔ نہ کوئی رکشہ نہ بس۔ کوئی موجود بھی تھا تو وہ بٹھانے سے انکاری ہر طرف پریشانی کا عالم، میرا خیال ہے کہ کچھ ہوا ضرور ہے میں نے اپنے شوہر سے کہا۔ وہ خود بھی سکتے میں تھے۔ خدا کرے یہ خبر جھوٹی ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جھوٹی تسلیاں دینے لگے لیکن دل دھڑک دھڑک کر یہی ورد کر رہا تھا کہ کاش! یہ سب جھوٹ ہو۔ اب کیا کریں، یہاں انتظار نہیں کر سکتے نجانے حالات کیا رخ اختیار کریں ڈھیر سارے سامان کے ساتھ دو چھوٹے بچوں کے ساتھ پیدل چلنا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا مگر ہمیں آج اس جرات اور حوصلے کا مظاہرہ کرنا تھا، لوگ عورتیں بچے سب جلدی جلدی گھروں کو پہنچ جانا چاہتے تھے۔ ہم نے بچوں کا ہاتھ پکڑا سامان اٹھایا اور پیدل ہی چل پڑے اور لاہور ریلوے اسٹیشن سے گڑھی شاہو کا فاصلہ ہم نے پیدل طے کیا، گڑھی شاہو چوک میں پہنچے ہی تھے کہ

سامنے سے ایک احتجاجی جلوس آتا دکھائی دیا، پر جوش نعرے لگاتے ہوئے اور بین کرتے لوگ چاروں طرف ماتم کی فضا سے ہم بری طرح ڈر گئے۔ ہم جلدی جلدی چلنا شروع ہوئے بلا آخر دیواروں کے ساتھ ہوتے ہوئے اپنی گلی میں داخل ہوئے تو سلامتی سے پہنچنے پر اللہ کا شکر ادا کیا، سوگ کی ایسی کیفیت تھی کہ ہم بالکل بھی کوئی بات کرنے کے قابل نہ تھے، ٹی وی لگایا تو اس خوفناک خبر نے جکڑ کے رکھ دیا، بے نظیر بھٹو، خودکش حملے میں جاں بحق ہو گئیں یہ جملہ سننا اور ہضم کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی، بے نظیر بھٹو ہم میں سے کسی کی بھی رشتے دار نہیں تھیں لیکن مجھے سمجھ نہیں آئی کہ ان کی وفات پر ہمارے دل کیوں تڑپ اٹھے، آنکھیں کیوں بھیکتی رہیں، صرف اس لئے کہ وہ ایک عظیم اور بہادر خاتون ہی نہیں، ایک ماں بھی تھیں، تین معصوم بچوں کی ماں، ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہوتا ہے۔

ایک ماں کے قتل کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ مجھے ایک سیاست دان نہیں ایک ماں یاد رہی، ماں جس کا کوئی نعم البدل نہیں، ماں جس کے بغیر گھر گھر نہیں، جس کے بغیر زندگی اور گھر دونوں سونے ہوتے ہیں وہ شاندار خاتون صرف تین بچوں کی نہیں، ہزاروں بچوں اور لوگوں کی ماں تھی اس کی سیاست جیسی بھی رہی ہو، لیکن اس کے ایک مہربان ماں ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہے۔ اپنی تمام تر سیاسی مصروفیات کے باوجود انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اپنے شوہر کی اسیری کے دنوں میں بے نظیر نے ماں اور باپ دونوں کا کردار ادا کیا اور اپنے بچوں کی دیکھ بھال کی، ماں کی ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ تمام بچوں میں برابری دیکھنا چاہتی ہے۔ ایک بچے کے پاس زیادہ اور دوسرے کے پاس کم ہو تو وہ زیادہ والے سے لے کر کم والے کو دیتی ہے۔ ماں ہمیشہ مساوات اور برابری کی قائل ہوتی ہے اسی لئے وہ اپنے گھر میں ایک توازن رکھتی ہے، ایک ماں برابری کی بنیاد پر گھر چلاتی ہے۔ ویسے ہی وہ ملک بھی چلا سکتی ہے، مگر دو دفعہ وزیر اعظم بننے والی اس ماں کو پوری طرح امور مملکت چلانے نہیں دیئے گئے، اس کے باوجود ایک ماں کا جذبہ ماند نہیں ہوا، اک شوق جنوں بنکر اس کی روح کو گرماتا رہا کہ پاکستان میں اک ماں

حکومت کرے اور مساوات اور برابری کی بنیاد پر عوام کو ان کے حقوق دلائے ، لوگ اپنے حق کو پہچانیں خود کو معتبر سمجھیں ، عام عوام کی زندگی میں رونق اور خوشحالی آئے۔

انسان زندہ ہو تو ہزاروں خواب اس کی آنکھوں میں تعبیر پانے کے لئے مچلتے ہیں بے نظیر بھٹو کی آنکھوں میں بھی پاکستان کے لئے ہزاروں خواب تھے جو تعبیر پانا چاہتے تھے۔ مگر ایک گولی نے یہ سارے خوب چھین لئے اور پھر اس روز ہنگاموں نے 23 دوسرے لوگوں کی جان بھی لے لی ، زندگی جتنی ارزاں اب ہے ، اتنی شاید کبھی نہ تھی اس قدر خودکش دھماکے لگاتار ہوتے چلے جارہے ہیں کہ کہیں سے بھی گزرتے ہوئے دل کانپتا ہے۔ کہ کوئی خودکش یہیں کہیں ہوگا لوگ سینکڑوں کے حساب سے لقمہ اجل بن رہے ہیں اور اس کی وجہ چند لوگوں کی انتہاء پسندی ہے ، انا پسندی ہے یا شاید ، دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا جنون ہے بے نظیر بھٹو جب واپس پاکستان آئیں تو انہوں نے کہا کہ کوئی مسلمان شخص عورت کو قتل نہیں کرسکتا ، آج بھی اخباروں نے یہ جملہ لکھا ، انہوں نے یہ جملہ کیوں بولا شاید وہ دہشتگردوں کو احساس دلانا چاہتی تھیں کہ عورت ماں ہوتی ہے ، اس نے بچوں کو جنم نہ بھی دیا ہو وہ تب بھی ماں ہوتی ہے اور ماں کو مارنا تو ظلم عظیم ہے اور کوئی شخص کتنا بھی انتہا پسند ہو ایک ماں کو قتل کرتے ہوئے ضرور سوچے گا ، مگر اس المناک واقعے میں وہ کون تھا جسے کسی پر بھی ترس نہیں آیا۔ وہ کس قدر شقی القلب شخص ہوگا۔ جس نے صرف پاکستان ہی نہیں ساری دنیا کو اداس اور غمگین کر کے رکھ دیا ، بلاول ، بختاور اور آصفہ سے ان کی عظیم ماں کو چھین لیا ، بلکہ پاکستان کی ایک قابل فخر بیٹی کو پاکستان کی سب سے کم عمر اور اسلامی دنیا کی پہلی وزیر اعظم ہونے کا اعزاز حاصل کرنیوالی خاتون کی جان لے کر پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ ٹی وی پر محترمہ بے نظیر کے پہلے دور حکومت میں ان کے اہم کاموں کا تذکرہ ہوا ، جس میں پولیو کے قطرے پلانے کی مہم بھی شامل تھی جس کا آغاز محترمہ بے نظیر بھٹو کے دور میں ہوا اور پولیو کا پہلا قطرہ محترمہ نے ایک بچے کو پلا کر اس کام کا آغاز کیا جو آج تک جاری ہے۔ اور لاکھوں بچوں کو پولیو جیسی بیماری سے بچا چکے ہیں یہاں بھی بطور ایک ماں کے وہ

بچوں کی فکر کرتی نظر آتی ہیں اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ وہ لاکھوں پاکستانی بچوں کی بھی فکر کرتی نظر آتیں، انہوں نے عورتوں کے لئے بھی بہت سے اقدامات کا آغاز کیا جیسے خواتین کے بینک اور خواتین پولیس سٹیشن قائم کیے تاکہ عورتوں کو جلدی اور فوری انصاف مل سکے جبکہ بینک اس لئے کہ عورتیں معاشی ترقی کریں قرضے حاصل کریں کچھ کاروبار کریں اور اپنا گھر اچھے طریقے سے چلا سکیں اپنی تمام فکر ایک ماں کا دل رکھنے والی عورت ہی کر سکتی ہے۔ اسکے علاوہ ان جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ پائے کی سیاست دان ہونا، بڑے بڑوں کو نصیب نہیں، وہ باہر کی دنیا چھوڑ کر اپنے گھر پاکستان آئیں جہاں انہیں محفوظ ہونا چاہیئے تھا اور وہ اپنے ہی گھر میں غیر محفوظ ہو گئیں، جمہوریت کی بات کرتے کرتے وہ اس جمہوریت پر شہید ہو گئیں۔ صرف تین بچے نہیں ہزاروں بچے یتیم ہو گئے، لاکھوں دل تڑپے، کروڑوں سوگوار ہوئے، وہ خاتون جس کے لئے سلامتی کونسل کا اجلاس بلایا گیا ایک سانحہ ایک واقعہ جو شاید کبھی نہ بھلایا جا سکے وہ شخصیت جس کے لئے شاعر نے کہا:

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

آفتاب اقبال

حسبِ حال

بھٹو خاندان اور مرنے کی خواہش!

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ بینظیر بھٹو کو اسٹیبلشمنٹ نے تو نہیں مروایا مگر یہ ضرور ہے کہ کل کی شوریدہ سر بینظیر کی نسبت آج کی خاموش بینظیر اسٹیبلشمنٹ کے لئے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی تھیں۔ جہاں تک ہماری یہ ناقص سی عقل کام کرتی ہے، وہاں ہمیں دور دور تک کہیں کوئی لمبی چوڑی بین الاقوامی سازش نظر نہیں آتی۔ بلکہ سچ پوچھیں تو یہ ایک پیغام ہے جو اس ملک میں پھیلے مٹھی بھر انتہا پسند جنگجوؤں نے بھیجا ہے اور اس کی مخاطب وہ اسٹیبلشمنٹ ہے جو پچھلے چند برس سے انکے خلاف مختلف طریقوں سے برسر پیکار ہے۔ آپ اگر بھٹو خاندان کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو شاید آپکو یہ جان کر حیرت ہو کہ یہ خاندان موت سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوا۔ یعنی موت کا ڈر نہ تو کبھی باپ کے اندر دیکھا گیا، نہ بیٹوں اور نہ ہی بیٹی کے اندر۔ ہمارے انتہائی پیارے دوست حیدر فاروق مورودی اپنے والد محترم مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ جب ضیاء الحق نے بھٹو صاحب پر مقدمہ قائم کروایا تو مولانا نے انتہائی رازداری کے ساتھ بھٹو تک یہ پیغام پہنچایا کہ ضیاء آپ کو پھانسی پر لٹکانے کی ٹھان چکا ہے چنانچہ حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ فی الوقت ملک بدر ہو جائیں تاہم بھٹو صاحب نے یہ مشورہ محض ہنس کر ٹال دیا۔ انہی دنوں یاسر عرفات اور معمر قذافی نے بھی بھٹو کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ فوجی حکمران کے تیور اچھے نظر نہیں آتے اس لئے آپ اجازت دیں تو ہم اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں مگر بھٹو صاحب کی دلنشین مسکراہٹ جوں کی توں قائم رہی۔ وہ صرف ایک ہی بات کہتے چلے گئے کہ میں بے قصور ہوں ضیاء آخر کس برتے پر مجھے لٹکائے گا۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا۔ اور پھر اپریل 1979ء کی ایک تاریک رات کے پچھلے پہر تارا مسیح نے ایک ہاتھ کے جھٹکے سے وفاق پاکستان کی بنیاد ہلا کر رکھ دی۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان کی حکومت سے احتجاجاً استعفیٰ دیا تو فوجی آمر نے انہیں دھمکی دی کہ

اگر تم سیاست میں آئے تو تم جانتے ہو کہ مخالفین کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتا ہوں۔ یہ جنوری 1967ء کی بات ہے۔ بھٹو نے ایوب کی دھمکی بھی ہوا میں اڑادی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ کی کتابوں میں نہایت تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ جون 1967ء والے گول باغ لاہور کے جلسے سے لے کر مارچ 1970ء والے سانگھڑ جلسے تک بھٹو پر لاتعداد قاتلانہ حملے ہوئے مگر بھٹو ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انتخابی مہم کے دوران سانگھڑ میں ہونے والے آخری قاتلانہ حملے میں مسلح حروں کی طرف سے چلائی گئی سینکڑوں گولیوں میں سے ایک بھٹو کی ٹوپی میں سوراخ کرتی نکل گئی۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہ حملہ ڈپٹی کمشنر اور ایس پی کے ایما پر ہوا اور یہ دونوں اہلکار کس کا آلہ کار بنے اس کی گواہی بھی تاریخ میں موجود ہے ملاحظہ کیجئے کہ دو گھنٹے بعد منعقد ہونے والی پریس کانفرنس میں بھٹو نے کیا کہا...... ''میں ان قاتلانہ حملوں سے مرعوب نہیں ہوں گا اور اگر میں عوام کے حقوق کی بحالی کے راستے میں ہلاک ہو گیا تو مجھ سے عقیدت اور محبت رکھنے والے عوام کا ردعمل انتہائی سنگین ہوگا اور میں یقین دلاتا ہوں کہ پھر دریائے سندھ کا پانی سرخ ہو جائے گا''۔

بی بی کا انداز بھی ہو بہو باپ والا ہی تھا۔ تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے ہم نے کم از کم یہ سراغ ضرور لگایا ہے کہ بینظیر بھٹو اپنے باپ سے کہیں زیادہ بہادر اور بے خوف تھیں۔ بھٹو صاحب کی باتوں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ انہیں معلوم ہے کہ کون انہیں ختم کرنا چاہتا ہے۔ مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ انتہائی اقدام کی جرات نہیں کرے گا کہ وہ اتنا احمق نہیں کہ دریائے سندھ کے پانی کو ہی سرخ کر ڈالے مگر بی بی والا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ بی بی کو معلوم تھا کہ انہوں نے چو مکھی دشمنیاں پال رکھی ہیں اور ہر دشمن ہر آن گھات لگائے بیٹھا ہے یعنی

میں سازشوں میں گھرا اک یتیم شہزادہ
کوئی چھپا ہوا خنجر مری تلاش میں ہے !

یہ جانتے ہوئے بھی کہ انہیں قتل کی دھمکیاں لگاتار مل رہی ہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ

سرکاری سکیورٹی انتہائی ناکافی ہے اور یہ پہچانتے ہوئے بھی کہ انکے خون کی پیاس کس کس کے لبوں کو تشنہ کئے جارہی ہے بی بی ہمیشہ جذبات کی زد میں بہہ جاتیں۔ ادھر 18 اکتوبر والا سانحہ ہوا اور ادھر آپ اگلے روز ہلاک شدگان کے گھروں میں تعزیتی دورے پر نکل کھڑی ہوئیں۔ سکیورٹی والے بھی حیران اور کارکن بھی البتہ قاتلوں کو یہ خبر ضرور ہوگئی کہ انکا پالا انتہائی آسان ٹارگٹ کے ساتھ پڑا ہے جو موت سے بچ نکلنے کی بجائے اسے سینگوں سے پکڑ کر گھمانے کے موڈ میں ہے۔ مخدوم امین فہیم کا بیان بے حد اہم ہے کہ اگر بی بی اپنی گاڑی کی چھت سے سر ہی باہر نہ نکالتیں تو پھر بھی انکی بچت کے امکانات بہت روشن تھے۔ مگر ہم اس مفروضے سے اتفاق اس لئے نہیں کرتے کہ ظالموں کا چھپا ہوا کوئی نہ کوئی خنجر بی بی کو کسی نہ کسی روز ضرور تلاش کر لیتا۔

خیر اب دیکھنا یہ ہوگا کہ صدر پرویز مشرف اور جنرل اشفاق کیانی ملک کو درپیش انتہائی خطرناک صورتحال سے باہر نکال پاتے ہیں یا نہیں۔ ہمارے خیال میں تو صدر پرویز مشرف اور چودھری پرویز الٰہی اس سانحے کے بعد دو مظلوم ترین افراد کے طور پر ابھرے ہیں۔ یعنی مشرف کو انکی فیورٹ ہنگ پارلیمنٹ ملتے ملتے رہ گئی اور پرویز الٰہی اپنی انتہائی موثر انتخابی مہم (جس کی وجوہات بہت ساری ہیں!) کے سبب نمبر گیم پر پورا عبور حاصل کر چکے تھے مگر اس سانحے نے بیشمار مشکلات کو ان کے اوپر انڈیل ڈالا ہے۔ اس وقت بیچاری اسٹیبلشمنٹ بھی زندگی میں غالباً پہلی یا شاید دوسری مرتبہ نہایت ہی بری طرح پھنسی نظر آتی ہے اتفاق سے پچھلی مرتبہ بھی اس پر یہی کیفیت دسمبر ہی کے مہینے میں طاری ہوئی تھی البتہ بات ذرا چھتیس برس پرانی ہے۔

حکومت اگر آج عام انتخابات کرواتی ہے تو پیپلز پارٹی ''پٹھیاں بھن'' دے گی۔ اس لئے یہ حماقت اسے سوٹ نہیں کرتی اور اگر توقف سے کام لیتی ہے تو امریکہ سمیت تمام مغربی ''حکام بالا'' آسمان سر پر اٹھالیں گے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ نواز شریف کو مزید ستانے کا وقت مل جائے گا جو مشرف کے لئے کچھ زیادہ اچھی خبر نہیں۔ چنانچہ اس دوران اسٹیبلشمنٹ

پی پی پی کو دو تہائی اکثریت پلیٹ میں رکھ کر دینے کی بجائے اپنا وہی پرانا گھسا پٹا ہتھیار یعنی ''مسلم لیگ کی شیرازہ بندی'' استعمال کرنے کی کوشش کرسکتی ہے۔ اس کے لئے اسے خود نواز شریف کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی خواہ یہ کسی اہم ''سٹیک ہولڈر'' کے لئے قابل قبول ہو یا نہ ہو۔ بلکہ ہماری کوتاہ نظریں تو اسٹیبلشمنٹ کو واشنگٹن سے مشورہ کرنے کے بعد دو ایک انتہائی اہم ''سٹیک ہولڈرز'' کا باقاعدہ ''گھٹ بھرتا'' دیکھ رہی ہیں۔ اس کا فوری اثر یہ ہوسکتا ہے۔ کہ عوامی نفرت کا چھایا ہوا بھیانک بادل کسی حد تک چھٹ جائے گا اور سیاسی پولرائزیشن کی فضا بار دیگر پیدا ہو جائے گی۔ جو اسٹیبلشمنٹ کو ازمنہ قدیم سے سوٹ کرتی چلی آرہی ہے مگر یہ سب کچھ اتنی آسانی کے ساتھ ہونے کا نہیں۔ اب یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ پیپلز پارٹی کے اکابرین کس حد تک نااہل ثابت ہوسکتے ہیں۔ کیا وہ قیادت کا خلا پر کرنے کی فکر کرتے ہیں یا محض ایک تازہ لاش کے بل پر اگلا ڈنگ ٹپانے کی سوچ رکھتے ہیں۔ کیا بلاول اپنی تعلیم مکمل کرنے کے چکر میں واپس چلا جائے گا یا ایک بہادر ماں کی دلفریب یادیں اس کے اندر کے قائد کو جگانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور وہ بھی ''زندہ ہے بھٹو'' کہہ کر انتخابی مہم بارے غور و فکر شروع کر دے گا۔ ہم بلاول کو تو نہیں جانتے مگر اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کو خوب جانتے ہیں یہ خون کچھ بھی ہوسکتا ہے، بزدل ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ بی بی کو جنت الفردوس میں جگہ دے کہ وہ مر کر بھی ہم میں موجود ہیں کہ شہید مرا نہیں کرتے۔ امید ہے کہ یہاں کی اسٹیبلشمنٹ اور اس کے، مدار المہام اسے آخری موقع سمجھ کر ملک کو راہ راست پر ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ اس سوچ کے ساتھ قدم بڑھائیں تو پھر خاطر جمع رکھئے کہ بی بی کی جان کا نذرانہ ضائع نہیں ہوگا۔ ہمارا کام آواز دینا تھا، سو ہم نے دے ڈالی اب جو کرنا ہے وہ انہی لوگوں نے کرنا ہے جو فیصلہ کرنے کی جگہ بیٹھے ہیں۔ اف خدایا، منیر نیازی کی برسی بھی انہی دنوں آنی تھی کہتا ہے۔

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

امتیاز عالم

ایک عہد کا خاتمہ

اس کا وعدہ تھا وہ جانتی تھی اور وہ کر گزری۔ محترمہ بے نظیر بھٹو، مشرق کی عظیم بیٹی اپنی زندگی کو درپیش کسی خطرے سے خوفزدہ نہ تھی، کیونکہ یہ دہشت گردی اور فوج و ملا دونوں کی آمریت کے خلاف اس کی آخری جنگ تھی۔ سویلین تاریخ میں شاید ایسا کوئی لیڈر نہیں گزرا جسے صحیح صحیح علم ہو کہ اس کی موت اس کی جدوجہد کے دوران ہی واقع ہوگی اور اس نے ہونی کے سامنے سینہ سپر ہو کر شہادت کو گلے سے لگا لیا اور جواب بھٹو خاندان یعنی خاندان شہداء کی دلیرانہ روایت بن گئی ہے۔ یہ قوم اپنے کسی بھی لیڈر کی موت پر اس طرح کبھی سوگوار نہیں ہوئی جس کا مظاہرہ گزشتہ چند روز کے دوران ملک کے طول و عرض میں دیکھنے کو ملا۔ بے نظیر کا سانحہ ایک بے مثال سانحہ ہے وہ آئی اور چھا گئی اور پھر وہ امر ہو گئی۔ بے نظیر کی موت اس داستان کا انجام نہیں بلکہ آغاز ہے اور بلاول اس کی نئی مجسم علامت ہے۔ میں انہیں بار بار بڑی تاکید سے کہتا تھا کہ "محترمہ سڑک سے سفر نہ کریں، جلوس سے گریز کریں اور کمیونیکیشن کے لئے الیکٹرانک ذرائع استعمال کریں۔ بے نظیر بھٹو اپنے اسی منفرد انداز میں جواب دیتیں، ظاہر ہے خطرات بہت زیادہ ہیں لیکن میں عوام سے دور نہیں رہ سکتی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی ماورائی قوتیں آئیں اور ان کی روح کو اپنے ساتھ لے گئیں، شہادت جس کا مقدر تھی۔ بلاشبہ انہوں نے اس چیز کو اپنے اوپر بھوت کی طرح سوار نہیں کیا تھا۔ وہ اس آخری جنگ کے لئے عوام کو حرکت میں لائے بغیر ان کی کمانڈر نہیں بن سکتی تھیں جو وہ عوام کی نجات اور ایک لبرل جمہوری و ترقی پسند پاکستان کی خاطر لڑ رہی تھیں۔

ایک ذہین سیاست دان اور بے مثال مدبر کی حیثیت سے انہوں نے جلاوطنی کے صحرا سے نکل کر وطن واپسی کی راہ اپنائی اور یہاں آ کر ایک طرف سیاسی میدان میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی اور دوسری طرف اس آمر اور تن تنہا پرویز مشرف کے حقیقی لبرل جمہوری متبادل کے طور پر خود کو پیش کر دیا جو دہشت گردی کے خلاف جنگ سمیت ہر میدان میں

اپنے ادھورے اقدامات کی بدولت مات کھا رہا تھا۔ انہوں نے کچھ غیر عوامی لیکن حقیقت پسندانہ اقدم بھی اٹھائے جن کا مقصد ایک طرف اپنی اور دوسرے عوامی لیڈر نواز شریف کی وطن واپسی کو یقینی بنانا اور دوسری جانب پرویز مشرف کو وردی اتارنے اور ایمرجنسی کے خاتمے پر مجبور کرنا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ وفاق کی علامت تھیں اور اب وہ لبرل جمہوریت کی تمام اقدار کی علامت ہیں۔ انہوں نے نہ صرف پرویز مشرف کو الٹے پاؤں چلنے پر بلکہ بڑی انتخابی جماعتوں کو بھی انتخابات کی خاطر عوام کو حرکت میں لانے پر مجبور کر دیا تاکہ انتخابی عمل اور جمہوریت کے خلاف آمرانہ جوڑ توڑ کی بساط الٹی جا سکے۔

ان کی شخصیت کا جادو اس وقت پورے ملک میں سر چڑھ کے بول رہا تھا اور انہوں نے اپنی عوامی ریلیوں کے ذریعے لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کو گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ صرف دو ہفتے کے اندر وہ ن لیگ کے ساتھ مل کر پنجاب اور دوسرے علاقوں میں بڑے چوہدریوں کو پچھلی صفوں میں دھکیلنے میں کامیاب ہو گئیں۔ ق لیگ تاش کے پتوں کا محل بن کے رہ گئی۔ مزے کی بات یہ کہ وہ پنجاب اور سرحد میں ایک سہ رخی مقابلے میں وزارت عظمیٰ کی واحد امیدوار کے طور پر ابھر کر سامنے آ گئیں جبکہ سندھ میں کوئی ان کے قریب بھی نہ پھٹکتا تھا۔ اور یہی ارباب اقتدار کے لئے فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا جنہیں انتخابی کھیل ہاتھوں سے نکلتا دکھائی دے رہا تھا اور اس پر ان کے پسینے چھوٹ رہے تھے اسٹیبلشمنٹ میں موجود خودسر عناصر اور ان کے دہشت گرد ساتھی بے نظیر کو ٹھنڈا کرنے کے درپے تھے جو ان کی صورت میں ایک طاقتور لبرل حریف کو ابھرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک ناپاک اتحاد تھا اسٹیبلشمنٹ میں موجود ان خودسر عناصر کا جنہوں نے دہشت گردوں کا کام آسان کرنے کے لیے بے نظیر کی سکیورٹی میں مجرمانہ غفلت برتی۔

عوامی خواہشات اور آمرانہ اسٹیبلشمنٹ کے درمیان تنازعہ ابھی بھی طے ہونا باقی ہے۔ اور یہی حال بھٹو خاندان اور فوج کے درمیان چپقلش کا ہے جو کسی بھی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں جو پاکستان پر ان کی اجارہ داری کو چیلنج کرتا ہو۔ ذوالفقار علی بھٹو

کے عدالتی قتل، شاہنواز کی موت اور مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد اب بے نظیر کے قتل میں ایک واضح ربط دیکھنے کو ملتا ہے جو پی پی کا علم بلند رکھنے والی بھٹو خاندان کی دوسری نسل کی آخری علامت تھی۔

یہ بے نظیر بھٹو ہی تھیں جنہوں نے پی پی کو اس سے بھی زیادہ لبرل اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹی بنا دیا جتنا ذوالفقار علی بھٹو نے سوچا تھا۔ وہ جمہوری اقدار کا پرچار کرتی تھیں، انہوں نے بھارت مخالف سوچ کو ترک کیا، زیادہ سیکولر خصائل اپنائے اور پی پی کے سوشلزم اور پائیدار معاشی ترقی کے درمیان ایک اٹوٹ بندھن قائم کر دیا۔ اپنے والد کے برعکس وہ کسی سے دشمنی یا ذاتی عناد کی عادی نہ تھیں۔ بلکہ انہوں نے رواداری کے مظاہرے اور نقادوں اور مخالفین کے لئے زیادہ برداشت کے ذریعے بھٹو اور بھٹو مخالف کے درمیان تقسیم کو دور کیا۔ اسی لیے جب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو پی این اے کی پارٹیوں نے مٹھائیاں بانٹی تھیں اور سوگوار خاندان یا پارٹی کو تعزیت کا پیغام بھی نہ بھیجا تھا۔ لیکن بے نظیر کی موت پر پوری قوم نسل یا سیاسی تقسیم سے بالاتر ہو کر شدید رنج والم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس سے تمام حلقوں میں ان کی شخصیت کا سحر ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ بے نظیر بھٹو کی موت سے ایک ایسا عظیم خلا پیدا ہو گیا ہے جسے پر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کے پائے کی بین الاقوامی شخصیت کی تعمیر میں سالہا سال لگ جایا کرتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی موت کے ذریعے پی پی کو اس کے روایتی حلقہ اثر سے باہر بھی ایک مضبوط قوت بنا دیا ہے۔ ان کی موت سے شاید فوج مضبوط ہوئی ہو یا انتہا پسندوں کو فائدہ پہنچا ہو۔ لیکن ایک بدلی ہوئی عوامی جمہوری پی پی ان کے قاتلوں کے عزائم کو شکست دے دے گی۔ پی پی نے اپنی تاریخ کی اس بدترین گھڑی میں تحمل اور بردباری سے کام لیتے ہو۔ ئے بے مثال طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس نے چاروں صوبوں میں اپنی بھرپور موجودگی ثابت کر کے اور اپنے اس عزم کو ظاہر کر دیا کہ وہ ہر قیمت پر وفاق کی اکائیوں کو متحد رکھے گی۔ عوام اور پی پی کے ہر کارکن اور لیڈروں کی طرف سے عظیم تر اتحاد کا یہ مظاہرہ بھٹو خاندان کی نئی نسل پر زور دیتا

ہے کہ وہ اپنے اختلافات کو دفن کر دیں اور اپنے بزرگوں کے نام پر مل کر اس جدو جہد کو آگے بڑھائیں۔ پی پی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی نے اپنی محبوب لیڈر کی موت کے بعد شاندار فیصلے کئے ہیں۔ بلاول کو چیئر مین بنا کر انہوں نے پارٹی کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے بینظیر فیکٹر کو زندہ رکھا ہے۔ آصف زرداری کو شریک چیئر مین کے فرائض سونپ کر پارٹی نے ایک دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے چونکہ زرداری اس منصب کے لئے درکار صلاحیتوں اور مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے ہمت وحوصلے کا مظاہرہ کر چکے ہیں وہ درحقیقت ایک سچے جیالے اور بھٹو خاندان کے عظیم وفادار ہیں۔ اپنی قیادت کے پہلے امتحان میں زداری نے علیحدگی پسندانہ رجحانات کے خلاف پی پی کے وفاق پر مبنی موقف کا دفاع کر کے اپنا لوہا منوالیا ہے۔ سندھ سے تعلق رکھنے والے مخدوم امین فہیم کو وزارت عظمیٰ کا امیدوار نامزد کر کے پارٹی نے اس اعلیٰ ترین عہدے کے لئے الجھن اور رسہ کشی کا بھی کام تمام کر دیا ہے۔ انتہائی دانشمندانہ فیصلہ اس نے یہ کیا ہے کہ ن لیگ کو ساتھ لے کر چلتے ہوئے آٹھ جنوری کے انتخابات میں حصہ لیا جائے گا۔ اس سے اسٹیبلشمنٹ اور اس کے ہرکاروں میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ پی پی بے نظیر کے لئے ہمدردی کی اس لہر کے ساتھ انتخابی مقابلے سے کیونکر فرار اختیار کرے؟ صفیں سیدھی ہو چکی ہیں اور جمہوری قوتوں کو چاہئے کہ وہ بے نظیر کی اس عظیم قربانی کو رائیگاں نہ جانے دیں۔ بے نظیر امر ہو چکی ہیں۔ آیئے ان کی یاد میں ایک حقیقی جمہوریہ کی تعمیر کریں۔ بے نظیر کو میرا آخری خراج تحسین اور میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اس شفیق دوست اور لیڈر کے لئے اپنے جذبات کا اظہار کر سکوں۔

برانوین میڈوکس

شہید جمہوریت......الوداع

محترمہ بینظیر بھٹو کا خودکش حملے میں جاں بحق ہونا اتنا بڑا سانحہ ہے کہ اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ بلاشبہ پاکستان ایک عظیم لیڈر اور ایک عظیم خاتون سے محروم ہو گیا۔ انتخابی عوامی جلسے سے خطاب کے بعد وہ واپس جا رہی تھیں تو انہیں نشانہ بنایا گیا۔ دونوں جلاوطن رہنماؤں بینظیر بھٹو اور نواز شریف کی واپسی پر ایک طویل عرصے کے بعد انتخابی گہما گہمی اور جوش و خروش نظر آ رہا تھا جو یقیناً جمہوری نظام کا حسن ہے مگر اس حادثے نے اس حسن کو ماند کر دیا اور محسوس یوں ہو رہا ہے کہ پاکستان ایک مرتبہ پھر انتخابات سے دور ہو گیا ہے اس کی واضح مثال یہ ہے کہ ن لیگ، اے این پی جمعیت علماء پاکستان اور سنی تحریک نے انتخابی بائیکاٹ کا اعلان کر دیا ہے۔

انتقال سے قبل تک تو محترمہ کی قیادت میں پیپلز پارٹی انتخابات میں حصہ لے رہی تھی مگر کیا اب پارٹی میں ایسی قیادت ہے جو موجودہ صورتحال کو اپنے حق میں استعمال کر کے پیپلز پارٹی کو اقتدار میں لے آئے؟ محترمہ کا انتقال یقیناً بہت بڑا صدمہ ہے مگر یہ کہنا کہ یہ غیر متوقع یا اچانک ہوا درست نہیں ہے۔ وہ صوبہ سندھ کے ایک پسماندہ علاقے کی خاتون تھیں جن کا سیاست میں آنا بذات خود ایک بڑی کامیابی تھی مگر وہ پاکستان کو ماڈرن ریاست بنانے کیلئے پرعزم تھیں۔ ان پر کرپشن کے کیس بھی تھے جن میں سے چند سوئس عدالتوں میں بھی چل رہے تھے۔ تاہم اس کے باوجود جب وہ آٹھ سالہ جلاوطنی کے بعد وطن واپس آئیں تو ان کی جان کو لاحق خطرات کے حوالے سے چہ مگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ بہت سے حلقوں میں یہ موضوع بھی زیر بحث تھا کہ وہ گھنٹوں کی مہمان ہیں یا ہفتوں کی؟

خوش قسمتی سے وہ پہلے حملے میں بچ گئیں جو کراچی میں ہوا۔ قاتل نے ان تک رسائی حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر حفاظتی حصار میں الجھ کر رہ گیا اور وہیں اس نے اپنے آپ کو اڑا دیا۔ محترمہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھیں۔ گویا چند قدموں اور چند لمحوں کے

فاصلے سے محترمہ کا موت سے پہلا تعارف تھا۔ اس حادثے سے اگلے روز سینکڑوں ملکی وغیر ملکی صحافیوں کو انہوں نے انٹرویو دیا تو اکثر صحافیوں کی تلاشی تک نہیں لی گئی۔ بین الاقوامی لیڈر کو فراہم کی گئی ناقص سکیورٹی کئی اعتبار سے ناقابل فہم تھی جس پر اب انگلیاں اٹھنی شروع ہوگئی ہیں۔ اگرچہ انہیں خطرات سے مسلسل آگاہ کیا جارہا تھا، تاہم انہوں نے اپنی سیاسی مہم جاری رکھی یہاں تک کہ نومبر کا مہینہ آگیا اور صدر مشرف نے ایمرجنسی نافذ کردی۔ ذرائع ابلاغ پر پابندیاں عائد کردی گئیں اور چند ہفتے قبل شروع ہونے والے ٹی وی چینلز سمیت تمام ٹی وی چینلز کو بند کردیا گیا جس کے نتیجے میں انتخابی سرگرمیاں کسی حد تک ماند پڑ گئیں۔ ایمرجنسی کے خاتمے کے بعد انتخابی سرگرمیاں ایک بار پھر عروج پر چلی گئیں حتیٰ کہ وہ دن آگیا جس نے انتخابات پر ایک دفعہ پھر سوالیہ نشان لگا دیا۔

لگ تو یہی رہا ہے کہ انتخابات ملتوی ہوجائیں گے مگر چند ممالک ایسے ہیں جو ہر صورت پاکستان میں جمہوریت دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے دباؤ بھی ڈال رہے ہیں برطانیہ اور امریکہ ان انتخابات کے حوالے سے اپنی پالیسیاں تک ترتیب دے چکے تھے۔ انتخابات میں دھاندلی اور شفافیت پر تحفظات کے باوجود انہوں نے صدر مشرف اور محترمہ کے درمیان بات چیت کو آگے بڑھایا۔ اگرچہ جمہوری اعتبار سے یہ عمل درست نہ تھا، اس کے باوجود ملک کو جمہوری پٹڑی پر چڑھانے کے لیے انہوں نے یہ قدم اٹھایا۔ سارے حقائق اپنی جگہ، پر اب پیپلز پارٹی کا کیا بنے گا، بہت سے پارٹی رہنماؤں کا خیال ہے کہ پیپلز پارٹی کو انتخابات میں حصہ لینا چاہیے اور محترمہ کے انتقال کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہوئے کامیابی حاصل کرنی چاہیے۔ عوامی فضا اس وقت سوگوار اور محترمہ کیلئے ہمدردیاں عروج پر ہیں۔ اگر پیپلز پارٹی حصہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے تو اسے واضح کامیابی ملے گی اور عوام کی اکثریت اسے ووٹ دے گی۔

مگر پیپلز پارٹی کو ایک لیڈر کی ضرورت ہے۔ لیڈر کون ہو؟ یہ وہ سوال ہے جو پیپلز پارٹی کی قسمت کا فیصلہ کرے گا۔ جب تک وہ خود موجود تھیں تو جلاوطنی کے باوجود کوئی نام ایسا نہ تھا

جوان کی جگہ سنبھال سکتا اور نہ انہیں پارٹی سے کبھی اس قسم کے کسی چیلنج کا سامنا ہوا۔ اب جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں رہیں اور ان کے بچے بھی چھوٹے ہیں، بہت سے نام سامنے آئیں گے۔ ان ناموں میں سے سرفہرست مخدوم امین فہیم کا ہے جو اس وقت پارٹی کے نائب صدر ہیں اور محترمہ کی جلاوطنی کے دوران تمام پارٹی معاملات انہی کے ہاتھ میں تھے۔ ان کا تعلق بھی محترمہ کی طرح سندھ کے ایک مشہور جاگیردار خاندان سے ہے۔ انہیں بینظیر کا اعتماد بھی حاصل تھا اور خیال کیا جاتا ہے کہ سیاسی فہم و تدبر اور سمجھ بوجھ میں اس وقت پارٹی میں ان کا کوئی ثانی نہیں اور یہی پارٹی کو کامیابی کی منزل تک لے جا سکتے ہیں۔

دوسرا بڑا نام اعتزاز احسن کا ہے جنہیں بلاشبہ جسٹس افتخار چودھری کے بعد سب سے زیادہ شہرت ملی۔ فوجی حکومت کیخلاف انہوں نے کامیاب تحریک چلائی اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں مگر کچھ عرصے سے ان کے تعلقات محترمہ کے ساتھ کشیدہ تھے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ محترمہ نے انہیں وکلاء یا پیپلز پارٹی میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا کہا۔ اس کے علاوہ عوامی اعتبار سے بھی ان کے ووٹ بینک کا کوئی خاص حلقہ نہیں ہے۔

محترمہ کے شوہر آصف علی زرداری کا نام بھی اس ضمن میں لیا جا سکتا ہے۔ مگر وہ کوئی سیاسی شخصیت نہیں ہیں۔ وہ محترمہ کے شریک حیات تو تھے، شریک سیاست نہ تھے۔ کرپشن کی بناء پر بھی ان کی عوامی شہرت اتنی اچھی نہیں ہے۔ محترمہ کے دوسرے دور حکومت میں ان کی شہرت ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' کی تھی۔ انہیں عارضہ قلب لاحق ہے اور اسی وجہ سے اکتوبر میں محترمہ کے ساتھ واپس نہیں آئے تھے۔ جب محترمہ واپس آئی تھیں تو ایک انٹرویو میں، میں نے محترمہ سے پوچھا کہ زرداری بھی واپس آئیں گے؟ تو انہوں نے انتہائی قطعی انداز میں کہا ''نہیں'' وہ وہیں رہیں گے اور بچوں کا خیال رکھیں گے اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ بیمار بھی ہیں۔''

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاملات سامنے آتے رہیں گے اور مسائل بھی حل ہوتے رہیں گے مگر اپنے شہید والد کے بعد محترمہ نے پارٹی کو جو شان عطا کی تھی وہ شاید ایک

مدت تک اسے نصیب نہ ہو سکے۔ ایک بھرپور سیاسی زندگی گزار کر وہ اس دنیا سے چلی گئیں۔ ساری زندگی وہ جمہوریت کی سربلندی کیلئے لڑتی رہیں اور اسی کی خاطر جان قربان کر دی۔ ''شہید جمہوریت...... الوداع''

بشریٰ اعجاز

تیسرا کنارہ

جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے

8 جنوری نہیں، اب 18 فروری تک انتخابات لٹک گئے۔ افواہوں کی گرم بازاری اور لیڈران کی پیچیدہ بیان بازیوں میں ان کے مزید لٹکنے یعنی غیر معینہ مدت تک ملتوی ہونے کے امکانات بھی مسترد نہیں کیے جا سکتے۔ لہٰذا موجودہ صورتحال میں 27 دسمبر 2007ء سے پہلے کے تمام سیاسی تجزیے اندازے اور پلان فیل ہو چکے ہیں۔ لگتا ہے اب انتخابات کا انعقاد اگر ہوا بھی تو اس کے نتائج ان اندازوں کے بالکل برعکس ثابت ہوں گے جو عرف عام میں لگائے جا رہے تھے۔ اس لئے کہ کچھ فیصلے انسان کرتا ہے اور کچھ فیصلے تقدیر کرتی ہے اور تقدیر کے فیصلے ہمیشہ تدبیروں سے ٹکراتے اور انہیں الٹ ثابت کرتے رہتے ہیں۔ ان فیصلوں کو وقت کے فیصلے کہا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے لیاقت باغ کا سانحہ وقت کے انہی فیصلوں کا آنے والے دنوں میں عنوان ثابت ہوگا۔

بینظیر بھٹو جس کی آمد پر آٹھ سال سے قائم سیاسی جمود ٹوٹا اور جمہوری فضا بحال ہوئی۔ اس کی شہادت کے سانحے نے ملک میں ایک دفعہ پھر جمہوریت کے مستقبل کو سوالیہ بنا دیا ہے۔ اتنا سوالیہ کہ اب جمہوریت پسندوں کو ضیاء الحق کا نوے دن کا خوفناک خواب پھر سے دہلانے لگا ہے اور ملک کے اندر لحہ بہ لحہ ابھرنے والے گوناگوں بحرانوں کی موجودگی میں انتخابات کی گہما گہمیوں سے بھری ہوئی فضا ایک دفعہ پھر ساکن اور ٹھہرے ہوئے منظر کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔ ایسا نقشہ جس کی لکیروں میں بے یقینی اور شکوک کی سیاہی نمایاں نظر آتی ہے۔ بھٹو خاندان جس کے نام پر انتخابات لٹکائے اور مزید لٹکائے جانے کے خدشات نظر آتے ہیں۔ اس کے متعلق کہنے والے کہتے ہیں۔ سندھ میں بھٹوؤں کا معاملہ پہلے عقیدت کے درجے پر تھا۔ اب عقیدے کا رخ اختیار کرتا جا رہا ہے اور وہ جو مختلف حیلوں بہانوں سے اس اندوہناک قتل کو طاقت نسیاں کی زینت بنانے اور اس شہادت کو محض اک سوال قرار

دینے کی کوشش میں ہیں۔ وہ سراسر غلطی پر ہیں اس خاندان کی جمہوریت کے لئے دی جانے والی قربانیاں، معمہ بن جانے والے قتل، طلسماتی زندگیاں اور حادثاتی اموات جمہوری تاریخ کا ایسا حصہ بن چکی ہیں جو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور جائے وقوعہ پر قتل کے سارے نشانات مٹا دینے اور ساری موقع کی گواہیاں ختم کر دینے کے بعد بھی جو زندہ ہے اور زندہ رہے گا کہ یہ بھی وقت کا اپنا فیصلہ ہے اور وقت کے فیصلوں کو زیادہ دیر لٹکایا جانا ممکن نہیں ان سے چشم پوشی اچھی نہیں مگر اس کی سمجھ کسی کو نہیں آ رہی جبکہ 27 دسمبر کے بعد ملک بھر میں جو تھر تھلی مچی ہوئی ہے اس کے اثرات عارضی اور وقتی نظر نہیں آتے۔ معاملہ اب سنجیدہ ہی نہیں گھمبیر صورت اختیار کر چکا ہے۔ زمینی حقائق اگر کسی چڑیا کا نام نہیں تو پھر ان پر توجہ از حد ضروری ہے۔ بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق جو انتخابات کے التواء پر اس نے پیش کی۔ 18 فروری تو دور کی بات ہے سیاست میں تو انہونی ہو سکتی ہے۔ یعنی آج کے ہیرو کل کے زیرو ہو سکتے ہیں اور زیرو ہیرو کا درجہ اختیار کر سکتے ہیں۔ انہونی آخر ایسے ہی بظاہر ناممکن نظر آنے والے حالات و واقعات کا نام ہے۔ 27 دسمبر بھی تو ایک انہونی ہی تھی جس کے متعلق انٹیریئر منسٹری کے ترجمان نے جو زبردست بیانات پیش کئے انہیں سن کر طبعیت منٹوں میں ''بشاش'' ہو کر رہ گئی ہے۔ محترمہ کی شہادت پر منسٹری کی جانب سے پہلا جاری کردہ بیان گردن میں گولیاں لگنے کا آیا جس کے بعد گاڑی کا سن روف لیور محترمہ کا قاتل ٹھہرا اور اس کے بعد بیت اللہ محسود تو تھا ہی جس نے الزام کو قطعیت سے مسترد کرتے ہوئے پی پی پی کو اپنا تعزیتی پیغام بھی بھجوایا ہے۔ قوم نے انتہائی دکھ کے لمحات میں منسٹری کی ان گل فشانیوں کو برداشت کیا اور خاموش رہی جبکہ صورتحال یہ ہے کہ سانحہ لیاقت باغ کی تحقیقات کے لئے مغربی تحقیقاتی ٹیمیں بلانے کا مطالبہ پہلے حکومتی سطح پر مسترد کئے جانے اور اس کے بعد سکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم کی پاکستان میں آمد پر آمادگی کے متعلق بھی قوم کچھ زیادہ مثبت رائے نہیں رکھتی ہے۔ نیز انٹیریئر منسٹری کی چکر پھیریاں، تحقیقاتی ٹیموں کے مطالبے پر حکومتی گومگو اور بعد ازاں سکاٹ لینڈ یارڈ کی پانچ رکنی ٹیم کی پاکستان آمد پر موقع کی شہادتوں

کے ضائع کر دیئے جانے جیسے حقائق کی روشنی میں تحقیقات سے کوئی حتمی نتیجہ نکلنے کی توقع بھی کم ہی نظر آتی ہے۔ لیاقت علی خان سے لے کر میر مرتضیٰ بھٹو تک ان تحقیقات کے نتائج ہمارے سامنے ہیں جو بجائے خود سوالیہ مشکوک اور پراسرار ہیں۔

ایسے میں ہمارے لیڈروں کے آگ لگاؤ قسم کے بیانات انکوائری مکمل ہونے تک زرداری کو ملک سے فرار نہیں ہونے دیں گے کہ سکاٹ لینڈ یارڈ کے لئے بینظیر کے بیمہ کی رقم کس کو ملے گی۔ بینظیر کی وصیت پر دستخط اصلی ہونے کی بھی انکوائری کی جائے گی۔ قومی حکومت بنانے کی ضرورت نہیں، پیپلز پارٹی اقتدار پر زبردستی قبضہ کرنا چاہتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اسی انتقامی سیاست کا حصہ ہیں، جسے مسترد کر کے محترمہ نے میاں نواز شریف سے مصالحت کا آغاز کیا تھا اور اس مصالحت کی خوشگواریت ان کے مابین آخری وقت تک جاری رہی یہی وجہ ہے نواز شریف نے بینظیر کی شہادت کے سانحے کا اثر دل پر محسوس کیا اور اس پر جس قسم کا ردعمل ظاہر کیا وہ ان کی صاف دلی اور خلوص کا مظہر تھا جس کو سب نے سراہا۔ یہی وجہ ہے اتنے شدید حادثے اور اندوہناکی کے بعد پنجاب اور سندھ کے لیڈروں کے مابین، بیانات کی جو گولہ باری شروع ہوئی ہے اسے کوئی بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھ رہا کیونکہ وہ اسی انتقامی سیاست کا تسلسل ہے۔ جسے ہم پچھلے ساٹھ برسوں سے بھگت رہے ہیں اور جس نے نہ صرف جمہوریت کے مستقبل کو مخدوش بنا رکھا ہے بلکہ ملک کا مستقبل بھی اب اس کی زد میں آتا دکھائی دیتا ہے۔ صوبائیت کو آواز دینے، ق لیگ کی قیادت کے یہ تند و تلخ بیانات اس نازک موقع پر وفاق پاکستان کے لئے جس قدر مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کے متعلق سوچ کر ہی دل کانپ جاتا ہے۔ بینظیر کی شہادت پر ملک بھر میں بچھی جانے والی صف ماتم اور عوام کا اس سانحے پر غم و غصے کا اظہار کیا یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں کہ وہ کس پائے کی لیڈر تھی اور اس نے چاروں صوبوں کو کس طرح آپس میں ایک زنجیر کی طرح جوڑ رکھا تھا اور اس زنجیر کے ٹوٹ جانے پر اگر احتیاط کو ملحوظ خاطر نہ رکھا گیا تو پھر صوبائیت کے مسائل کتنے شدید اور خطرناک ہو سکتے ہیں، جسے کچھ صوبائی لیڈر اس سانحے کے بعد

مسلسل ہوا دینے کی کوششوں میں ہیں۔ اگر پی پی لیڈر اور اس کی پارٹی محض وادی سندھ کی میراث ہوتی تو آج پورے ملک کی نظریں کیا نوڈیرو پر ہی لگی ہوتیں؟ اس حقیقت کے اعتراف میں اب بھی کیا کوئی امر مانع ہے کہ پیپلز پارٹی ملک کی ایسی واحد جماعت ہے جس کی جڑیں تمام صوبوں میں پھیلی ہوئی ہیں اب جبکہ یہ جماعت اپنا مرکزی لیڈر گنوا چکی ہے اس کے باوجود مرکز کی نگاہیں اگر اس کی جانب دیکھتی ہیں تو اس کے پیچھے بھی ناقابل تردید زمینی حقائق ہی ہیں، جنہیں کوشش کے باوجود جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ بی بی سی نے اس ساری صورتحال کے دریا کو کوزے میں بند کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا ہے مقابلہ چودھری اور زرداری میں نہیں، وفاق اور اقتدار میں ہے۔ وفاق کون اور اقتدار کون اگر اس کی سمجھ آجائے تو پھر یہ سمجھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وفاق اہم ہے یا اقتدار، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ اگر عوام؟ تو پھر اس کے لئے آٹھ جنوری کا دن خاصا مناسب تھا اب چونکہ اس کی تاریخ کو آٹھ فروری تک ٹال دیا گیا ہے۔ اور مزید ٹالے جانے کے خدشات بھی موجود ہیں تو اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلہ ایک دفعہ پھر عوام کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے اب اسے کون کرے گا؟ شاید وہی نادیدہ قوتیں جنہوں نے ایسے فیصلے پہلے سے لکھ رکھے ہیں۔

27 دسمبر کا فیصلہ بھی شاید کہیں لکھا جا چکا تھا سامنے اب ہے جسے دیکھ کر مجھے ان نفوس کا خیال آتا ہے جن کے متعلق فیض نے کہا ہے "جو نہ اس صف میں تھے اور نہ اس صف میں تھے، راستے میں کھڑے ان کو تکتے رہے رشک کرتے رہے اور چپ چاپ آنسو بہاتے رہے ان آنسو بہانے والوں کی صف میں آج ہم سب کھڑے انہیں دیکھتے ہیں وہ جنہوں نے۔

میں نیل کرائیاں نیلکاں میرا تن من نیلو نیل
اساں سودے کیتے دلاں دے، تے کیتا عشق وکیل

کا نعرہ لگایا اور اس آگ میں کود پڑے جسے کبھی نہ کبھی گلزار ہونا ہے مگر میں دیکھتی ہوں ہم

ابھی تک فیصلوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ صوبائیت میں الجھے ہوئے ہیں۔ انتقامی سیاست میں الجھے ہوئے ہیں۔ ہمارا مقدر کیا ہے؟ پنجابی اور بنگالی کے نعرے کے خوفناک نتائج بھگتنے والی قوم کیا اب سندھی اور پنجابی کے نعرے کی متحمل ہو سکتی ہے۔ یہ نازک موقع اپنے مہربانوں سے جوش کا نہیں ہوش کا تقاضا کرتا ہے خدارا ہوش کریں۔

تنویر قیصر شاہد

تعاقب

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید

محترمہ بینظیر بھٹو اب اس دنیا میں نہیں رہیں لیکن ان کا نام اور کام اب بھی زندہ ہے اور تادیر زندہ رہے گا۔ جب تک پاکستان میں جمہوریت کیلئے جدوجہد ہوتی رہے گی اور جب تک آمریت کے مکمل خاتمے اور غلبے کے خلاف عوام الناس کے دلوں میں بے زاری اور نفرت موجود رہے گی، محترمہ بینظیر بھٹو کا نام ہمارے درمیان گونجتا اور تحرک و تحریک پیدا کرتا رہے گا۔ لاریب وہ دنیا بھر میں پاکستان کی پہچان تھیں، پاکستان کی آن اور شان تھیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج عالمی سطح پر پاکستان کو دہشت گردوں کی جنت اور شدت پسندوں کی آماجگاہ کے طور پر جانا جاتا ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے ہاں دہشت گرد بھی پناہ یافتہ ہیں اور شدت پسند بھی اپنی کارستانیوں میں مصروف اور مشغول ہیں لیکن پاکستان کے 16 کروڑ عوام میں ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے۔ ہم سب ان سے اپنی لاتعلقی اور برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ گماشتہ صفت لوگوں کا یہ گروہ پاکستان کے چہرے پر کالک ملنے اور اسے داغدار کرنے کا باعث بن رہا ہے۔ یہ سوسائٹی کو ہائی جیک کرنے اور اس پر غالب آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انہی کی وجہ سے پاکستان عالمی سطح پر بدنام ہوا ہے اور ہمارے وجود کے دشمنوں کو ہمارے اور ہمارے ملک کے بارے میں دریدہ دہنی کرنے کے مواقع بھی مل رہے ہیں۔ یہ اسی کا شاخسانہ ہے کہ لندن سے شائع ہونے والے دنیا میسح کے ممتاز ترین جریدے ”اکانومسٹ“ نے دسمبر 2008ء کے پہلے شمارے میں یہ بدگوئی کی ہے کہ پاکستان دنیا کا سب سے خطرناک ملک ہے۔ اس سے قبل امریکہ کے ممتاز ہفت روزہ جریدے ”نیوز ویک“ میں اسی طرح بدگوئی کی گئی تھی۔ یہ اسی کا کارن ہے کہ 7 جنوری 2008ء کو امریکہ کے بعض کارپردازوں اور مدار المہاموں نے پاکستان کے خلاف ایکشن لینے کی تجویز دی ہے۔ ان

مثالوں اور سازشوں کی موجودگی میں محترمہ بینظیر بھٹو کا وجود اور شخصیت دنیا بھر میں پاکستان کو ایک ماڈریٹ ریاست اور یہاں کے شہریوں کو روشن خیال اور معتدل مزاج افراد کے طور پر متعارف کراتا تھا۔ عالمی برادری انہیں دیکھتی تو بے اختیار کہہ اٹھتی کہ بینظیر بھٹو کے ہوتے ہوئے یہ کہنا مشکل تر ہو جاتا ہے کہ پاکستانی معاشرہ رجعت پسند اور متشدد افراد کا مجموعہ ہے۔

صد افسوس کہ پاکستان کا یہ روشن چہرہ اب منوں مٹی تلے جا سویا ہے۔ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت سے قبل پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو بھی اسی جگہ صفحہ ہستی سے مٹایا گیا جہاں بینظیر کی زندگی کا خاتمہ کیا گیا۔ ان سے قبل اسی شہر میں پاکستان کے پہلے منتخب وزیر اعظم اور محترمہ کے والد گرامی ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر کھینچا گیا اور اسی ملک میں محترمہ کی غیر فطری موت سے قبل پاکستان کا ایک ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق ہواؤں میں المناک انجام سے دوچار ہوا لیکن پاکستان کے عوام نے بینظیر بھٹو کی شہادت پر آنسوؤں کے جتنے دریا بہائے ہیں، اتنے اشک لیاقت علی خان، بھٹو اور جنرل ضیاء کی رحلت و رخصت پر نہ بہائے جا سکے۔ بھٹو خاندان کا یہ المیہ ہے کہ اس کے صحن میں چار شہیدوں کے جنازے اترے، جنرل ضیاء کے دور میں پہلے زیڈ اے بھٹو گئے، پھر ان کے چھوٹے صاحبزادے شاہ نواز بھٹو کو جنرل ضیاء کے دور میں زہر خورانی سے عدم آباد کی طرف روانہ کیا گیا۔ ابھی شاہ نواز عرف گوگی کی موت کا سوگ مدہم بھی نہ پڑا تھا اور ان کی یاد کے پھول ابھی کمہلائے بھی نہ تھے کہ مرتضیٰ بھٹو کو پولیس کی گولیوں سے سرراہ اڑا کر رکھ دیا گیا۔ شوہر اور صاحبزادگان کی المناک موت اور شہادت نے محترمہ نصرت بھٹو کی کمر توڑ کر رکھ دی اور وہ ہمیشہ کیلئے زبان بند ہو کر بیٹھ گئیں اور اب بھٹو خاندان میں محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کی بارات اتری ہے تو سب کا دل بیٹھ گیا ہے اور اشکوں کی روانی سے آنکھیں خشک ہو گئی ہیں۔ ایسے میں سندھی بھائیوں کے غصے اور ناراضگی سے گلہ اور شکوہ کیسا؟ بھٹو خاندان کے اندر یکے بعد دیگرے شہداء کے جنازوں کا اٹھنا ایک اشکبار داستان کا انتہائی المناک اور دلدوز باب ہے لیکن ایک اعتبار سے بھٹو خاندان اس پر فخر بھی کر سکتا ہے کہ سندھ کے اکیلے خاندان نے اپنے چار

اہم نفوس کی جانوں کی قربانی دے کر پاکستان میں جمہوریت کی لاج رکھی ہے اور اسے مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہونے اور آگے بڑھنے میں اپنا خون کا نذرانہ پیش کیا لیکن یزیدوں اور آمروں کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید

جاوید چودھری

زیرو پوائنٹ

آخری موقع

یہ کہانی 1934ء سے شروع ہوتی ہے۔ سندھ کے مشہور جاگیردار شاہنواز نے کراچی میں ''سندھ پیپلز پارٹی'' کے نام سے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی، یہ سندھ میں مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت تھی اور سر شاہنواز اس وقت گورنر کے اسسٹنٹ تھے۔ 1936ء میں سندھ بمبئی سے الگ ہوگیا تو پیپلز پارٹی نے سندھ اتحاد پارٹی کی شکل اختیار کر لی۔ شاہنواز اپنی ذات میں یگانہ تھے انہوں نے 21 برس کی عمر میں سیاست شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کی نامور شخصیات میں شمار ہونے لگے۔ وہ بمبئی کی قانون ساز کونسل کے رکن بنے انہوں نے انگریز سرکار سے او بی ای، خان بہادر اور سر کے خطاب لئے، وہ بمبئی حکومت میں وزیر بنے، وہ گورنر کے اسسٹنٹ رہے، وہ پبلک سروس کمیشن کے رکن اور چیئرمین رہے اور وہ ریاست جوناگڑھ کے وزیراعظم بنے، وہ جوناگڑھ کا پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے تھے لیکن سردار پٹیل، نواب آف جوناگڑھ کے قریبی دوست تھے چنانچہ پٹیل نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا، یہ ناکامی سر شاہنواز کے دل پر داغ بن گئی، وہ جوناگڑھ سے پاکستان آئے اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سیاست سے کنارہ کش ہو گئے وہ 19 نومبر 1957ء تک زندہ رہے لیکن انہوں نے اس کے بعد کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لیا۔

ذوالفقار علی بھٹو، سر شاہنواز کے صاحبزادے تھے، ذوالفقار علی بھٹو نے بمبئی کے انگریزی سکولوں، کیلی فورنیا کے مشہور کالج برکلے اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ وہ 1953ء میں کراچی لوٹے اور انہوں نے وکالت کے ساتھ ساتھ ایس ایم لاء کالج میں انٹرنیشنل لاء پڑھانا شروع کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو سیاست میں آنا چاہتے تھے لیکن سر شاہنواز سیاست کے مخالف تھے سر شاہنواز کا خیال تھا سیاست ایک ایسا کھیل ہے جس کا اختتام ہمیشہ المناک ہوتا ہے، وہ اپنے بیٹے کو خوش، خوشحال اور مطمئن دیکھنا چاہتے تھے لیکن بھٹو

سیاست کو اپنا کیریئر سمجھتے تھے، سکندر مرزا اور حسین شہید سہروردی سر شاہ نواز کے دوست تھے، ذوالفقار علی بھٹو ان کے پاس گئے اور یہ دونوں حضرات سر شاہ نواز کی مخالفت کے باوجود بھٹو کو سیاست میں لے آئے ذوالفقار علی بھٹو سکندر مرزا اور ایوب خان کی کابینہ میں وزیر رہے وہ ابتداً معدنیات وقدرتی وسائل، اقلیتی امور، قومی تعمیرات اور امور کشمیر کے وزیر بنے اور بعد ازاں 1962ء میں پاکستان کے وزیر خارجہ بنا دیئے گئے۔ وہ جنوری 1966ء میں ایوب خان سے الگ ہوئے انہوں نے 30 نومبر 1967ء کو اپنی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا اور اس پارٹی کیلئے اپنے مرحوم والد کی جماعت پیپلز پارٹی کا نام پسند کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ''قائد عوام'' بن گئے۔ بھٹو نے پاکستانی سیاست اور پاکستانی تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑے انہوں نے 1971ء کی جنگ میں شکست کے بعد پاکستان کا ہاتھ تھاما اور ایک زخم خوردہ اور ادھورے ملک کو تباہ ہونے سے بچا لیا، وہ ملک بھر کے غریبوں، مسکینوں، بے روزگاروں اور ہاریوں کے مسیحا بن کر طلوع ہوئے اور انہوں نے ڈری، سہمی اور خشک زبانوں کو آواز دی لیکن 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے اس بھٹو سے حکومت چھینی اور انہیں 4 اپریل 1979ء کو پھانسی پر لٹکا دیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کے بعد ان کی صاحبزادی محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے والد کے مشن کو کندھا دیا، وہ سیاسی کھیل میں شرکت کے فوراً بعد جلا وطن ہوئیں۔ انہوں نے لندن میں پیپلز پارٹی کی عنان سنبھالی اور طویل جلا وطنی کے بعد 10 اپریل 1986ء کو پاکستان آئیں، ذوالفقار علی بھٹو کے 20 لاکھ جانثاروں نے ان کا استقبال کیا اور اس کے بعد زندگی بھٹو کی بیٹی کیلئے دکھوں کی ایک ایسی راہ گزر بن گئی جس کی ایک ایک انچ پر آلام، تکالیف اور اذیت کے کانٹے پیوست تھے اور بھٹو کی بیٹی اس راہ پر برہنہ پا چل رہی تھی اس سفر کے دوران ان کے ایک بھائی شاہ نواز بھٹو کو فرانس میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا اور دوسرے بھائی مرتضٰی بھٹو 1996ء میں کراچی میں گولی کا نشانہ بن گئے۔ وہ دسمبر 1988ء میں وزیر اعظم بنیں تو ٹھیک 18 ماہ بعد غلام اسحاق خان نے ان کی حکومت برطرف کر دی وہ

اکتوبر 1993ء میں دوسری بار وزیراعظم بنیں تو اڑھائی برس بعد انکے اپنے صدر اور کارکن سردار فاروق لغاری ان کے جانی دشمن بن گئے، وہ 1999ء میں جلاوطن ہوئیں تو انہوں نے واپسی کی آرزو میں آٹھ برس دیارِ غیر میں گزار دیئے اور وہ 18 اکتوبر 2007ء کو وطن واپس آئیں تو انہیں آتے ہی ڈیڑھ سو نعشوں کا تحفہ مل گیا غرض بے نظیر بھٹو کی زندگی کے ہر ورق پر کوئی نہ کوئی دکھ کوئی نہ کوئی اذیت تحریر تھی، 18 اکتوبر کے بعد پوری دنیا نے انہیں ''احتیاط'' کے مشورے دیئے۔ ان کے عہدیدار انہیں واپسی کا مشورہ دیتے رہے اور میرے سمیت تمام صحافی' دانشور اور لکھاری انہیں الیکشن کے بائیکاٹ کا مشورہ دیتے رہے لیکن بینظیر ڈٹی رہیں، بے نظیر کا خیال تھا کہ یہ الیکشن جمہوریت کیلئے ناگزیر ہیں اگر آج انہوں نے پسپائی اختیار کر لی تو پاکستان آمریت کے پنجے سے کبھی آزاد نہیں ہو سکے گا۔ محترمہ کو اپنے اردگرد خطرات کے سائے منڈلاتے دکھائی دے رہے تھے وہ بار بار حکومت سے سکیورٹی کی درخواست کرتی تھیں، لیکن حکومت نے انہیں تسلی کے چند بولوں کے سوا کچھ نہ دیا یہاں تک کہ 27 دسمبر 2007ء کی شام آئی اور جاتے جاتے بھٹو خاندان کا آخری چراغ بھی بجھا گئی۔ سر شاہنواز کی بات سچ ثابت ہو گئی، انہوں نے 1953ء میں اپنے بیٹے ذوالفقار علی بھٹو سے کہا تھا۔ سیاست ایک ایسا کھیل ہے جس کا انجام ہمیشہ المناک ہوتا ہے۔ پیپلز پارٹی اور بھٹو خاندان اس المناک انجام کا شکار ہو گیا۔

میں آج یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ سمیت پاکستان کے وہ تمام لکھاری جو محترمہ کی سیاست کو مصلحت، ڈیل، بزدلی اور مفادات کا کھیل قرار دیتے رہے ہیں وہ سب غلط تھے اور محترمہ کے خدشات درست ذرا سوچئے جس خاتون کے والد کو وزارت عظمیٰ کی کرسی سے گھسیٹ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہو، جس نے سڑکوں پر ڈنڈے کھائے ہوں جس کی ماں برسوں سے کومے میں ہو جو دس برس تک وطن سے دور اپنے بچوں کو گلے لگا کر بیٹھی رہی ہو جس کے خاوند نے پندرہ برس جیل میں گزار دیئے ہوں اور جسے تین نسلوں کی سیاسی قربانیوں کے بعد دو ٹکڑوں میں صرف 4 سال 8 ماہ اور 18 دن کا اقتدار ملا اور دونوں بار اس

کی حکومت (2B) 58 کا شکار ہوگئی ہو اور جس نے اپنی زندگی کا قیمتی ترین وقت خود کو عدالتوں میں بے گناہ ثابت کرنے میں گزار دیا ہو، کیا وہ خاتون زندگی کو ٹوٹل ٹول کر نہیں گزارے گی؟ کیا وہ مصلحت کوشش اور احتیاط پر مجبور نہیں ہو جائے گی؟ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو ملک کی واحد وفاقی لیڈر اور پیپلز پارٹی پاکستان کی واحد قومی جماعت ہے، محترمہ بے نظیر بھٹو چاروں صوبوں کی زنجیر تھی، وہ پاکستان کی واحد لیڈر تھیں جنہیں چاروں صوبوں کے عوام تسلیم کرتے تھے اور پیپلز پارٹی پاکستان کی واحد جماعت ہے جس کی جڑیں ملک کے تمام صوبوں میں موجود ہیں اور محترمہ کی شہادت کے بعد یہ زنجیر ٹوٹ چکی ہے اور اب ملک میں کوئی ایسا لیڈر نہیں بچا جو پورے ملک کو سنبھال سکے، ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا محترمہ کی شہادت کے بعد ہماری اسٹیبلشمنٹ پیپلز پارٹی کو بھی توڑنے کی کوشش کرے گی اور خدانخواستہ یہ سازش کامیاب ہوگئی، تو یہ 1971ء سے بڑا سانحہ ہوگا بھٹو صاحب نے 1978ء میں جیل میں کہا تھا اگر میں مرگیا تو میری موت پر ہمالیہ روئے گا ہمیں ماننا پڑے گا، بھٹو کی موت پر ہمالیہ نہیں رویا لیکن آج بھٹو کی بیٹی کی شہادت پر پاکستان کی ایک ایک سڑک، ایک ایک شہر، ایک ایک قصبہ، ایک ایک گلی اور ایک ایک گھر رو رہا ہے ہمیں ماننا پڑے گا، بے نظیر بھٹو زندگی بھر آمریت، عسکری طاقتوں اور غیر قانونی حکومتوں کے خلاف لڑتی رہیں وہ زندگی میں تو غیر قانونی حکومتوں اور طاقتوں کو شکست نہ دے سکی لیکن آج اس بے نظیر کے جنازے کے سامنے حکومت بے بس ہوگئی ہے آج پورے ملک میں آگ لگی ہے اور ملک کے کسی کونے میں حکومت نظر نہیں آرہی، ہمیں ماننا پڑے گا آج آمریت اپنے ہی وجود میں سمٹتی چلی جارہی ہے۔ بے نظیر بھٹو کی شہادت اس ملک میں اسٹیبلشمنٹ کا اختتام ہے اگر ہماری حکومت نے وقت کی آواز نہ سنی تو مجھے ڈر ہے آنے والا کل اس ملک پر قیامت بن کر ٹوٹے گا۔ ہم بارود اور خون کی ایک ایسی خوفناک وادی کی دہلیز پر کھڑے ہیں جس سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں، بس ہٹ دھرمی، ضد اور انا کا ایک اور قدم اٹھانے کی دیر ہے اور ہم پر زندگی کے دروازے بند ہو جائیں گے ہمارے پاس بس ایک آخری چانس ہے اگر

صدر پرویز مشرف اپنی صدارت جاری رکھنے کے عزم پر نظر ثانی کریں، اگر ہم عدلیہ کو بحال کر دیں، ہم وزارت عظمیٰ پیپلز پارٹی کو دے دیں، ہم قومی حکومت بنائیں ملک میں فیئر اینڈ فری الیکشن کرائیں اور جو پارٹی زیادہ نشستیں حاصل کر لے ہم اسے حکومت بنانے کی اجازت دے دیں اور یہ حکومت پانچ برس پورے کرے ہم فیصلہ کر لیں دس برس تک اس ملک میں صدر بلوچ، وزیراعظم سندھی اور آرمی چیف پشتون ہوگا اور ملک کے تمام ترقیاتی منصوبے بلوچستان سے شروع ہوں گے تو اس ملک کے بچنے کے امکانات ہو سکتے ہیں ورنہ یقین کیجئے بے نظیر بھٹو کی یہ نعش ملک کی نعش ثابت ہوگی اور ہم سب قبر میں اتر جائیں گے اور ہم پر گورکن حکومت کریں گے خدا کے بندو اب تو سنبھل جاؤ اب تو معاف کر دو۔

حامد میر
قلم کمان

آخری ملاقات

یاد نہیں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ پہلی ملاقات کب ہوئی لیکن ان کے ساتھ آخری ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ 1987ء میں والد کی وفات پر تعزیت کیلئے لاہور میں ہمارے گھر تشریف لائیں تو مجھے دلاسہ دیتے ہوئے کہا کہ میں تمہاری بڑی بہن ہوں اور زندگی میں کبھی ہمت نہ ہارنا۔ مجھے ان کے یہ الفاظ ہمیشہ یاد رہے۔ وہ جب حکومت میں ہوتیں تو میں انہیں صحافی بن کر ملتا اور جب اپوزیشن میں ہوتیں تو پھر مجھے چھوٹا بھائی بننا پڑتا۔ پچھلے بیس سال میں مجھے جب بھی کسی مشکل کا سامنا ہوا تو انہوں نے ٹیلی فون، خط یا ای میل کے ذریعے خیریت ضرور دریافت کی۔ ای میلز کا ریکارڈ تو محفوظ نہیں لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو کی طرف سے لکھے گئے کئی خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ بیس سال میں مجھ سے کئی قلمی گستاخیاں سرزد ہوئیں۔ لیکن بڑی بہن سب کچھ نظر انداز کرتی رہی۔ صرف ایک مرتبہ زوردار ڈانٹ پڑی اور وہ بھی پروٹوکول کی نادانستہ خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک اپوزیشن لیڈر سے ملنے پر۔ ہم وزیراعظم کے طیارے میں نیویارک کی طرف محو پرواز تھے کہ ملٹری سیکرٹری کا پیغام آیا کہ پرائم منسٹر یاد کر رہی ہیں۔

چند ہی لمحوں میں یہ خاکسار اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے محترمہ بے نظیر بھٹو کے سامنے بیٹھا تھا۔ لیکن اس دن وہ بڑی بہن نہیں بلکہ پرائم منسٹر نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے مختصراً حال احوال دریافت کیا اور پھر کہا کہ آپکو کسی کو بھی ملنے کا پورا حق ہے لیکن پروٹوکول بھی کوئی شے ہوتی ہے۔ آپ ایک سرکاری وفد میں شامل ہیں اور آپ ایک سرکاری تقریب چھوڑ کر اپوزیشن پارٹی کے لیڈر کو ملنے چلے گئے۔ کچھ غصہ دکھانے کے بعد انہوں نے ائیر ہوسٹس کو بلایا اور میرے لئے آئس کریم منگوائی۔ جتنی دیر میں نے آئس کریم کھائی وہ اخبار پڑھتی رہیں۔ آئس کریم ختم ہوئی تو فرمایا کہ خاموشی سے لیکچر سننے کا شکریہ اور

آئندہ پروٹوکول کا خیال رکھنا۔ 27 دسمبر 2007ء کو اپنی شہادت سے چند دن قبل زرداری ہاؤس اسلام آباد کے صحن میں بیٹھ کر وہ بتا رہی تھیں کہ امریکی انتظامیہ جسٹس افتخار محمد چوہدری کی بحالی کے خلاف ہے اور انتخابات کے بائیکاٹ سے ہم معزول ججوں کو بحال نہیں کروا سکتے۔ اس آخری ملاقات میں انکی زندگی کو درپیش خطرات کا ذکر بھی آیا۔ مجھے انکی 1990ء کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ سترہ سال قبل انکی پہلی حکومت ختم ہوئی تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے اسلام آباد میں مجھے روزنامہ جنگ کیلئے ایک تفصیلی انٹرویو دیا تھا۔ اس انٹرویو میں بھی انہوں نے اپنی زندگی کو لاحق خطرات کا ذکر کیا تھا۔ 1990ء میں وہ جس طرف اشارہ کر رہی تھیں 2007ء میں بھی ان کا اشارہ اسی طرف تھا۔ اس آخری ملاقات میں انہوں نے کہا کہ مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ پاکستان کی فکر ہے کیونکہ پاکستان کی سلامتی کو آج بہت سے خطرات لاحق ہیں۔ اس ملاقات میں وہ الطاف حسین کے علاوہ اختر مینگل، اسفند یار ولی، محمود خان اچکزئی اور حاصل بزنجو کو بھی قومی دھارے میں شامل رکھنے کی ضرورت پر زور دیتی رہیں۔ نواز شریف کے بارے میں انکی رائے بہت مثبت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ایک وسیع البنیاد نگراں قومی حکومت ہی پاکستان کو موجودہ بحران سے نکال سکتی ہے۔ چوہدری شجاعت حسین اور چوہدری پرویز الٰہی کے بارے میں انہوں نے کچھ تحفظات کا اظہار کیا۔ مجھے احساس ہوا کہ کوئی نہ کوئی بے بنیاد اطلاعات کے ذریعے چوہدری ظہور الٰہی کے بیٹوں اور ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی کے درمیان غلط فہمیاں پھیلا رہا ہے۔ 1996ء میں انکی دوسری حکومت کے خاتمے کی افواہیں زوروں پر تھیں تو ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ گلبدین حکمت یار کی میرے ساتھ کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھے ایک رپورٹ دکھائی جس میں کہا گیا تھا کہ گلبدین حکمت یار کے آدمی وزیراعظم کو قتل کرنے کے لیے اسلام آباد روانہ کر دیئے گئے ہیں۔ اس وقت نصیر اللہ بابر وزیر داخلہ تھے انہوں نے 1975ء میں آئی جی ایف سی کے طور پر حکمت یار کی مدد شروع کی تھی۔ نصیر اللہ بابر نے پرانے تعلقات کو استعمال کرتے ہوئے حکمت یار سے پوچھا کہ وہ بے نظیر بھٹو

سے کیوں ناراض ہے تو افغان رہنما نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ بے نظیر پر حملے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ چند ماہ قبل لاہور کے ایک انگریزی اخبار نے بیت اللہ محسود کے حوالے سے یہ خبر شائع کی کہ بے نظیر بھٹو پر خودکش حملے کیے جائیں گے تو اسی دن بے نظیر صاحبہ کے قریبی ساتھیوں نے جنوبی وزیرستان کے سینیٹر صالح شاہ کے ذریعے بیت اللہ محسود کے دعوے کی تصدیق چاہی۔ بیت اللہ محسود نے اس خبر کی تردید کر دی۔ بے نظیر بھٹو کے ایک اور قریبی ساتھی نے بیت اللہ محسود سے براہ راست رابطہ کیا۔ بعد ازاں بے نظیر بھٹو نے یہ رابطے منقطع کروادیئے اور پیغام بھجوایا کہ انتخابات کے بعد قیام امن کے لئے دوبارہ رابطے کریں گے۔

یہ وہ پس منظر ہے جس کے باعث پیپلز پارٹی کی قیادت آنکھیں بند کر کے بیت اللہ محسود کو محترمہ بے نظیر بھٹو کا قاتل تسلیم کرنے سے انکار کر رہی ہے۔ اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ بے نظیر صاحبہ نے دہشت گردی اور انتہا پسندی کی ہمیشہ مذمت کی۔ وہ القاعدہ کی بھی ناقد تھیں لیکن وہ لبرل انتہا پسند نہیں تھیں۔ والد کی پھانسی کے بعد انہوں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو اپنا سب سے بڑا سہارا سمجھا۔ والد اور دو بھائیوں کو کھو دینے کے بعد جب شوہر بھی جیل چلا گیا تو اللہ تعالیٰ ہی کے سہارے انہوں نے تن تنہا جلاوطنی میں اپنے تین بچوں کی پرورش کی۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے بچوں کو قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھایا اور وہ نماز جمعہ کی ادائیگی کیلئے اپنے بیٹے بلاول کو خود دبئی کی ایک مسجد میں لیکر جاتی تھیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو بہت ذہین تھیں۔ انکے مخالفین انہیں چالاک عورت کہتے تھے لیکن میرے خیال میں وہ اندر سے بہت سادہ دل تھیں۔ بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتی تھیں۔ ان کا دل پاکستان سے محبت کے ساتھ بھرا ہوا تھا۔ یہی محبت انہیں پاکستان کھینچ کر واپس لائی۔ امریکا انکی مقبولیت کو پرویز مشرف کے سہارے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا اور بے نظیر صاحبہ وطن کی محبت میں سہارا بننے کیلئے تیار تھیں لیکن آخری دنوں میں ان کا خیال تھا

کہ ان کے ساتھ دھوکہ کیا جا رہا ہے انکی سادہ دلی انکی سب سے بڑی خطا بن گئی۔ وہ اسی سادہ دلی میں ماری گئیں۔ انکے قاتلوں کی نشاندہی باقاعدہ تحقیقات کے بعد کی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ آخری ملاقات میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔ انہیں اپنی نہیں پاکستان کی فکر زیادہ تھی۔ وہ خود کو وفاق کی زنجیر سمجھتی تھیں اور ان کی پارٹی 27 دسمبر کے سانحے کے بعد بھی وفاق کی زنجیر ہے باپ کے بعد بیٹی کی شہادت کا دکھ اس پارٹی کے جیالوں کی ایک بہت بڑی طاقت بن سکتا ہے اور اس طاقت کے ذریعے وہ تمام مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں جو محترمہ بے نظیر بھٹو حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ بچوں، شوہر اور کارکنوں کے علاوہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی سب سے بڑی محبت پاکستان تھی۔ پاکستان سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ تشدد سے گریز کیا جائے اور حقیقی جمہوریت کے قیام کیلئے پرامن سیاسی جدوجہد کو آگے بڑھا کر محترمہ بے نظیر بھٹو اور پاکستان کے دشمنوں کے عزائم خاک میں ملا دیئے جائیں۔

حسن نثار

چوراہا

جانشین؟

بھٹو صاحب عجلت پسند تھے اس لئے زیادہ عرصہ انتظار نہیں کر سکے۔ اب وہ بہت آسودہ ہوں گے کیونکہ ان کی لاڈلی پنکی اپنے شہید بابا کے خوشبو دار خون کی لکیر پر چلتے ہوئے ان کے پہلو میں آرام فرما ہے۔ باپ بیٹی مدتوں بعد سرگوشیاں کریں گے اور ضیاء الحق سے لے کر بیت اللہ محسود تک اب کوئی انہیں جدا نہیں کر سکے گا۔

زیر زمیں بھی روشنی ہو
مٹی میں چراغ رکھ دیئے ہیں

بھٹو صاحب نے ملتے ہی بیٹی کے روشن ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے اس کی ماں کا حال پوچھا ہوگا، ممکن ہے شکوہ بھی کیا ہو کہ اس کو ساتھ کیوں نہیں لے کر آئیں۔ ممکن ہے انہوں نے محترمہ اور مرتضیٰ کے بچوں میں فاصلوں پر بھی دکھ کا اظہار کیا ہو۔ باپ بیٹی دیر تک اس عجیب حقیقت پر بھی ہنستے ہوں گے کہ بھٹو شہید تو متنازعہ شہید تھے جبکہ بینظیر بھٹو غیر متنازعہ شہید قرار پائی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گڑھی خدا بخش میں ان کا آبائی قبرستان اب تک پرانے "المرتضیٰ" یا "70 کلفٹن" کے صحن میں تبدیل ہو گیا ہو جہاں بھٹو صاحب اپنی بینظیر، اپنے شاہنواز اور مرتضیٰ کے ساتھ مل کر ان زمانوں کی یاد تازہ کر رہے ہیں جب یہ سب جواں سال شہداء اکٹھے ہوتے تھے اور پاکستان پر قربان ہونے والے اس خاندان پر قاتلوں کے خاندان کی نظر بد نہیں پڑی تھی۔

شہید باپ اور شہید بیٹی کے ملن پر ماتم کیسا کہ اب ماتم ان کا مقدر ہے...... اس ذہنیت کا مقدر ہے جو بے نظیر کو "سکیورٹی رسک" اور خود کو حب الوطنی کے چمپئن سمجھتے رہے۔ اب "سکیورٹی رسک" تو ختم سمجھیں لیکن "ہائی رسک گیم" شروع ہو چکی ہے۔ جسے کوئی شک ہو وہ جنرل طارق مجید کے اس تبصرے پر غور کرے کہ بینظیر کا قتل پاکستان کے استحکام پر حملہ ہے۔

پاکستان کے کرتوں دھرتوں کیلئے ہی لکھا گیا ہے کہ...... '' لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام۔ مخصوص ذہنیت اس انتہائی نازک مرحلہ پر پارٹی میں توڑ پھوڑ اور جوڑ توڑ سے گریز کرے۔ جتنے '' پیٹریاٹ'' یا شیر پاؤ گروپ '' بننے تھے کافی سمجھو اور دعا مانگو کہ پارٹی بکھرنے سے بچی رہے کہ اگر وفاق کی یہ اکلوتی سیاسی علامت بکھر گئی تو اس کے ساتھ ہی بہت کچھ بکھر جائے گا اور زندگی میں بہت کچھ ایسا ہے جسے طاقت کے بل بوتے پر یکجا اور اکٹھا نہیں رکھا جا سکتا۔ اللہ پاک پیپلز پارٹی کی زخم خوردہ قیادت کو درست اور بروقت فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ قیادت کا خلا اور خلیج بہت ہی خوفناک ہے محترمہ سے آدھے قدو قامت کی شخصیت بھی دور دور تک دکھائی نہیں دیتی اور یہی وہ مقام ہے جہاں افراد اور اداروں کے صحیح مقام و معنی سمجھ آتے ہیں کہ جہاں معاملات اداروں کی بجائے شخصیات کے گرد گھوم رہے ہوں وہاں اندھیرے چھا جاتے ہیں اور کسی کو کچھ سمجھ نہیں آتی کہ ہوگا کیا؟

پیپلز پارٹی عملاً جوہراً، خالصتاً بھٹو خاندان کا سیاسی نام ہے اور لوگ کسی '' غیر بھٹو'' کو قائد کے طور پر قبول نہیں کریں گے اور اگر کرینگے بھی تو یہ موثر نہ ہوگا نہ دیرپا۔ بلاول، بختاور، آصفہ '' زرداری'' ہیں اور بہت کم عمر بھی ...... دوسری طرف فاطمہ بھٹو اور ذوالفقار علی بھٹو جونیئر ہیں جو جنگ تخت نشینی سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ آصف زرداری کی ذاتی سیاسی قربانی کی داستان بھی طویل ہے اور وہ اپنی شہید شریک حیات کا عظیم سیاسی ورثہ خود سنبھال کر کسی مناسب وقت پر اپنے کسی بچے کو منتقل کرنا چاہیں گے تو انجام؟ نتیجہ؟

یہاں مجھے سکندر اعظم کی یاد آتی ہے جو بستر مرگ پر تھا جب کسی نے پوچھا...... '' سکندر! دنیا کی یہ عظیم ترین سلطنت تم کس کے لئے چھوڑ کر جا رہے ہو؟ سکندر نے کچھ دیر سوچا، مسکرایا اور پھر زیر لب کہا۔

'' طاقت ور ترین کے لئے''

جانشینی جیسے گھمبیر مسئلہ کا ایک دیرینہ، آزمودہ اور تاریخی حل تو یہ ہے کہ اسے دعویداروں کی طاقت اور ذہانت پر چھوڑ دیا جائے کہ جو بہتر ہوگا وہ خود ہی سنبھال لے گا لیکن اس

پراسیس میں شکست و ریخت بہت ہوتی ہے جبکہ پارٹی تو اپنی جگہ ......موجودہ مضمول پاکستان بھی شاید پارٹی میں پراگندگی کا متحمل نہ ہو سکے اس لئے ملک اور پارٹی کے بڑوں کو بڑاپن دکھاتے ہوئے دانش وحکمت سے مختلف مراحل گزارنے ہوں گے......حکومت کیلئے بہتر ہوگا کہ نگرانوں کو چلتا کر کے ''قومی حکومت'' کا ڈول ڈالے اور یہ واقعی ''قومی حکومت'' ہو کوئی نیا ڈرامہ نہیں اور پیپلز پارٹی کی قیادت کو کیا کرنا چاہیے؟ وہ خود بہتر جانتے ہوں گے لیکن اتنا جان لیں کہ فیصلہ وہی دیر پار ہے گا جو''جینوئین'' ہوگا۔آخر پر ایک پچھتاوا کہ محترمہ کیلئے لاہور میں ایک یادگار ڈنر میجر (ر) ککی نے دیا جو میرے بھائیوں جیسے ہیں......میں نے معذرت کر لی......پھر عید کے اگلے روز برادرم رحمٰن ملک نے فون کر کے محترمہ کی طرف سے نیک خواہشات کا پیغام پہنچایا تو میں نے بھی جواباً اور رسماً شکریہ ادا کر دیا......کاش میں اس ڈنر پر گیا ہوتا اور محترمہ سے مل لیا ہوتا......کاش میں نے رحمٰن ملک کے ذریعہ پہنچنے والی نیک خواہشات کے جواب میں خود محترمہ کو فون کر کے ان کا شکریہ ادا کیا ہوتا لیکن وہی منیر نیازی والی بات کہ......ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں''

لیکن محترمہ نے جلدی کر دی۔اب حکومت دیر نہ کرے۔پیپلز پارٹی کی قیادت بھی دیر نہ کرے۔ملک پہلے ہی''لیٹ'' ہے۔

خالد حسن

بے نظیر اور ان کے بدخواہ

بے نظیر کے انتقال کا سوگ اس ملک میں بے شمار لوگ منا رہے ہیں۔ انہوں نے بڑی آسانی سے دوست بنائے اور وہ انہیں دوست رکھنے کا فن بھی خوب جانتی تھیں۔ انہوں نے اپنے لڑکپن کا دور طالبہ کے طور پر امریکہ میں گزارا اور ان دنوں کے رابطے بھی برقرار رکھے۔ ان کی موت پر بہت کچھ کہا اور لکھا جاتا رہے گا۔ ان کی ذہانت ان کے حوصلے ان کے عزم اور ان کے حسن کو سراہا جا رہا ہے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے ان کی موت کے بعد ان پر تنقیدی حملے شروع کر دیئے۔

کچھ تنقیدی حملے ان لوگوں کی طرف سے کئے گئے ہیں جنہیں وہ محض جان پہچان والے نہیں بلکہ اپنے سالہا سال کے دوست سمجھتی تھیں۔ وہ ان بدخواہوں کو جواب دینے کے لئے ہمارے درمیان موجود نہیں اور اگر وہ زندہ ہوتیں تو بھی خاموش رہتیں جیسا کہ تنقیدی حملوں پر وہ کیا کرتی تھیں۔ لیکن اس پر آپ ضرور حیران ہوں گے۔ کچھ لوگوں کے لئے سیاستدان اور انسان میں تمیز ذرا مشکل ہوتی ہے۔ سیاست کا ہمیشہ ایک انسانی پہلو ہوتا ہے۔ لوگ اناڑی نہیں ہوتے۔ وہ اپنے لیڈروں کی ناکامیوں، کجیوں اور کمزوریوں کو جانتے ہیں۔ لیکن انہیں اس لئے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ انہیں ان کی وسیع تر حیثیت میں دیکھتے ہیں۔ امریکی عوام جب جان ایف کینیڈی کے قتل پر روئے تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ انکی ذاتی ناکامیوں حتیٰ کہ ان کی شہ خرچیوں سے واقف نہیں تھے۔ پھر بھی رنج والم اور ناقابل اظہار نقصان کی اس گھڑی میں انہوں نے سب کچھ ایک طرف رکھ دیا۔ تاریخ شاید عظیم عوامی شخصیات کے سمجھوتوں اور فیصلوں کی غلطیوں کی بہت زیادہ پرواہ نہیں کرتی۔ ان لوگوں نے جو کچھ حاصل کیا اور جو کچھ اپنے پیچھے چھوڑ گئے وہ زندہ رہ جاتا ہے۔

بے نظیر بھٹو کے والد ذوالفقار علی بھٹو کو لے لیں۔ آج تک ایسے لوگ موجود ہیں جو انہیں اس وجہ سے یاد کرتے ہیں کہ وہ مے نوشی کرتے تھے۔ یہی وہ پلیٹ فارم تھا جس کے

ذریعے 1977ء کے انتخابات کے دوران اور پی این اے کے احتجاجی مظاہروں میں ان پر تنقیدی حملے کئے جاتے تھے۔ بائیں بازو والے بھٹو کو اس لئے معاف نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ ان کے خیال میں سوشلزم کے حقیقی راستے سے ہٹ گئے۔ دائیں بازو والے انہیں مجسم شیطان سمجھتے تھے۔ لیکن پاکستانی دیہات میں کتنے لوگ ہیں جو بھٹو کی ذاتی زندگی کے بارے میں پرواہ کرتے ہیں؟ ان کی موت کے تقریباً تیس سال بعد بھی وہ غریب کے حقوق اور محروم واستحصال زدہ عوام کے وقار کی زندہ علامت ہیں۔ پاکستانی عوام کے ذہنوں میں وہ ایک شہید کی مانند زندہ ہیں جسے ایک فوجی آمر نے ناانصافی سے پھانسی پر لٹکا دیا۔

بے نظیر کی موت کو دس بارہ دن ہوئے ہیں اور ان پر تنقیدی حملے شروع ہو گئے ہیں۔ میرے ایک دوست شجاع نواز مجھے کہنے لگے، مجھے ان کے بارے میں اچانک ہی منظر عام پر آنے والی بھونڈی تحریریں اچھی نہیں لگیں۔ ان میں سب باتیں تو ٹھیک نہیں۔ بے نظیر پاکستان کے لئے زندہ رہیں اور پاکستان کے لئے مر گئیں۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے کہ کچھ لوگ جو ان کے قریبی دوست سمجھے جاتے تھے اور جن سے وہ اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں مشورے لیتی رہیں کھلم کھلا ان کے خلاف بول رہے ہیں۔ انکے بارے میں لکھی گئی بعض تحریریں تو گھٹیا حد تک توہین آمیز ہیں۔ مجھے بار بار یاد آرہا ہے کہ جب پرویز مشرف نے نواز شریف کا تختہ الٹا تھا تو لکھاری قبیلے کے چند لوگوں کا یہاں تک خیال تھا کہ پاکستان کے لئے جنرل مشرف سے اچھا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایک نے تو ایک اخبار کے آرٹیکل میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اس بار آرمی کو سول سوسائٹی کے ساتھ مل کر سیاست دانوں کا پھیلایا ہوا گند صاف کرنا چاہیے۔

نیویارک کے ایک جریدے نے تو خاص طور پر بے نظیر کے بارے میں ایک غلط تحریر شائع کی جس میں انہیں ایک ایسی شخصیت قرار دیا گیا جسے اوسط درجے کے پاکستانی کی بہتری سے زیادہ اپنے اقتدار کی فکر تھی۔ اس تحریر کے مصنف کا نام میں نہیں جانتا اور نہ ہی میں جاننا چاہتا ہوں اور بہت سی باتیں جو اس نے لکھیں انہیں یہاں دہرانا بھی مناسب نہیں سمجھتا

زیادہ پرانی بات نہیں اسی مصنف نے امریکی حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ ''استحکام کی خاطر مسلم دنیا کا نقشہ بدل دے، عراق کو تقسیم کر کے آزاد کردستان قائم کر دے، پاکستان کو توڑ کر آزاد بلوچستان قائم کر دے اور سرحد کو افغانستان کے حوالے کر دے۔ صاف سی بات ہے کہ پاکستان کے بارے میں اس کا وژن وہ نہیں جو بے نظیر بھٹو کا تھا۔ میں یہاں یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ بہت سے پاکستانیوں کے ہاتھوں یہ غلیظ مواد انٹرنیٹ پر زیر گردش رہا۔ نئی دہلی میں مقیم ولیم ڈارلمپل کے خیالات بعنوان بے نظیر کا ''مہلک ورثہ'' نیویارک ٹائمز میں شائع ہونے والے جان ایف برنز کے تعزیتی کلمات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ایک سابق استعماری، راج، کے پرانے علاقوں کے عوامی لیڈروں کو اس طرح نہیں دیکھتا جس طرح ہم دیکھتے ہیں؟ ولیم ڈارلمپل تسلیم کرتا ہے کہ محترمہ سے اس کی ملاقات کو وہ اپنے آرٹیکل میں حوالے کے طور پر مختلف جگہوں پر استعمال کرتا ہے تمام تاریخی شخصیات کی طرح بے نظیر بھٹو کا ورثہ بھی ملا جلا ہے لیکن اسے پاکستان کے حقائق کے تناظر میں ہی پیش کیا جانا چاہیے۔ ان کے بغیر نہیں۔ جان برنز کے تعزیتی کلمات ہوں یا ولیم ڈارلمپل کی تحریر کسی میں اس اصل جنگ کی وضاحت نہیں کی گئی جو بے نظیر بھٹو نے ملک کی غالب مزاج فوج اور اس کی دخل اندازانٹیلی جنس ایجنسیوں کے خلاف پاکستانی سول سوسائٹی کی نمائندہ کے طور پر لڑی۔ 1994ء میں شائع ہونے والی ایک تحریر میں ولیم نے بے نظیر بھٹو کے اردو لہجے کا مذاق اڑایا تھا اور اسے یہ بات عجیب لگی تھی کہ انہیں ایک خاص طرح کی آئس کریم اچھی لگتی ہے جو ولیم کے نزدیک یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ جاگیر دار شہزادی تھیں۔ پھر کچھ ایسے مغربی مبصرین ہیں جن کے اپنی حکومتوں اور ان کی انٹیلی ایجنسیوں کے ساتھ قریبی رابطے ہیں۔ وہ ایک الگ طبقہ ہیں۔ ارناڈ ڈی بورشگریو کو ہی لے لیں جو تقریباً ہر ہفتے پاکستان کا شیرازہ بکھرنے کی پیش گوئی کرتا رہتا ہے۔ اس نے واشنگٹن میں کئی بار بے نظیر سے ملاقاتیں کیں اور وہ اپنی تحریروں میں نامعلوم ذرائع کے حوالے سے خوب مرچ مسالے لگا تا رہتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اسامہ بن لادن پشاور کے علاقے

حیات آباد میں مقیم ہے وہ یہ نہیں بتا تا کہ ابھی تک وہ پچاس ملین ڈالر کا انعام اسے کیوں نہیں ملا جو اسامہ بن لادن کے سر کی قیمت ہے۔ پرویز مشرف فوج اور آئی ایس آئی کے بارے میں اپنی پے در پے تحریروں کے بعد اس بار اس نے ''احمقستان'' کے عنوان سے شائع ہونے والے اپنے آرٹیکل میں آصف زرداری کو تختہ مشق بنایا۔ بورشگریو کی سیاسی سوجھ بوجھ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ فاروق لغاری کو ''مسٹر کلین'' کے لقب سے نوازتا ہے اور وہ ان کے نزدیک پاکستان کے مستقبل کے لئے امید کی کرن ہیں۔ بورشگریو کے لب لباب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے بقول جیسے صدر مشرف کی قیادت میں پاکستان کی ناؤ ڈوبی ہوئی ہے۔ اسی طرح ڈوبی ہی رہے گی کیونکہ اس کی سب سے بڑی سیاسی جماعت نے آصف زرداری کو اپنا لیڈر چن لیا ہے۔ میں یہاں اتنا کہنا چاہوں گا کہ پاکستان میں بورشگریو کے ذرائع میں سے ایک جنرل حمید گل ہیں جس کا وہ اکثر اعتراف کرتا رہتا ہے۔ مزید کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟ شاید ہمیں اس کی بات سن لینی چاہئے اور اپنے موجودہ اور مستقبل کے صدر کے طور پر فاروق لغاری کو مکھن لگانا چاہئے اور انہیں ''ڈیوک آف چوٹی'' کا خطاب بھی ضرور دینا چاہئے۔

خالد مسعود خان

کٹہرا

Enough is Enough

تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک مسلسل مختلف ٹی وی چینلز دیکھنے کے بعد میں خاموشی سے اٹھا اور گھر سے باہر چل پڑا۔ ابھی رات کے تقریباً 9 بجے تھے مگر سڑک سنسان تھی۔ اتنی سنسان کہ مجھے ہلکا سا خوف محسوس ہوا۔ بوسن روڈ پر پہنچا تو وہاں اس سے بھی زیادہ ویرانی تھی۔ اندرونی سڑک پر تو گھروں کے باہر لگے بلب روشنی دے رہے تھے مگر بوسن روڈ پر تقریباً بلیک آؤٹ کا سا منظر تھا۔ چھ نمبر چونگی پر ٹائر جلنے کی بو تھی اور اکا دکا گزرنے والی گاڑیاں، موٹر سائیکل اور رکشے تھے۔ میں چھ نمبر چونگی سے جلال مسجد کی طرف مڑ گیا۔ میں نے یہ سڑک کبھی کرفیو کے عالم میں نہیں دیکھی تھی۔ مگر میں تصور کر سکتا تھا کہ اس سڑک پر کرفیو لگا دیا جاتا تو یہ بالکل اسی طرح ہوتی جس طرح اس وقت نظر آ رہی تھی۔ پوری سڑک پر میں واحد ذی روح تھا جو چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے میں اس سڑک پر پیدل جا رہا تھا۔ تمام دکانیں، ریڑھیاں، پھٹے، سٹریٹ لائٹس حتیٰ کہ گھروں کی باہر والی لائٹیں بھی بند تھیں۔ دور دور تک کہیں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ جیب میں بجنے والی موبائل فون کی گھنٹی بجی تو اس سناٹے اور سکوت میں میرے قدموں کی چاپ کے علاوہ یہ دوسری آواز تھی جو میرے کانوں میں آئی۔

فون کی دوسری سمت میاں تھا۔ پوچھنے لگا کہ میں کہاں ہوں؟ میں نے بتایا کہ سڑک پر ہوں۔ اس نے دوبارہ پوچھا کہ یہاں کیا حال ہے؟ میں نے بتایا کہ فضا میں ربڑ جلنے کی بو ہے، ٹائروں میں لگی آگ بجھ چکی ہے یا بجھا دی گئی ہے۔ میں ایک سنسان اور کرفیو زدہ ٹائپ اندھیری سڑک پر تنہا ہوں۔ یہ وہ سڑک ہے جسے میں نے کبھی رات کے پچھلے پہر بھی اس حالت میں نہیں دیکھا۔ میاں کہنے لگا جہاں محترمہ بے نظیر بھٹو جیسی مقبول لیڈر دو مرتبہ کی سابق وزیراعظم پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کی چیئر پرسن اتنی سخت سکیورٹی کے باوجود محفوظ نہ ہو وہاں تم اس عالم میں ایک ایسی سنسان، ویران، اندھیری اور غیر محفوظ سڑک

پر پیدل چل رہے ہو؟ جہاں تھوڑی دیر قبل آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے، کیا تمہارا دماغ درست ہے؟ میں نے اسے دکھی ہو کر کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارا دماغ ہی تو درست نہیں اگر ہمارا دماغ درست ہوتا تو آج پورا ملک اس طرح اندھیری گلی میں نہ کھڑا ہوتا جس طرح میں یہاں تنہا کھڑا ہوں میاں نے مجھے فوراً واپس گھر جانے کا کہا اور فون بند کر دیا۔

محترمہ بینظیر بھٹو اور پیپلز پارٹی سے بے شمار اختلافات رکھنے کے باوجود میں ان کی پاکستان کے سیاسی منظر نامے میں موجودگی کا شدید حامی تھا اور بے نظیر یا پیپلز پارٹی کے بغیر ہونے والی کسی بھی سیاسی پیش رفت کو کسی صورت تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔ بے نظیر بھٹو کا ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی سے شروع ہونے والا آنسوؤں کا یہ سیاسی سفر لیاقت باغ کی خونی جلسہ گاہ میں ختم ہو گیا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں لیاقت علی خان کو قتل کیا گیا اور پھر اس سیاسی جلسہ گاہ کو ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں اپوزیشن کے جلسہ پر ہونے والی حکومتی فائرنگ اور درجنوں افراد کی ہلاکت نے شہرت بخشی۔ بے نظیر بھٹو کی زندگی کا سفر ستائیس دسمبر 2007ء کو اس جلسہ گاہ کے دروازے پر ختم ہوا مگر یہ محض ایک شخص کی ہلاکت کا معاملہ نہیں کہ چار چھ دن میں وقت کی دھول تلے دب جائے۔ یہ شاید پاکستان کی تاریخ کا سب سے ہولناک قتل ہے۔ جس کے اثرات اتنے خوفناک ہو سکتے ہیں کہ جس کا تصور بھی شاید قاتلوں کے گمان میں نہیں ہو گا۔ بے نظیر کا ملکی تاریخ کے اس نازک موڑ پر ہونے والا قتل اپنے نتائج کے اعتبار سے لیاقت علی خان، ذوالفقار علی بھٹو اور اکبر بگٹی کے قتل سے کہیں بڑا سانحہ ہے۔ جس سے ملکی سلامتی کو حقیقی خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

27 دسمبر کو ہی دوپہر کے وقت میں ایک انتہائی باخبر دوست کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور 8 جنوری کو ہونیوالے الیکشن کے حوالے سے بات ہو رہی تھی۔ میرے اس دوست کا کہنا تھا کہ الیکشن کا انعقاد ابھی بھی مشکوک ہے اور اس کے موخر ہو جانے کے امکانات ہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ نواز شریف یا بے نظیر الیکشن کا بائیکاٹ کر سکتے ہیں۔ وسیع پیمانے پر قتل و غارتگری یا ہلاکتیں ہو سکتی ہیں۔ تاہم اگر الیکشن ہو بھی گئے تو زیادہ دیر چلیں

گے نہیں۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا اس وقت بظاہر صورتحال ایسی ہے کہ کسی سیاسی پارٹی کو قطعی اکثریت ملنے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تاہم پیپلز پارٹی اس الیکشن میں بقیہ سیاسی پارٹیوں کی نسبت بہتر پوزیشن میں ہے۔ بے نظیر بھٹو دیگر پارٹیوں سے نسبتاً زیادہ سیٹیں لینے کے باوجود وزیراعظم نہیں بن سکیں گی کیونکہ ان کے پاس بہرحال دو تہائی اکثریت نہیں ہوگی کہ وہ آئین میں ترمیم کر کے تیسری بار وزیراعظم بننے پر پابندی کی شق کو ختم کر سکیں۔ دوسری بڑی پارٹی ق لیگ ہے اس کے چوہدری صاحبان خود وزارت عظمیٰ کے امیدوار ہیں بھلا وہ اپنے ہاتھ کس طرح کاٹ سکتے ہیں؟ وہ اس آئینی ترمیم کے لئے بے نظیر بھٹو کی رتی برابر امداد نہیں کریں گے ایم کیو ایم صدر صاحب کے اشارے کو دیکھے گی اور صدر صاحب کبھی بھی یہ اشارہ نہیں کریں گے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا کہ امریکی احکامات پر بے نظیر بھٹو سے 27 جولائی کو متحدہ عرب امارات میں ملاقات کرنے والے، قومی مصالحتی آرڈیننس پیش کرنے والے روشن خیال صدر بھلا کیوں نہ چاہیں گے کہ بے نظیر بھٹو تیسری بار وزیراعظم بن سکیں؟ وہ دوست ہنسا اور کہنے لگا اب اگر امریکی احکامات صدر صاحب کے لئے مشکلات کا باعث بن رہے ہوں تو بھلا وہ انہیں کیوں مانیں گے۔ صدر صاحب میر ظفر اللہ جمالی، چوہدری شجاعت حسین اور شوکت عزیز قسم کے وزیراعظموں کے ساتھ کام کر چکے ہیں اور وہ شریک اقتدار وزیراعظم نہیں بلکہ تابعدار وزیراعظم کے ساتھ کام کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ وہ عوامی طاقت رکھنے والی ایک اچھی وزیراعظم کے ساتھ کیسے کام کر سکتے ہیں جو نہ صرف یہ جانتی ہو کہ وزیراعظم کی پارلیمانی جمہوری نظام میں کیا طاقت اور اختیارات ہوتے ہیں بلکہ ان کا دو مرتبہ کا ذاتی تجربہ بھی رکھتی ہو۔ پھر وہ بھٹو خاندان سے تعلق رکھتی ہو جو کلی اقتدار کے حصول کے عادی ہیں۔ بھلا یہ بیل کس طرح منڈھے چڑھ سکتی ہے؟ میں نے پوچھا آخر ہوگا کیا؟ وہ کہنے لگا لولی لنگڑی پارلیمنٹ، ڈیڑھ دو سال کی جوت پیزار اور پھر دوبارا الیکشن۔ میں نے کہا کوئی اور آپشن؟ وہ ہنسا اور کہنے لگا جب تک شریف الدین پیرزادہ زندہ ہے تب تک تو کچھ بھی ہو سکتا ہے جو کسی صاحب ہوش

وخرد کے وہم وگمان میں بھی نہ ہو۔

بے نظیر کے اندوہناک قتل کی خبر سن کر میں سکتے میں آ گیا اور کافی دیر تک تو سمجھ ہی نہ آئی کہ کیا ہو گیا ہے۔ پھر دل سے پاکستان کی سلامتی کے لئے دعا نکلی کہ اس قتل کا سب سے زیادہ اثر پاکستان پر پڑے گا۔ اس قتل سے پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو کے اہل خانہ سے بھی زیادہ متاثر ہوا ہے۔ میں نے اپنے اسی دوست کو فون کیا اور پوچھا کہ اب وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ وہ کہنے لگا تم نے وہ بیان سنا ہے؟ جس میں تیسرے سندھی وزیر اعظم کے قتل کی بات کہی گئی ہے۔ اکبر بگٹی کے قتل کے بعد بلوچستان اور اب بے نظیر کے قتل سے سندھ میں منافرت کی وہ آگ بھڑکے گی کہ اسے ٹھنڈا کرنا ناممکن نہیں تو ازحد مشکل ضرور ہوگا اور یہ کام کوئی ریٹائرڈ جنرل نہیں کر سکے گا۔ میں نے پوچھا کہ اس قتل کا ذمہ دار کون ہو سکتا ہے۔ وہ کہنے لگا صدر صاحب حسب معمول اس کا ملبہ مذہبی انتہا پسندوں پر ڈالیں گے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ مذہبی انتہا پسند اگر تنگ تھے تو وہ پچھلے چھ سالوں میں صاحب اقتدار لوگوں سے تنگ تھے۔ امریکی احکامات کی تعمیل کرنے والوں سے تنگ تھے۔ امریکی خدمت گزاروں سے تنگ تھے، ان کی پہلی ترجیح بے نظیر بھٹو نہیں اور کئی لوگ ہونے چاہئیں۔ بھلا وہ صرف بے نظیر بھٹو کے پیچھے ہی ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہیں؟ یہ بلاشبہ انہی لوگوں کا کام ہے جو وسیع تر قومی مفاد کے نظریے کے تحت ہر مسئلے کا ایک شارٹ کٹ نکالتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شارٹ کٹ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ قوم برسوں تک اس شارٹ کٹ کے نتائج بھگتنے کے باوجود منزل تک نہیں پہنچ پاتی۔ سانحہ کارساز کے ذمہ داروں کا کیا پتہ چل سکا ہے؟ تحقیقات مکمل ہونا تو ایک طرف رہا ڈیڑھ سو افراد کی ہلاکت جیسے سانحے پر ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ ایک ہی واقعے کی دو ایف آئی آر درج ہو سکتی ہیں یا نہیں ہو سکتیں۔ معاملات سلجھانے کے بجائے مزید الجھائے جا رہے ہیں اور ان خرابیوں کی سو فیصد ذمہ داری حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے نہ کہ انتہا پسندوں پر۔ کیونکہ انتہا پسندوں پر قابو پانا بھی حکومت کا کام ہے اور حکومت اس میں مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے اب اس کام کے لئے حکومت کو غیر

معینہ مدت تک کا وقت بہر حال نہیں دیا جا سکتا۔ ہم پچھلے ایک عرصے سے مسلسل کنویں سے
پانی تو نکال رہے ہیں مگر کنویں سے مردہ جانور نہیں نکال رہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ
...ت پیدا ہوئے صورتحال ڈکٹوکری بات یہ کہ 3 نومبر ہوئے پہلے ایمر کہنے لگا زخم کاری ہے اور اگر ملک ...

عدلیہ بحال کر کے محترمہ بے نظیر بھ... ...ٹو کے اندوہناک قتل کی تحقیقات کے لئے چیف جسٹس
افتخار محمد چوہدری کی سربراہی میں ا... ...یک عدالتی کمیشن بنایا جائے۔ قوم اس کے علاوہ اور کسی
کمیشن یا کمیٹی پر اعتبار نہیں کرے گ... ...ں۔ یہ فیصلہ کن اقدامات کی گھڑی ہے اور اس مرحلے پر
تاخیر، گومگو یا خاموشی ملک کی سلامتی... ...کے لئے زہر قاتل ہوگی۔

خورشید ندیم

تکبیر مسلسل

پاکستان کی بیٹی

کسے معلوم تھا کہ یہ بے نظیر کا آخری کھانا ہے۔ اس نے دستر خوان سے ایک نان اٹھایا اور کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ’’مجھے شوربا چاہیے‘‘۔ اس کی آواز سن کر بابر اعوان نے

بھٹو خاندان کی سیاسی داستان کا آخری باب سناتے سناتے ڈاکٹر بابر اعوان یہیں تک پہنچے تھے کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔ میں ان کی سسکیاں سن رہا تھا اور قلم میرے ہاتھ میں خاموش تھا۔ الفاظ آپ کی گرفت میں ہو سکتے ہیں لیکن جذبات الفاظ کے قابو میں کہاں آتے ہیں۔ دو دن سے جذبات کسی کے قابو میں نہیں۔ چاہنے والوں کا اضطراب تو سمجھ میں ... صف ماتم بچھی ہے؟

اس کی آخری تقریر، اس کے آخری الفاظ میرے کانوں سے ٹکرانے لگتے ہیں۔ ان ... لفظوں میں میرا پاکستان ہے ان میں میرے پنجاب کے لیے محبت ہی محبت ہے۔ ان میں ... میرے راولپنڈی کے لیے نیک تمنائیں ہیں وہ میرے بچوں کے لیے ایک یونیورسٹی بنانے کا وعدہ کر رہی ہے۔ یہی نہیں وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا فخر سے ذکر کر رہی ہے۔ و ... مسرت

سے کہہ رہی ہے کہ میزائل پروگرام اس نے شروع کرایا تھا۔ وہ میرے پاکستان کو درپیش خارجی خطرات ہی کی بات نہیں کر رہی، داخلی خطرے سے بچانے کا عزم بھی کر رہی ہے۔ وہ خطرہ جو پورے پاکستان کو درپیش ہے لیکن آج بطور خاص اس کے اپنے وجود کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ اب بات میری سمجھ میں آنے لگی ہے۔ میری ماں کے آنسوؤں کا مفہوم مجھ پر واضح ہو رہا ہے۔ دوستوں کے اضطراب کی گرہیں بھی کھل رہی ہیں۔ مخالفین کا دکھ بھی اب میں جان سکتا ہوں کسی کے لیے اب یہ راز نہیں رہا کہ اس کا دل صرف سندھ کیلئے نہیں پنجاب کیلئے بھی دھڑکتا تھا، وہ سرحد اور بلوچستان کے لیے بھی پریشان تھی۔ وہ وفاق کی علامت تھی۔ لیکن کیا وہ وفاق کی آخری علامت تھی؟ یہی سوال چاہنے والوں کے سامنے ہے اور مخالفین کے بھی۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان کے اضطراب میں کمی نہیں آ رہی۔

بے نظیر نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز سرحد کے شہر مردان سے کیا۔ سرحد سے ہوتے ہوئے اس نے بلوچستان کا رخ کیا۔ اسی دوران میں کوئٹہ چھاؤنی میں خودکش حملہ ہوا اور 21 افراد اس کی نذر ہو گئے۔ سب نے اسے کوئٹہ جانے سے روکا لیکن اس کا کہنا تھا ''بلوچستان میری زندگی سے زیادہ اہم ہے سب نے بلوچستان کو اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ میں نہیں چھوڑوں گی''۔ پھر گاما سٹیڈیم میں اس نے ہزاروں افراد کے سامنے پاکستان، قائداعظم اور مکالمے کی بات کی۔ اس نے کہا ''بلوچستان کے لوگ میرے لیے سب سے زیادہ عظیم ہیں۔ انہیں کسی نے فتح نہیں کیا، یہ اپنی مرضی سے پاکستان کا حصہ بنے ہیں۔'' اس کا کہنا تھا کہ میں نے 1989ء میں بلوچستان کے جلاوطن راہنماؤں کو واپس بلایا اور ان سے مذاکرات کیے۔ آج میں پھر مکالمے کا دروازہ کھولنا چاہتی ہوں۔ اس نے طلال بگٹی کے گھر کا رخ کیا تو وہاں گرنیڈ پھینکے گئے۔ اس کے باوجود وہ اس کے گھر پہنچی۔ بے نظیر نے گولیوں کے زخموں پر اپنی محبت کا مرہم رکھا۔ وہ ٹوٹنے والوں کو ایک بار پھر پاکستان کے ساتھ جوڑنے گئی تھی۔ بلوچستان کی آزاد فضاؤں میں کئی برس بعد پاکستان اور قائداعظم کا محبت کے ساتھ ذکر ہوا۔

بلوچستان اور سندھ میں ... پورے پاکستان نے سوگ میں لیا

بے نظیر نے دل سے پاکستان

ہے جیسے اس کے گھر کا کوئی فرد

سیاسیات کے ایک طالب علم کی

عدہ ہے یا بابرا خوان نے

سے خطرہ تھا۔ شاید ہم کبھی

انکار نہیں کرسکتا کہ وہ

پسندی کو پاکستان کے

میں ان کی جان جاسکتی

ست دان ایسا نہیں ہے

برسر پیکار ہو جس نے

اتی مریض بنا دیا ہے۔

عام آدمی کی طرح اس

دیے۔ فاسقی یین انمد حلے ...

اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ سب کچھ رسمی نہیں ہے۔ یہ دکھ حقیقی ہے۔

کو چاہا اور آج ہر پاکستانی بھی اسی طرح اس کے لیے افسردہ

دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ میرے دکھ کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ سیا

جاتا ہے یا ہم اسے مار دیتے ہیں۔ بے نظیر کو کس نے مارا؟ یہ الفا

الفاظ میں کوئی ''الفائدہ'' ہے جس کے سیاسی مفادات کو بے نظیر سے

بھی اس سوال کا جواب تلاش نہ کرسکیں۔ تاہم ایک بات سے کوئی

پاکستان کی واحد سیاسی راہنما تھیں جنہوں نے دہشت گردی اور انتہا

استحکام کے لیے سنگین خطرہ قرار دیا اور یہ جانتے ہوئے کہ اس معرکے

ہے، وہ اس کے خلاف میدان میں نکلیں۔ ان کے بعد کوئی ایک سیا

جو ان کی طرح یہ جرات رکھتا ہو کہ وہ اس انتہا پسندی کے خلاف

مسلمان معاشرے بالخصوص ہمیں برباد کردیا اور سولہ کروڑ عوام کو نفسیا

بے نظیر اپنے نامہ اعمال کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوگئی۔ میری اور ہر

میں خوبیاں بھی تھیں اور خامیاں بھی۔ تاہم اپنی موت سے اس نے ایک بات آخری درجے میں ثابت کردی ہے کہ وہ پاکستان کی بیٹی تھی اور اندر سے ایک عام پاکستانی کی طرح تھی جو شوربے کے ساتھ نان کھاتا اور قرآن کو اپنے سینے سے لگاتا ہے یہ الگ بات ہے کہ جانتے بوجھتے سوئے مقتل کوئی کوئی جاتا ہے۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

زاہدہ حنا

نرم گرم

شہادت کا سرخ دوشالہ

کل خوابوں کی روشنی سے دمکتا ہوا آسمان کی طرف دیکھتا ہوا سوالی چہرہ تھا دعا کے لیے اُٹھے ہوئے آرزومند ہاتھ تھے۔ فضاؤں میں گونجتی ہوئی اس کی آواز تھی جو وجد کے عالم میں زندگی کا نعرہ مستانہ لگاتی تو لاکھوں لوگ اس آواز کے آہنگ پر رقص کرتے تھے۔

آج خواب دیکھتی ہوئی وہ آنکھیں بے خواب ہوئیں دعا مانگتے وہ ہاتھ شل ہوئے دلوں میں امید کے چراغ جلاتی ہوئی وہ آواز بجھ گئی۔ اس نے سندھ کے سرمد، صوفی عنایت اور ذوالفقار علی بھٹو کی راہ پر چلتے ہوئے شہادت کا سرخ دوشالہ اوڑھا اور اپنے جاں نثاروں کے شوروشین اور گریہ وبین کی گونج میں تہہ خاک نیند پوری کرنے چلی گئیں۔

اب زمیں کا پیار باقی ہے فقط
آسماں کی مہر بانی دیکھ لی

اس کا سوگ صرف اس کے ماتم داروں نے ہی نہیں منایا ملک کے کروڑوں دل فگاروں کی آنکھوں نے اسے بہ چشم نم رخصت کیا۔ اگر اس کے چاہنے والوں کا یہ عالم تھا کہ نہ صبر ہے، نہ ہوش ہے، نہ تاب وتواں ہے تو وہ بھی تھے جو اس سے سیاسی اور نظریاتی اختلاف رکھتے تھے مگر وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ

''جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے''

بے نظیر بھٹو کہنے کو پیپلز پارٹی کی رہنما تھیں لیکن ان کے سفاکانہ قتل نے سارے ملک کو دہشت زدہ اور دل آزردہ کر دیا، اس قتل کی گونج ساری دنیا میں سنی گئی اور ملکوں ملکوں ان کا سوگ منایا گیا۔ ایسے جیتے جاگتے خواب دیکھتے اور خواب دکھاتے ہوئے رہنماؤں کی پیدائش کسی بھی سماج کے لیے وقت کی عطا اور اس کی جودوسخا ہوتی ہے لیکن ہمارے یہاں وہ

حاکم شام پائے جاتے ہیں جو ہر دس بیس برس بعد ایسے رہنماؤں کو اپنے اور اپنے ادارے کے اقتدار پر سے صدقہ کر دیتے ہیں۔ ہمارا ایک منتخب وزیر اعظم متنازع عدالتی فیصلے کی سولی پر چڑھایا گیا، ہماری دو مرتبہ وزیر اعظم منتخب ہونے والی قومی رہنما کو قتل کیا گیا پھر اس کا قتل نامہ القاعدہ کے نام درج ہوا اور دو مرتبہ منتخب ہونے والا ہمارا تیسرا وزیر اعظم جلاوطنی اور ذلت وتوہین کے جہنم میں بلایا گیا اس پر قاتلانہ حملہ کرایا جاتا ہے اور اس کے سامنے بھی صبح وشام اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کی جاری کردہ وہ مبینہ ہٹ لسٹ لہرائی جاتی ہے یہ سب کچھ اپنے اقتدار مطلق کا اعلان ہے۔ اس بات پر اصرار ہے کہ جمہوریت، آئین اور آزاد عدلیہ کا نام لے کر بلڈی سویلینز ہمارے اقتدار کے لیے خطرہ نہ بنیں ورنہ ہم ایک ایک کو درس عبرت بنا دیں گے۔

وزارتِ داخلہ کے ترجمان اپنے خشک ہونٹوں پر ہر پانچ سیکنڈ بعد زبان پھیر کر کیسی کمال کہانیاں سناتے ہیں پہلے یہ کہانی سنائی گئی کہ بے نظیر خودکش حملے کا شکار ہوئیں، پھر کہا گیا کہ اس خوف ناک دھماکے سے ان کی حرکت قلب بند ہوگئی۔ میڈیا نے کہا کہ انہیں گولی کا نشانہ بنایا گیا، ان کی پارٹی کے رہنما مخدوم امین فہیم اور ناہید خان نے اس بات کی تصدیق کی لیکن وزارت داخلہ کے ترجمان فرماتے ہیں کہ یہ بیت اللہ محسود کا کام ہے۔ وہ میڈیا کو پشتو میں ہونے والی ایک گفتگو سنواتے ہیں، ساتھ ہی اس کا ٹرانسکرپشن صحافیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ چند ایکسرے لہرائے جاتے ہیں، بی بی جس لینڈ کروزر میں سفر کر رہی تھیں اس کی کھلنے والی چھت کے لیور کی تصویر دکھائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ دھماکے سے لڑکھڑا کر بی بی جب گاڑی کے اندر گریں تو یہ لیور ان کے سر پر لگا اور اسی کی وجہ سے ان کی جان گئی، اسپتال سے ڈاکٹر مصدق کی ''تصدیق شدہ'' نئی رپورٹ بھی آجاتی ہے، جس میں گولیوں کی بجائے کسی آہنی ٹکڑے سے لگنے والی ضرب کا ذکر ہے۔ کوئی وزارت داخلہ کے ان ترجمان سے پوچھے کہ جب ساری ''کارگزاری'' ایک لیور کی تھی تو پھر بیت اللہ محسود اپنے نوجوانوں

کے کس کارنامے پر مولوی صاحب سے گفتگو کر رہے تھے؟ اور دونوں کے درمیان مبارک باد کا تبادلہ ہو رہا تھا بی بی کی وہ آخری جھلکیاں جن میں ایک ہاتھ نمودار ہوتا ہے، ایک پستول گولیاں اگلتا ہے اور انہیں خاموش کر دیا جاتا ہے وہ کس کا ہاتھ تھا؟ اور اسی پستول کی گولیوں نے ان کی جان لی یا کہیں بلندی پر بیٹھا ہوا کوئی ماہر نشانہ باز رائفل پر لگی ہوئی ٹیلی اسکوپ میں ان کا سر اور ان کی گردن دیکھ رہا تھا؟ جان ایف کینیڈی کا قتل اور اس کی تفصیلات ہم میں سے کون بھلا پایا ہے؟ وہ بھی تو ریاست کے اندر قائم ریاست کی کارگزاری تھی۔ اس قتل پر آج بھی امریکی انٹیلی جنس ایجنسی کے تاریک سائے ہیں۔

بی بی کے قتل کے حوالے سے ہمیں وہ کہانیاں کیوں سنائی جا رہی ہیں جن پر کوئی ذہنی معذور ہی یقین کر سکتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ پستول یا رائفل کی لبلبی پر انگلی تو کسی نامعلوم شخص کی تھی لیکن اس انگلی کو حکم ان سے ملا تھا جو ملک پر اپنا دائمی اقتدار چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ ہر حد عبور کر سکتے ہیں کسی بھی انتہا تک جا سکتے ہیں۔

حکومت کا اعتبار پہلے ہی کب رہا تھا، بے نظیر بھٹو کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے بعد اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس کی بات سنی جائے گی، اسے وزن دیا جائے گا تو یہ محض اس کی خوش فہمی ہے۔ ان کا قتل کسی سے بھی منسوب کیا جائے۔ اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کی ٹیپ چلوا دی جائے تب بھی لوگ کسی بیان، کسی آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ کا اعتبار نہیں کریں گے۔ لوگ سب کچھ جانتے ہیں، سب کچھ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جہاں بم کا دھماکہ ہوا وہ جگہ تھوڑی ہی دیر میں کس محنت اور مہارت سے دھو دی گئی۔ پریشر پائپوں نے خون کے دھبے دھو دیئے، قاتل کے قدموں کے نشان دھو دیے لیکن کیا خون کے دھبے واقعی دھوئے جا سکتے ہیں؟...... اس پر سہ طرفہ تماشا یہ ہے کہ بے نظیر جیسی قومی رہنما کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ آصف زرداری کی ''خواہش'' پر ہوا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ بیان درست ہے یا نہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت ناپسندیدہ سیاسی جماعتوں کے اراکین کی

اتنی تابع دار کب سے ہوگئی کہ اس نے پوسٹ مارٹم جیسے بنیادی فرض سے روگردانی کی؟

اور اب بش بہادر سے لے کر چوہدری برادران تک سب ہی کے بیانات آرہے ہیں کہ انتخابات مقررہ تاریخ پر ہونے چاہئیں۔ چوہدری برادران تو پیپلز پارٹی کے سوگوار رہنماؤں اور کارکنوں کو یاد دلا رہے ہیں کہ بی بی چونکہ انتخابات میں حصہ لے رہی تھیں اس لیے انہیں ان کی اس خواہش کو وصیت سمجھ کر اس کا احترام کرنا چاہیے۔ اور انتخابات کا بائیکاٹ نہیں کرنا چاہیے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ کون سے انتخابات؟ وہ جو اقتدار پر ناجائز قابضین کو اگلے پانچ برسوں کے لیے اس ملک کے سولہ کروڑ لوگوں کی زندگیوں کا مالک و مختار بنا دے؟ کس کی نگرانی میں ہونے والے انتخابات؟ ان کی نگرانی میں جنھوں نے ہر قدم اور ہر مرحلے پر دھاندلی، بددیانتی اور خیانت کا ثبوت دیا ہے۔

اس وقت انتخابات میں حصہ لینا بے نظیر کے شہید خون سے غداری ہے ان انتخابات میں حصہ لینا بش بہادر کی بچھائی ہوئی بساط کا مہرہ بننا ہے۔ صرف بے نظیر کے جاں نثار ہی نہیں ملک کا ہر باضمیر شہری ان لوگوں سے نفرت کر رہا ہے جو اس ظالمانہ قتل پر مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہیں سوگ کا اعلان کر رہے ہیں، اخباروں میں تعزیتی اشتہارات شائع کرا رہے ہیں اور لوگوں کے زخموں پر نمک پاشی کر رہے ہیں۔ وہ جو بے نظیر کی زندگی سے حسد کرتے تھے کیا انہیں ان کی رخصت پر رشک نہیں آیا؟ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ان کے ماتم دار تابوت سے سر ٹکرا کر دھاڑیں مار رہے تھے، بچوں کی طرح رو رہے تھے، ان کے تابوت کو چھونے کی آرزو میں ایک دوسرے پر گرے پڑے تھے۔ ان کے جاں نثار 60 اور 80 گز کے تاریک گھروں اور تنگ گلیوں میں رہنے والے غریب اور غیرت مند لوگ تھے۔ شفیق احمد عرف گوگا اور ظہیر احمد جیسے لوگ۔ شمع جل بجھی اور پروانے بھی اس پر نثار ہوگئے۔ گم نام قبروں میں سو گئے اور اپنے گھر والوں کو فاقوں اور ذلتوں کے سپرد کر گئے۔ اس آس میں کہ شاید کبھی اچھے دن ان کے دروازے پر بھی دستک دیں گے۔ بے نظیر کو ان کے چاہنے والے

چاروں صوبوں کی زنجیر کہتے تھے۔ میاں نواز شریف ان کا اس سے بڑا اعتراف اور کیا کرتے کہ کل انھوں نے گلوگیر آواز میں انھیں ''چاروں صوبوں کی زنجیر'' کہا۔ وہ طویل جلاوطنی کے بعد واپس آئی تھیں اس وعدے کے ساتھ کہ ملک میں جمہوریت اور رواداری، خوشی، خوشحالی اور انسانوں کے درمیان مساوات قائم کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں گی۔

بے نظیر نے شہادت کا سرخ دوشالہ اوڑھا اور ہم سے رخصت ہوئیں، انھوں نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب یہ زندہ رہ جانے والوں کا فرض ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور ان کے خوابوں کی تعبیر کو ممکن بنائیں دکھے ہوئے دلوں پر مرہم رکھیں...... کہ یہی بے نظیر کے غم کے شایان شان ہے۔

ڈاکٹر صفدر محمود

صبح بخیر

بے نظیر کی المناک موت، نئے چیلنج اور سیاسی قیادت کی ذمہ داریاں

محترمہ بے نظیر بھٹو کی ناگہانی موت ساری قوم کو غم واندوہ اور آنسوؤں کے سیلاب میں بہا کر لے گئی۔ بلاشبہ محترمہ وفاق کی علامت تھیں اور مر کر ساری قوم اور چاروں صوبوں کے عوام کو درد کی لڑی میں پرو گئیں اور اپنے پیچھے ایسا خلاء چھوڑ گئیں جو کبھی پر نہیں ہوگا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے آمریت کی پھانسی پر چڑھ کر اپنے پیچھے جو خلا چھوڑا تھا اسے کسی حد تک بے نظیر نے پر کر دیا تھا اور اپنے مرحوم والد کی سیاسی میراث کو سنبھال لیا تھا لیکن بے نظیر کی بے وقت موت نے اپنے پیچھے جو خلاء چھوڑا ہے وہ بظاہر پر ہوتا نظر نہیں آتا، بے نظیر کو اپنے والد سے عشق تھا، اپنے والد کی مانند وہ غریبوں کا دکھ محسوس کرتی اور جمہوریت کے لئے لگاتار جدوجہد میں مصروف رہتی تھی کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ جمہوریت کے بغیر نہ ملک مستحکم ہوسکتا ہے اور نہ قوم متحد و یکجا ہوسکتی ہے۔ اسے احساس تھا کہ آمریت ملک کو اندرونی طور پر کھوکھلا کر دیتی ہے اور قومی یکجہتی کی بنیادوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ چنانچہ آمریت کا خاتمہ ہی بے نظیر کا مشن تھا اور اس نے اپنی زندگی کا معتد بہ حصہ پہلے ضیاء الحق کی آمریت اور پھر اس کے جانشین کے آمرانہ نظام کو ختم کرنے میں صرف کر دیا۔ اس راہ میں بھٹو خاندان پر کیسے کیسے مظالم توڑے گئے، یہ ہماری تاریخ کا ایک دردناک پہلو ہے اور یہی وہ احساس اور درد تھا جس نے بھٹو خاندان کی سیاسی عظمت اور بے نظیر کی مقبولیت کا چراغ روشن رکھا، اسے عوام کے ذہنوں اور دلوں کے قریب رکھا اور اسی درد نے بے نظیر کی موت پر شام غریباں کی یاد تازہ کر دی، ہر آنکھ کو اشکبار اور ہر چہرے کو غم کی تصویر بنا دیا۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ ایک طرف اس کے کارکن بے نظیر کی موت پر سینہ کوبی کر رہے تھے تو دوسری طرف اس کے جانثار غم میں نڈھال گرتے پڑتے تھے۔ ذرا غور کیجئے کہ ایسی موت کیسے نصیب ہوتی ہے؟ موت زندگی کی تلخ ترین اور اٹل حقیقت ہے جس سے کسی کو بھی مفر نہیں۔ موت کو بہر حال آنا ہوتا

ہے اور ہم بحیثیت مسلمان یہ یقین رکھتے ہیں کہ موت کا وقت اور جگہ بھی مقرر ہوتی ہے۔ لیکن کتنے لوگ ایسی موت مرتے ہیں کہ اپنے پیچھے پر نہ ہونے والا خلاء چھوڑ جائیں اور اپنے ملک وقوم کے علاوہ دنیا بھر میں کروڑوں آنکھوں کو آنسوؤں کے سمندر میں غرق کر جائیں۔ موت برحق ہے لیکن ایسی موت کم کم خوش نصیبوں کو نصیب ہوتی ہے۔ آپ پاکستان کی تاریخ پر نگاہ ڈال لیجئے۔ کتنے سیاسی لیڈروں کو ایسی موت نصیب ہوئی ہوگی؟ فقط چند ایک جن کے اسمائے گرامی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے جب ایسا انسان مرتا ہے تو فرشتے خالق حقیقی کے دربار میں عرض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تیرے اس بندے کے لئے کروڑوں آنکھیں اشکبار ہیں، کروڑوں ہاتھ اس کی بخشش اور روحانی بلندی کے لئے اٹھ رہے ہیں، کروڑوں دل اس کی یاد میں تڑپ رہے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی بے پناہ دعاؤں اور ان گنت التجاؤں کے طفیل نہ ہی صرف اسے بخش دیتا ہے بلکہ اس پر اپنے انعامات کی بارش بھی کرتا ہے۔ مسلمان کے لئے بخشش ہی زندگی کی آخری آرزو اور منزل ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں ایسی موت کو مبارک اور بے نظیر موت سمجھا ہوں۔ ہاں تو میں عرض کررہا تھا کہ بے نظیر کو اپنے والد سے عشق تھا وہ بیرون ملک سے طویل جلاوطنی کے بعد لوٹیں تو اپنے والد کے مزار پر حاضر ہوئیں لیکن ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے بے نظیر تسکین کی بجائے تشنگی لے کرلوٹی ہیں چنانچہ لاڑکانہ کے ایک باخبر شخص کے مطابق بے نظیر نے کہا کہ وہ جلد دوبارہ آئیں گی اور سکون سے تنہا اپنے باپ کی قبر کے پاس بیٹھیں گی۔ وہ 24 دسمبر کو گڑھی خدا بخش گئیں اور مسلسل دو گھنٹے اپنے والد کی قبر کے سرہانے بیٹھی رہیں۔ اس ملاقات کے فقط تین دن بعد بے نظیر بھٹو کو 28 دسمبر کی سہ پہر اسی جگہ پر دفن کیا گیا جہاں سے وہ تین دن قبل اٹھ کر گئی تھیں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بے نظیر کی حادثاتی موت جہاں حکومت کی غفلت اور نا اہلی کا نقش ثبت کرگئی ہے وہاں ملک وقوم کو بھی ایک بحران میں مبتلا کرگئی ہے اور وہ بحران ہے بے یقینی، مایوسی، خطرات اور ان گنت خدشات کا۔ ان کی موت القاعدہ کے ہاتھوں ہوئی یا ان کی لینڈ

کروزر کی چھت سے ٹکرانے کے سبب ہوئی۔ یہ ایک الگ بحث ہے کیونکہ القاعدہ نے یہ ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا ہے اور حکومتی تاویلات پر کسی کو اعتبار نہیں، نہ ہی کسی کو حکومتی انکوائری پر اعتماد ہے لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اس موت سے اٹھنے والا دھواں آسانی سے بند نہیں ہوگا اور یہ پاکستان کے افق پر خطرات کے بادل بن کر منڈلاتا رہے گا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق اب تک ہنگاموں میں دو درجن سے زائد افراد ہلاک ہو چکے ہیں یعنی دو درجن غریب گھر اجڑ چکے ہیں۔ سینکڑوں سرکاری وغیر سرکاری عمارات خاص طور پر بینکوں، پٹرول پمپوں، کاروں اور ریلوے اسٹیشنوں پر حملے ہو چکے ہیں۔ غور کیجئے تو محسوس ہوگا کہ عام طور پر نشانہ بننے والی جگہیں وہ تھیں جہاں سے نقدی لوٹی جا سکتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بے نظیر بھٹو کی وفات کے صدمے سے فائدہ اٹھا کر کچھ ایسے عناصر بھی سرگرم ہو گئے ہیں جن کا مقصد لوٹ مار، خلق خدا کو ایذا دینا، جیلوں پر حملے کر کے مجرموں کو چھڑانا اور ملک کو نقصان پہنچانا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح یہ لوگ بے نظیر بھٹو سے محبت کا ثبوت دے رہے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ معصوم لوگوں کے قتل عام، شہریوں کے نقصان لاقانونیت کے پرچار اور لوٹ مار پر بے نظیر بھٹو کی روح کو تکلیف پہنچ رہی ہوگی۔ اس لئے پی پی کے کارکنوں اور بے نظیر بھٹو کے جاںنثاروں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسے عناصر پر نگاہ رکھیں، لاقانونیت کی حوصلہ شکنی کریں اور صبر و تحمل کا دامن نہ چھوڑیں۔ اگر انہیں بے نظیر بھٹو سے محبت ہے تو اس کے مشن سے محبت کریں اور اس کے مشن کی شمع لے کر ملک میں اجالا کریں۔ بے نظیر بھٹو کا مشن تھا، آمریت کا خاتمہ اور جمہوریت کی بحالی، قومی یکجہتی اور ملکی استحکام، غربت جہالت اور لاقانونیت کا خاتمہ، عدلیہ کی آزادی اور قانون کی حکمرانی وغیرہ وغیرہ۔ ملک بھر میں پھیلے ہوئے پی پی پی کے کارکنوں کا یہی سیاسی ورثہ ہے اور اسی مشن کو آگے بڑھا کر وہ ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر بھٹو کی روحوں کو خوش کر سکتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایسے عناصر اور ایسی لابی بھی موجود ہے جو ان مواقع کو اپنے ایجنڈے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مجھے یہ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ کہ محترم آصف

زرداری صاحب نے کچھ جوشیلے حضرات کو پنجاب کے خلاف نعرے لگانے سے منع کر کے اعلیٰ فہم و فراست کا ثبوت دیا۔ میرا خیال ہے کہ پی پی پی کے مخلص کارکنان ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بھٹو خاندان کو ہمیشہ جتنی محبت، عقیدت اور سیاسی حمایت پنجاب سے ملی ہے شاید اتنی کسی اور صوبے سے نہیں۔ پی پی پی کی بنیاد بھی لاہور میں رکھی گئی۔ 1971 میں پنجاب ہی بھٹو صاحب کو اقتدار میں لایا اور پنجاب نے ہی ان کی قید و بند اور پھانسی کے خلاف قربانیاں دیں اور 1986ء میں بے نظیر کا تاریخی استقبال کر کے آمریت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ عناصر بے نظیر کی موت کے زخم سے فائدہ اٹھا کر صوبائیت کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں، ملکی استحکام کو داؤ پر لگانا چاہتے ہیں اور پاکستان کے دشمن ممالک کے عزائم کو عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ یہی عناصر ملک میں بے یقینی، عدم استحکام، لاقانونیت اور لوٹ مار کا پرچار کر رہے ہیں جو بہر حال بے نظیر بھٹو کے مشن کی نفی ہے اس موقعہ پر ہندوستان نے پاکستان سے ریل اور ہوائی رشتے منقطع کر کے اور بارڈر پر فوج کو الرٹ کر کے مثبت پیغام نہیں دیا کیونکہ بے نظیر ہندوستان سے دوستی چاہتی تھیں اور موجودہ حکومت اس ضمن میں بہت سے اقدامات کر چکی ہے۔ اس لئے ہندوستان کو پاکستان سے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا؟

اس پس منظر میں، میں محسوس کرتا ہوں کہ اب ہمارے سیاستدانوں کا امتحان شروع ہو چکا ہے۔ انتخابات ہوتے نظر نہیں آتے اور اگر ہوئے بھی تو نئے بحران کو جنم دیں گے اور جلتی پر تیل کا کام دیں گے۔ اس لئے اب سیاستدانوں اور کارکنوں کو نئے چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لئے میدان میں اترنا چاہئے حکومت کا موجودہ سیاسی ڈھانچہ ان مسائل کے حل کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ ہی نئے چیلنجوں سے نپٹ سکتا ہے اس لئے قومی حکومت کا قیام وقت کا اہم تقاضا دکھائی دیتا ہے۔ اس ضمن میں بے نظیر بھٹو کے انتقال کے بعد دوسرے اہم قومی لیڈر میاں محمد نواز شریف پر یہ ذمہ داری عائد ہو گئی ہے کہ وہ ملک کی سیاسی قوتوں کو یکجا کر کے قوم کو اس سیاسی بحران سے نکالیں، بے یقینی، مایوسی، لاقانونیت اور لوٹ مار کے

خاتمے کیلئے حکمت عملی وضع کریں اور ملک بھر میں تمام سیاسی کارکنوں کو متحرک کریں، حکومت پر قومی حکومت کے قیام کے لئے دباؤ بڑھائیں اور صوبائیت کے نام پر ابھرنے والے فتنے کا قلع قمع کرنے کیلئے اقدامات کریں۔ میاں صاحب کو چاہئے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے تمام سیاسی جماعتوں اور جمہوریت پسند قوتوں کو اکٹھا کریں، ان کی قیادت سے میٹنگ کر کے ان چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حکمت عملی بنائیں اور ملک بھر کی جمہوری قوتیں مل کر ملکی استحکام اور قومی یکجہتی کے لئے بھرپور مہم کا آغاز کریں۔ میرے نزدیک یہ وقت کا اہم ترین تقاضا بھی ہے اور بے نظیر بھٹو کے مشن کی جانب ایک ہم قدم بھی......

باقی پھر انشاءاللہ

صوفیہ بیدار

بھٹو ہاؤس سے بینظیر کی رخصتی

زندگی رک گئی۔ بے نظیر لمحے میں، بے مثال منظر میں، آگ اور پانی کے کھیل میں، بالآخر آگ جیت جاتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں ہاتھ، تالیاں پیٹتے پیٹتے سر پیٹنے لگے، جئے بھٹو جئے بینظیر کے نعرے آہ وبکا میں لپٹ گئے۔ آتش بازی پھوٹ پڑی، بے سمت پھلجڑیاں املاک پر امڈ پڑیں۔

میری آنکھ میں آنسو تو 27 دسمبر کی سہ پہر ہی پھوٹ پڑے مگر ان میں نمک 79ء کا ہے۔ یہ وہی گھٹتی ہوئی سسکیاں تھیں جو ادا نہ ہوسکیں، وہی آنسو ہیں جو مارشل لا کے سائے میں تھم گئے تھے، یہ وہی سہمے ہوئے لمحے ہیں جن میں ملک کی فکر دامن گیر ہے۔

یاد کا در کھلتا ہے۔ 75 یا پھر 76ء کا سن ہوگا، میں سکول کی طالبہ تھی اور امی کے ہمراہ وزیر مال رانا شوکت اور ناصرہ شوکت کی اقامت گاہ پر اپنے بہن بھائیوں کے ہمراہ ٹھہری ہوئی تھی۔ ناصرہ شوکت میری والدہ نصرت ہاشمی کی بہترین دوست تھیں۔ جبھی ایک صبح ہمیں امی نے دکھایا۔ یہ دیکھو یہ جو خوبصورت سی بچیوں کو گورنر ہاؤس سے نکلتے دیکھ رہی ہو۔ یہ بھٹو صاحب کی صاحبزادیاں ہیں۔ بے نظیر اور صنم بھٹو بعد ازاں دونوں بیٹے مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو۔ یہ چاروں بہن بھائی بار بار گورنر ہاؤس سے گاڑی لے کر نکلتے اور پیچھے سکیورٹی والوں کو لپکنا پڑ رہا تھا لیکن بے باک بہادر و دلیر بھٹو کے بچے سکیورٹی والوں کو "جل" دے کر باہر نکل جاتے۔ تب پتہ چلا بڑی صاحبزادی جو دیکھنے میں بھی گلاب تھیں کا نام بھی پنکی تھا۔

ٹی وی سکرین پر جلسوں میں تقریریں کرتے ذوالفقار علی بھٹو بے پناہ جذبات میں آکر مائیک گرا دیا کرتے تھے، عوام میں، ہم رقص ہو جاتے نصرت بھٹو کو پیچھے کر دیا کرتے ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اپنے بدن کا ہر خلیہ لوگوں میں تقسیم کر دیں گھل مل جائیں وہ کسی سکیورٹی کی پرواہ نہیں کرتے تھے انہیں عوام سے روبرو ہونے کی اس قدر عادت تھی کہ زندگی کا آخری پیغام بننے والا امریکی خط بھی پنڈی کے بازاروں میں لے کر آگئے جو بالآخر حکم اجل ثابت ہوا

لیکن مرتے دم تک عوام سے رابطہ نہیں توڑا۔

اس میں دو رائے نہیں کہ ملک میں عوامی سیاست کا آغاز کرنے والے بھٹو کی بیٹی نے عین عوام کے ہجوم میں اپنی آخری سانسیں عوام پر وار دیں اور اپنے اوپر لگنے والے تمام الزامات کو اپنے خون سے دھو دیا۔ آج میں بھی اپنے بچوں کو دکھا رہی ہوں کہ دیکھو ایسی ہوتی ہے لیڈر کی موت۔ بالکل ایسے ہی والدہ نے بھی مجھے بھٹو کی موت پر سمجھا کر تیسرے دن کھانا کھلایا تھا ایک زندہ دھڑکتے وجود کو جو کروڑوں لوگوں کا محبوب و منتخب لیڈر تھا، پھانسی پر لٹکایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد نوجوانی کا دور شروع ہوا تو کوڑوں، شرعی عدالتوں اور انتہائی سخت گیر مارشل لا میں گھٹی گھٹی سانسیں لیں۔ بھٹو کی موت جدیدیت کی موت تھی اس لئے رجعت کا جنم ہوا۔ دل نے کبھی بھی ملائیت کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا بھٹو کی ماڈریٹ اپروچ نے بیٹے کی بجائے بیٹی کی صلاحیتوں کو بام عروج پر دیکھتے ہوئے اس کی سیاسی تربیت کی۔ یہ چیز اس خاتون کیلئے بہت حوصلہ افزا تھی۔

آج بے نظیر کے اس مقام پر آ کر اس طرح شہید ہو جانے نے ذہین و فطین عورتوں کے حوصلوں کو پست نہیں کیا بلکہ اور حوصلہ مند کیا ہے میں نے اپنے اطراف میں اپنی معصوم ہمسایوں کے تاثرات بھی سنے ہیں۔ وہ کل شام سے بے طرح رو رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں سب کچھ تھا آرام سے گھر میں بیٹھ کر بچوں کی شادیاں کرتی۔ دراصل غم کے مختلف انداز ہیں۔ ہم بینظیر کو ایک عظیم باپ کی بیٹی کے روپ میں دیکھتے ہیں وہ تو خود ایک ایسی دلہن بن گئی ہے جس کی ہر دلہن پیروی کرے گی، اس نے اپنے ہاتھوں پر اپنے ہی دل کے لہو سے مہندی لگالی ہے۔ اس کے بیٹے بلاول، بیٹی بختاور اور آصفہ کا جنم ہم نے ان کے سیاسی سفر کے ہمراہ دیکھا۔

بچوں کو یوں تو ماں کی گرمائش ہمیشہ چاہئے ہوتی ہے۔ لیکن بینظیر دبئی میں اپنے بچوں کیلئے خود برگرز بنایا کرتی تھیں۔ انہوں نے وطن واپسی سے قبل کہا تھا، ” آصفہ شاعری کرتی ہے میں نے اسے کہا ہے کہ تم نعت رسول ﷺ مقبول لکھا کرو اور میرے جلسے میں میری تقریر سے

قبل پڑھا کرو‘‘۔ وہ اتنی بڑی لیڈر ہونے کے ساتھ ماں بھی تھیں، اپنے بچوں کو محفوظ آشیانے پر بٹھا کر خود کو سیاست کی خونی لہروں کے سپرد کر دیا۔ خود کو تو سرخرو کیا اپنے پیچھے بے کلی اضطراب اور بے چینی کا جہان چھوڑ گئیں۔

بھٹو کی موت پر خاموشی ہوگئی تھی بینظیر پر وہ خاموشی ٹوٹ گئی ہے۔ برف میں دراڑ پڑ گئی ہے۔ بھٹو ہاؤس میں بینظیر کو دوبارہ نہلا دھلا کر کفن دیا گیا، دوبارہ باپ کے گھر سے رخصت ہوگئیں بعد از نماز جمعہ گڑھی خدا بخش بھٹو ہاؤس نوڈیرو سے ان کی خون رنگ رخصتی نے زرد روؤں کو انتہائی افسردہ کر دیا ہے۔ وہ باپ کے پہلو میں رزق خاک ہوگئیں۔ ایک انتہائی زندہ دھڑکتا وجود خاموش ہو گیا ذہانت کا قتل ایک بار پھر نالائقوں کی فتح کی صورت میں انتشار کا باعث بن گیا ہے۔ اس مرتبہ لوگوں نے دانش کی شکست کو تسلیم نہیں کیا اور تن بدن سے جل اٹھے ہیں۔ پورا ملک جل رہا ہے اپنے مخصوص لہجے ذہانت تعلیم اور منفرد شخصیت سمیت بینظیر منوں مٹی میں تو اتر گئیں لیکن پیپلز پارٹی کو اپنے لہو کی آبیاری سے اور مضبوط کر گئیں

ظاہر ہے اب الیکشن میں جان نہیں رہی، بینظیر اور نواز شریف کی آمد پر جو رونقیں لگ گئی تھیں انہیں گہن لگ گیا ہے اب قومی حکومت یا اشتراکی حکومت کی تجویزیں ہیں پیپلز پارٹی کی سربراہی کا مسئلہ ہے یہ تمام معاملات ایسی آسانی سے حل ہونے والے نہیں۔

حکومت کو اس وقت صرف اور صرف لوگوں کے جذبات دیکھتے ہوئے وطن کو انتشار سے بچانے کیلئے ایسی قومی حکومت کی تشکیل کے بارے میں سوچ لینا چاہیے جس سے لوگوں کے جذبات کچھ نہ کچھ تشفی پا جائیں۔ یعنی قیادت میں پیپلز پارٹی کو آگے رکھا جائے تاکہ اشتعال کا کسی حد تک خاتمہ ہو کیونکہ اس قدر بڑا صدمہ، عوامی لیڈر کی شہادت لوگوں کو ہضم نہیں ہو رہی۔ مفاہمت، مثبت سوچ ہی اس وقت کی ضرورت ہے۔

محترمہ بینظیر بھٹو کی نذر:

گوارہ کب مجھے تھا قبضہ قدرت میں جاں رکھنا

ستم ہے اپنی مٹی پر بساط آسماں رکھنا
نہ پوچھو کیوں ہوا ہے ذائقہ ہر مدعا میرا
مجھے مہنگا پڑا ہے کس قدر منہ میں زباں رکھنا
وراثت کم نہیں ہے بے سرو سامان لمحوں کی
خوشی خیرات کرنا اپنے حصے میں زیاں کرنا

کبھی جو زندگی نے مہلت دی تو حرفوں کے نذرانے لے کر رخت سفر اس عظیم باپ بیٹی کے مزار کی جانب باندھیں گے۔

یہاں تو رسم ہے زندوں کو دفن کرنے کی
کسی بھی قبر سے مردہ کہاں نکلتا ہے
بلند حوصلہ قربانیوں میں کام آئے
یہ اونٹ والا قبیلہ کہاں نکلتا ہے

بریگیڈیئر (ر) صولت رضا

غیرفوجی کالم

عسکری قیادت کا اظہار تعزیت

چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی جنرل طارق مجید اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے علیحدہ علیحدہ تعزیتی پیغامات میں سابق وزیر اعظم (دو مرتبہ) اور پاکستان پیپلز پارٹی کی تاحیات چیئر پرسن محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت پر گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔ جنرل طارق مجید کے الفاظ میں "یہ ایک وحشیانہ جرم اور پاکستان کے استحکام پر حملہ ہے انہوں نے عوام سے اپیل کی ہے کہ اس موقع پر صبر وتحمل کا مظاہرہ کریں اور امن وامان بحال رہنا چاہیے۔ جنرل طارق مجید نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مزید کہا کہ "قوم ایک ترقی پسند، معتدل اور دلیر قائد سے محروم ہوگئی ہے۔

چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے اپنے تعزیتی پیغام میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کو ایک عظیم سانحہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ "ہم سب ایک قومی لیڈر کے قتل پر افسردہ ہیں" انہوں نے محترمہ کے خاندان اور دیگر لواحقین سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے رسم سوئم کے موقع پر چیف آف آرمی سٹاف کی جانب سے قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی۔

پاکستان کی موجودہ عسکری قیادت کی جانب سے محترمہ بے نظیر بھٹو کے بہیمانہ قتل پر تعزیت کا اظہار بادی النظر میں غیر معمولی اقدام دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے۔ ہمارے معاشرے میں غمی یا خوشی کے موقع پر باہمی میل جول روزمرہ کے شعار میں شامل ہے۔ مختلف نظریات اور متضاد ملازمتی پس منظر کے حامل آپس میں رشتہ داری اور ربط باہمی کے "شکنجے" میں جکڑے ہوتے ہیں۔ خاص طور سے ناگہانی مصائب تکالیف کے عالم میں ایک دوسرے کو نظر انداز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک المناک حقیقت ہے کہ بعض اوقات "دوراندیش" حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنے معاشرتی میل جول کو

خفیہ ہی رکھتے ہیں تا کہ ناخوشگوار نتائج سے محفوظ رہا جائے۔ خاص طور پر سے ''حکومت بدر'' شخصیات سے آشنائی کبھی کبھی نا قابل تلافی جرم بن جاتا ہے۔ یہ موقع حفظ ماتقدم کے اصول کو اپنانے والی شخصیات سے منسوب واقعات دہرانے کا نہیں ہے۔ وطن عزیز کا ہر شہری محترمہ بے نظیر بھٹو کے بہیمانہ قتل سے افسردہ اور پریشان ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے غم کا اندازہ کرنا دشوار ہوگا۔ چون برس کی عمر میں سفر آخرت پر روانہ ہونے والی بے نظیر بھٹو نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایک بے باک جرات منداور مستقبل آشنا لیڈر کے طور پر خود کو تسلیم کرایا۔ ان کے طریق سیاست اور نظریات سے اختلاف ممکن ہے لیکن محترمہ کی عوام دوستی، وطن دوستی، اور جمہوری اقدار سے مخلصانہ لگاؤ سمیت متعدد خوبیاں زندہ حقیقت ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں بھٹو خاندان حریت، قربانی اور ڈٹے رہنے کے حوالے سے سیاست میں نمایاں ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت نے اس تاثر کو مزید توانائی دی ہے۔ خاص طور پر ان کی ناگہانی رحلت کے بعد ملک گیر عوامی سوگ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سیاسی رہنما کی زندگی ہو یا موت عوام کو جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں موجودہ عسکری قیادت نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے موقع پر دکھ اور افسوس کا اظہار کر کے بروقت اور درست اقدام اٹھایا ہے۔ غم کی اس گھڑی میں '' باوردی'' الفاظ کی ابلاغی توانائی سے افواج کے بارے میں منفی تاثرات خود بخود دم توڑ جائیں گے۔ بدقسمتی سے محترمہ کے المناک قتل کے بعد بعض مفاد پرست عناصر نے سندھ، پنجاب اور ریاستی اداروں کے حوالے سے ناپسندیدہ حاشیہ آرائی شروع کر دی تھی۔ محترمہ کو '' سندھی لیڈر'' کا درجہ دے کر ان کے بلند سیاسی قدو قامت، ملک گیر مقبولیت اور بین الاقوامی مقبولیت کو گھٹانے کی مذموم کوشش کی گئی۔ تدفین کے موقع پر بعض ناخوشگوار نعرے ایسے بھی تھے جن کے ذریعے افواج کو نشانہ بنایا گیا۔ یہ حرکت محترمہ بے نظیر بھٹو کے پرکشش انداز سیاست کی مکمل نفی کرتی ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کے والد گرامی بیرسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو اس زمانے کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق کے دور حکومت میں تختہ دار پر لٹکا

دیا گیا۔ پھانسی نے شدید نوعیت کے منفی اثرات کو جنم دیا اور بعض ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے جن کی سیاسی توجیہات پیش کرنا دشوار ہے۔ ظاہر ہے کہ غیر سیاسی ماحول میں سیاستدانوں اور ان کے پیروکاروں سے مغربی طرز سیاست کی توقع رکھنا حماقت ہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق ایک ناگہانی حادثے میں اللہ کو پیارے ہوئے تو پاکستان پیپلز پارٹی کو اپنی سیاست نمایاں کرنے کا بھرپور موقع میسر آیا اور محترمہ نے صرف پینتیس برس کی ''سیاسی نو عمری'' میں وزیر اعظم پاکستان کے عہدہ کا حلف اٹھایا۔ بھٹو صاحب کی پھانسی کے تناظر میں یہ خدشات ظاہر کئے جا رہے تھے کہ ملوکیت کی مروجہ روایات کے مطابق انتقام در انتقام کا مرحلہ شروع ہوگا لیکن محترمہ نے اپنے پہلے دور میں ایک باوقار سیاسی رہنما کے طور پر امور مملکت انجام دیئے۔

انہوں نے وطن عزیز کے دفاعی نظام کو مزید مضبوطی عطا کرنے کے لئے متعدد درست اقدامات کی منظوری دی۔ کسی مرحلے پر بھی ان کا رویہ افواج کے حوالے سے منفی نہیں تھا۔ خاص طور پر سندھ میں نئی چھاؤنیوں کے قیام اور اندرون سندھ سے نوجوانوں کی فوج میں شمولیت ایسے مسائل تھے جن کا اس زمانے کی عسکری ہائی کمان کو سامنا تھا۔ بری فوج کے سابق سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ کے پاس یقیناً زیادہ معلومات ہوں گی۔ مجھے یاد ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو پہلے دور میں جب سندھ رجمنٹل ٹریننگ سنٹر حیدر آباد میں کرنل کمانڈنٹ کی تعیناتی کی تقریب میں شرکت کی دعوت دی گئی تو وہ کسی پس و پیش کے بغیر تیار ہوگئیں۔ انہوں نے علاقائی سیاست کے حوالے سے منفی رجحانات سے آگاہ کیا ہے۔ اس زمانے کے بعض ''خالص'' علاقائی لیڈر پنوں عاقل نہ کھپے ''چھاؤنی نہ کھپے'' اور فوج نہ کھپے ٹائپ کے نعرے لگا رہے تھے۔ ''نہ کھپے سے مراد نامنظور ہے''۔

یہ نہ کھپے والی مہم جنرل محمد ضیاء الحق کے دور میں زیادہ شدت پکڑ گئی تھی۔ معاملہ اس قدر سنگین تھا کہ انکے چنیدہ وزیر اعظم جناب محمد خان جونیجو نے اندرون سندھ میں پنوں عاقل چھاؤنی اور دیگر عسکری تنصیبات کی کسی تقریب میں شرکت نہیں کی۔ یہ محترمہ بے نظیر بھٹو کا

حوصلہ اور دور اندیشی تھی کہ انہوں نے فوج کے لئے اندرون سندھ سے آئے ہوئے ریکروٹس پر زور دیا کہ وہ اپنے گوٹھوں سے زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو پاکستانی فوج میں بھرتی کرائیں کیونکہ یہ ہم سب کی فوج ہے۔ آج وطن عزیز کی تینوں مسلح افواج میں ایک لاکھ سے زائد سندھی اور بلوچی جوان خدمات انجام دے رہے ہیں تو اس کا کریڈٹ کافی حد تک محترمہ بے نظیر بھٹو کی پاکستانی سوچ کی حامل سیاست کو جاتا ہے۔ اندرون سندھ میں بھٹو صاحب کی پھانسی، دریائے سندھ کے پانی کی تقسیم اور سرکاری ملازمتوں کے حوالے سے صوبہ سندھ سے امتیازی سلوک کے بل بوتے پر علاقائی نفرت کو فروغ دینے والے، عام انتخابات میں ہمیشہ بے نظیر کے حامیوں سے منہ کی کھاتے رہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق کے دور میں جس نفرت کو فروغ حاصل ہوا تھا۔ محترمہ نے سیاسی حکمت عملی سے اسے ناکارہ بنانے کی حتی المقدور کوشش کی۔

بارہ اکتوبر انیس سو ننانوے کو ''جوابی انقلاب'' کے بعد وطن عزیز کی مقبول سیاسی قیادتوں کو ایک اور امتحان درپیش تھا۔ گذشتہ آٹھ برس کے دوران (سابق) چیف آف آرمی سٹاف کے دور حکومت میں حسب توقع بلدیاتی سطح کے لیڈر اور کونسلر ٹائپ رہنما جنم دینے کی غیر فطری کاوش جاری رہی۔ آج حالت یہ ہے کہ جن قومی رہنماؤں کو ''کرپٹ'' ''بے ایمان اور'' ''ناقابل قبول'' ثابت کرنے کیلئے کروڑوں روپے اور سرکاری اہلکاروں کی دن رات کاوشیں صرف ہوگئیں وہ آج دوبارہ زندگی یا موت، دونوں صورتوں میں قوم کی آنکھ کا تارا بنے ہوئے ہیں۔ یہ کیفیت ہم سب کی دیانتدارانہ توجہ کا تقاضا کرتی ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کی المناک شہادت کے بعد سوگ کی فضا میں قومی املاک کو بے پناہ نقصان پہنچانے کے جو واقعات سامنے آئے ہیں وہ اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ حقیقی قائدین کی عدم موجودگی میں جذبات انسانیت سے ناطہ توڑ لیتے ہیں۔ لہٰذا وطن عزیز کے روشن مستقبل کی خاطر قومی قائدین کے وجود کو ان کی زندگی میں تسلیم کرنا چاہیے۔ ابلاغیات اور اطلاعاتی نظام کی بے پناہ ترقی اور عالمگیریت کے بڑھتے ہوئے رجحانات نے سیاسی

رہنماؤں کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اب گنے چنے مصاحبین، درباری اہلکار اور ہلکے پھلکے سیاست کار مملکت کے امور انجام نہیں دے سکتے۔ ہماری ساٹھ برس کی تاریخ ایک المیہ کے بعد دوسرا المیہ جنم دے رہی ہے۔ مرض صرف ایک ہے ریاست کے ستون باہمی سر پھوڑ کے عادی ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں اپنی صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں۔

غیر آئینی دھما چوکڑی کے اس ماحول میں چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی کی جانب سے محترمہ بے نظیر بھٹو کو قومی لیڈر قرار دینا حقیقت کی نشاندہی ہے کہ سیاسی اثاثے اور شخصیات مملکتوں کے لئے بے پناہ قدر و قیمت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا وجود قوم کے لئے لازم و ملزوم ہے۔ چیف آف آرمی سٹاف کی یہ سوچ ایک روشن اور پائیدار سیاسی مستقبل کی جانب اشارہ کر رہی ہے۔

طاہر سرور میر

فٹ پاتھ

ایک اور بھٹو

بھٹو صاحب نے کہا ”یہ بات اچھی نہیں کہ لوگوں کے بچے قربانیاں دیں اور میرے بچے نہ دیں“۔ شہید کا یہ عہد پنکی، میر، اور شاہ نے پورا کیا۔ بھٹو اور انکے بچوں (بے نظیر، مرتضیٰ اور شاہ نواز) کو قتل کیا گیا۔ پھانسی، زہر، پولیس فائرنگ اور دہشت گردی جیسے قبیح اور غلیظ منصوبوں پر عمل کیا گیا۔ اب پنکی اپنے پاپا کے پہلو میں دفن کر دی گئی ہے۔ اس سے پہلے بھٹو کے آنگن میں اس کے بیٹوں شاہ نواز اور میر مرتضیٰ کے جنازوں کی فصل بوئی گئی تھی۔ اب پنکی کی قبر بھی گڑھی خدا بخش کے صابر سینے پر سجا دی گئی ہے۔ یہ 3 اپریل 1979ء کی بات ہے۔ جب پنکی نے اپنے پاپا سے کہا تھا ”الوداع پاپا“۔ بے نظیر، اپنی ماں نصرت بھٹو کے ہمراہ راولپنڈی جیل میں اپنے پاپا بھٹو صاحب سے آخری ملاقات کر رہی تھیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے حکم سنایا ”وقت ختم ہو گیا ہے“ پنکی آخری بار اپنے پاپا کے سینے لگنا چاہتی تھی اس نے التجا کی میرے والد منتخب وزیر اعظم ہیں، میں ان کی بیٹی ہوں، یہ ہماری آخری ملاقات ہے، مجھے ان سے ملنے دو، مگر انکار کر دیا گیا۔ پنکی اپنی ماں کیساتھ پھانسی کی کوٹھڑی سے بوجھل قدموں سے واپس آ رہی تھی۔ اس کے بعد اس زندگی میں اپنے پاپا کو دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ وہ میرے پاپا کو ”قتل“ کرنے والے تھے۔ میں اپنے پاپا کو مڑ کر دیکھنا چاہتی تھی مگر حوصلہ نہیں پڑتا۔ اتنے میں پاپا کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ”ہم جب پھر ملیں گے اس وقت تک خدا حافظ“

پھر پاپا اور پنکی کی ملاقات 27 دسمبر کی شام 28 سال 8 ماہ اور 24 دن بعد ہو گئی۔......

بھٹو صاحب کو 4 اپریل 1979ء کو راولپنڈی جیل میں پھانسی دی گئی اور انکی بہادر بیٹی بے نظیر کو اس سے کچھ فاصلے پر واقع لیاقت علی باغ میں قتل کر دیا گیا...... کیا کہانی ختم ہو گئی؟ آمروں نے اپنے پنجوں سے تاریخ کے دامن سے بھٹو کا نام کھرچنا چاہا مگر ان کے پلید پنجے گھس گئے...... کیونکہ جانثاروں نے جئے بھٹو، کا نعرہ نہ صرف خودکشیاں اور خودسوزیاں

کرتے بلند کیا بلکہ اسے اپنا عشق اور ایمان جان کر لوح تقدیر پر بھی ثبت کر دیا۔ بھٹو کو ختم کرنے کا پلان 28 سال پہلے بھی ناکام ہوا تھا۔ 27 دسمبر کے ماسٹر مائنڈ بھی خسارے میں رہیں گے۔ یہ بھٹو کے خون کی تاثیر ہے کہ وہ رگوں میں بہے تو وفاق پاکستان کی علامت بنے اور اگر ٹپکے تو قوم کے ماتھے پر حب الوطنی کا جھومر بن کر چمک اٹھے...... محترمہ کتنے بڑے دل کی مالکہ تھی اور بھٹو خاندان کے پاکستانی قوم پر کس قدر احسانات ہیں، قربانیوں کی اس ہزار داستان، سے کوئی ابوجہل ہی بے بہرہ ہوگا۔ اسٹیبلشمنٹ اور ماضی میں اس کے سرغنہ جنرل ضیاء الحق کا جرم چھوٹا نہیں تھا تیسری دنیا اور مسلم امہ کے عظیم لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد پاکستان سے لے کر افغانستان تک امریکی اسمبلڈ ''جہاد'' کی ایسی فصل بوئی گئی جسے شاید ہماری آئندہ نسلیں بھی کاٹتی رہیں گی۔ آمروں اور جمہوریت پسندوں میں بنیادی فرق یہی ہوتا ہے۔ آمر عوامی حقوق غصب کر کے ان کی تذلیل کرتے ہیں جبکہ جمہوریت پسند جان کی بازی لگا کر عوام کو عزت اور انصاف مہیا کرنے کے ساتھ معاشی آسودگی کا اہتمام کرتے ہیں آمروں کی منشاء ایک طرف ملک کی محبّ وطن لیڈرشپ (بھٹو اور بے نظیر) کو قتل کرانا۔ دوسری طرف مقبول لیڈرشپ کے سامنے ملک کو لسانی اور صوبائی حصے بخروں میں تقسیم کرنے کی مذموم خواہش رکھنے والوں کو سر آنکھوں پر بٹھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں ضیاء الحق، ''مشہور زمانہ'' علیحدگی پسند جی ایم سید کے ہاں ''حاضری'' دینے کے ساتھ ساتھ ایک لسانی جماعت کے غیر سرکاری طور پر ''بانی'' بھی رہ چکے ہیں۔ زمانہ حال میں سب سے پہلے پاکستان کے نام پر اس نوع کے دوسرے کارناموں کو ''عوامی طاقت کا مظاہرہ'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ خدا کرے بھٹو خاندان اور پیپلز پارٹی پر اس طرح کا برا وقت پھر کبھی نہ آئے۔ مگر اہلیان وطن اور بھٹوز کے سیاسی مخالفین اور وہ قلمکار جو اپنے قلم کو تلوار اور نیزے بنا کر وفا اور حب الوطنی کی اس چادر پر ڈیل کے زخم کھینچ رہے تھے، انصاف کریں آصف علی زرداری سے لے کر ایک عام جیالے تک کسی ایک نے بھی بے نظیر کی لاش پر سندھ کا نوحہ نہیں پڑھا۔ البتہ الطاف حسین اور ظفر اللہ خان جمالی نے یہ کہہ دیا ہے کہ ''کب

تک لیاقت باغ (پنجاب) سے منتخب وزرائے اعظم کی لاشوں کو سندھ بھیجا جاتا رہے گا۔ بے نظیر بھٹو کی شہادت کو جمہوریت کی شہادت قرار دیا گیا ہے۔ قوم اس ذہنیت کا اندازہ کرے جسے جمہوریت سے نہ صرف خوف اور نفرت ہے بلکہ وہ عوام کے حقوق اور لیڈر شپ کو اپنا قاتل تصور کرتے ہیں۔ حکومت محترمہ کے قتل کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کے حوالے سے کس قدر مخلص ہے اس کا اندازہ حکومتی، بریگیڈیئر کے سوکھے لبوں سے حقائق کی منظر کشی کرتے ہوئے لگایا جاسکتا ہے۔ آصف زرداری اور پیپلز پارٹی نے حکومت کی حکومتی تحقیقات کو نامنظور کیا ہے۔ آصف زرداری اور پیپلز پارٹی نے پریس کانفرنس میں بتایا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو قتل کس نے کرایا۔ وزارت خارجہ کے متذکرہ ترجمان نے ہیلری کلنٹن سمیت دنیا کے دیگر رہنماؤں کی طرف سے اس مطالبہ کو یہ کہتے ہوئے مسترد کیا ہے۔ جس میں کہا گیا تھا پاکستانی حکومت محترمہ کے قتل کی تحقیقات غیر ملکی ایجنسیوں سے کرائے۔ پیپلز پارٹی کا بھی یہی مطالبہ ہے مگر اس ضمن میں حکومتی بریگیڈئر پیشگی فیصلہ سنا چکے ہیں کہ دہشتگرد پشتو زبان میں دہشت گردی کرتے ہیں۔ ہمارا کلچر اور ہے اور مغرب کا کلچر اور ہے۔ آج سولہ کروڑ عوام یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا قومی سانحات کے ذمہ داروں کو چھپانا ہی ہمارا کلچر ہے؟ ہماری ایجنسیوں نے آج تک کتنے ایسے سانحات کے ذمہ داروں کے بھیانک چہروں سے نقاب کشائی کی ہے۔

ہماری تاریخ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبانے والوں سے لیکر نواسہ رسول ﷺ کا سر نیزے پر اٹھانے والوں سے آلودہ ہے۔ موت کا خوف بھٹوز کے ارادوں کو متزلزل نہ کرسکا۔ بھٹوز، ظلم کو نہیں مانتے اس لئے عوامی حقوق کا یہ علم اب بلاول، کو تھما دیا گیا ہے۔ اس نوعمر لیڈر نے اپنے پہلے خطاب میں کہا ہے کہ ”میری ماں ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ جمہوریت عزت سے جینے کا بہترین اصول ہے لہٰذا میں اسی راستے پر چلوں گا جو میری ماں اور نانا کا بتایا ہوا ہے۔ بلاول کو ظلم کے خلاف ڈٹ جانے اور جمہور پر قربان ہونے کا ورثہ منتقل ہوا ہے ...... اے خدا! دعا ہے کہ اسے اس کی ماں اور نانا کے مشن کو جاری رکھنے کی توفیق کے ساتھ عمر خضر بھی عطا کرنا تاکہ دنیا دیکھ سکے آخری فتح سچ کی ہوتی ہے!!!

ظفراقبال

دال دلیہ

عجب اک سانحہ یاں ہو گیا ہے!

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

چاروں صوبوں کی زنجیر ٹوٹ گئی یا توڑ دی گئی۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ یہ کارروائی ان عناصر کی ہے جنہیں اس شہادت سے فائدہ پہنچا ہے جس پر یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ اس انتہائی سفاکانہ جرم سے حکومت یا اپوزیشن کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا نظر آتا۔ یہ بات تو طے ہے کہ اس سانحے سے صدر پرویز مشرف کو بیحد اور ناقابل تصور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ الیکشن شیڈول بری طرح متاثر ہوگا اور بظاہر یہی نظر آتا ہے، ملک میں ردعمل کے طور پر ایک زوردار تحریک بھی چلتی نظر آتی ہے جس کے ناقابل برداشت نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

ایک خبر کے مطابق القاعدہ نے اس شرمناک کارروائی کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ جس کی امریکی حکومت نے تصدیق نہیں کی۔ واضح رہے کہ ابھی چند ہی روز پہلے بینظیر بھٹو کو منظر سے ہٹائے جانے کا اعلان القاعدہ کی جانب سے کیا گیا تھا اور حکومت کی طرف سے بھی بار بار محترمہ کو ایسے خطرات سے خبردار کیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس کی پرواہ نہیں کی اور اپنی انقلابی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ البتہ انکی حفاظت کے لئے جن جیمرز کا اہتمام کیا گیا تھا، محترمہ کی طرف سے یہ شکایت باضابطہ طور پر کی گئی تھی۔ کہ جیمرز ناقص ہیں اور یہ کہ ان کا یہ نقص دور کیا جائے لیکن یہ نقائص دور کرنے کی کوئی اطلاع منظر عام پر نہیں آئی۔

ایک اور تکنیکی بے پروائی یا کوتاہی کا جو ارتکاب کیا گیا ہے وہ یہ کہ ہسپتال انتظامیہ نے خلاف معمول میت کا پوسٹ مارٹم بھی نہیں کیا اور محترمہ کا جسد خاکی اس کے بغیر ہی لواحقین کے سپرد کر دیا گیا۔ کہا یہی گیا ہے کہ پولیس نے حسب ضابطہ اور حسب روایت پوسٹ مارٹم

کئے جانے کی درخواست یا مطالبہ ہی ہسپتال انتظامیہ سے نے نہیں کیا جبکہ یہ کارروائی بہت سی چیزوں کی حقیقت جاننے کے لئے بیحد ضروری تھی۔ مثلاً ایک رپورٹ کے مطابق محترمہ کے زخم بم پھٹنے اور اس کے ٹکڑے لگنے کی وجہ سے آئے، جبکہ دوسری اور زیادہ قابل اعتبار رپورٹ یہ تھی کہ ان کے سر اور گردن پر گولیاں ماری گئیں۔ پوسٹ مارٹم سے نہ صرف یہ فرق واضح اور دور ہوسکتا تھا بلکہ اگر گولیاں ماری گئیں تو کس قسم کے اسلحہ کے ذریعے اور کتنے فاصلے سے فائرنگ کی گئی۔ اس بات کی تحقیقات بھی ہونی چاہئیں کہ پولیس نے معمول کے خلاف پوسٹ مارٹم کیوں نہ کروایا؟

عجیب بات ہے کہ اب تک متعدد سربراہان مملکت کی موت کے حقائق پر جو شکوک و شبہات کی چادر چھائی ہوئی ہے، ابھی تک وہ ہٹائی نہیں جاسکی۔ قائداعظم کو ائیرپورٹ سے لانے والی گاڑی کا پٹرول کیوں ختم ہوگیا؟ اور یہ پہلے چیک کیوں نہیں کیا گیا؟ محترمہ فاطمہ جناح کی وفات کو بھی بعض حلقے دعوے کے ساتھ قتل کی واردات قرار دیتے ہیں۔ وزیراعظم حسین شہید کا انتقال بھی ایک غیر ملک میں انتہائی پراسرار حالات میں ہوا۔ وزیراعظم لیاقت علی خان کے قتل کی تفتیش و تحقیقات بھی سرے نہ چڑھ سکیں نہ ہی جنرل ضیاء الحق کا طیارہ گرائے جانے کا راز ابھی تک کھل سکا۔ اور اب محترمہ کی میت کا پوسٹ مارٹم نہ کروائے جانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے انتہائی نازک معاملات میں ہماری انتظامیہ کا عمومی رویہ کیا ہوتا ہے۔

اس اندوہناک سانحے پر جو ردعمل ملک بھر میں عوام نے ظاہر کیا ہے اور جو خدا جانے کب تک جاری رہے گا۔ وہ ایک قدرتی امر ہے جس میں سرکاری و نجی املاک اور گاڑیوں

وہ اس کے ڈانڈے ہماری خارجہ پالیسی
ہم نے چھوٹے صوبوں کو وہ خود مختاری
ہا برس سے واجب چلی آرہی ہے جبکہ
کہ ہم دہشت گردی کے حوالے سے کسی
محفوظ نہیں رہ گیا جبکہ چھوٹے صوبوں
ضروری ہوگیا ہے۔

ی کا نہ، ظفر
ے ہوئے ہیں

صورتحال دیکھنے میں آرہی ہے، داخلی پالیسی کے علاو
سے بھی ملتے نظر آتے ہیں۔ داخلی صورت یہ ہے ک
ابھی تک فراہم نہیں کی جو آئین کے مطابق بھی بر
مختلف حلقوں کی طرف سے زور دے کر کہا جا رہا ہے
اور کی جنگ لڑ رہے ہیں جس سے ہمارا اپنا دامن بھی
کو وفاق میں رکھنا بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد اور بھ

زندگی میں تو ملا پیار ک
اب کہیں جا کے ہم اللہ کو پیار

ڈاکٹر عامر لیاقت حسین

شہید کو گلاب پسند ہیں، آؤ باغ کی حفاظت کریں!

اے دختر مشرق کے چاہنے والو! دیکھو کہ اسے موت نہیں آئی کیونکہ شہید کبھی مرا نہیں کرتے وہ ہمارے درمیان ہی موجود ہے مگر ہمیں اس کے ہونے کا شعور نہیں انتہا پسندوں نے بہت چاہا کہ اس کی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے مگر وہ بے نظیر تھی اسی لئے کروڑں لہجوں میں سما گئی...... اب ایک بے نظیر نہیں، ان گنت، لاتعداد اور نہ ختم ہونے والی بے نظیر ہر اگتے سورج کیساتھ انتہا پسندوں کی ناکامی کے شب و روز کی گواہی دے گی ہم جانتے ہیں کہ جسم کی موت، کوئی موت نہیں ہوتی، راہ حق کو روشن رکھتے چراغ کبھی بجھا نہیں کرتے پھر یہ اندھیرے کیوں؟ وہ تو چاہتی تھی کہ پاکستان اجالوں کی سرزمین بن جائے، نفرت اور عدم برداشت کے کانٹے صاف کرتے کرتے وہ کچھ دیر کے لیے اوجھل ہی تو ہوئی ہے، پھر یہ شور کیسا؟ وہ کون ہیں جو تمہارے غم کی آڑ میں بے نظیر کے پاکستان کو نقصان پہنچا رہے ہیں یہ سب دیکھ کر بے نظیر کی روح تڑپ رہی ہے۔ اس نے اپنے وطن کے زخموں پر تو اس وقت بھی مرہم رکھا جب اس کے باپ کو پھانسی دیکر شہید کر دیا گیا...... شاہ نواز اور مرتضٰی جیسے ویروں کی شہادت پر بھی ہماری بے نظیر نے صبر کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ہم اتنی جلدی اس کا پیغام بھول گئے، اس کے آخری الفاظ، میرے پاکستان کو شدید خطرات لاحق ہیں'' کیا ہم سے احساس ذمہ داری کا تقاضا نہیں کر رہے...... غم کا پہاڑ تو عاشقان بھٹو پر ٹوٹا ہے لہٰذا بھٹو کے چاہنے والے بھٹو کے پاکستان پر قیامت توڑنے والوں کو معاف نہیں کر سکتے، وہ کہتی تھی کہ مجھے گلاب کی خوشبو بہت پسند ہے، اچھی لگتی ہے، آج پاپا کی پنکی، پاپا کے پاس گلابوں کی خوشبو میں رچ بس کر ملنے گئی ہے۔ تم سے یہ وعدہ لے کر، کہ تم اس کے لئے اس کے گلابوں کے چمن کی ہمیشہ حفاظت کرو گے! اگر گلاب یونہی جلتے رہے تو وہ پاپا کے پاس سکون سے کیسے رہے گی، اسے داتا دربار اور سہون شریف پر حاضری سے روحانی

سکون ملتا تھا، وہ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اور لال شہباز قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی دیوانی تھی، ان کے پیغام امن و محبت کی داعی تھی اسی لئے ''بے قاعدہ لوگوں'' کو اس کا یہ انداز ایک آنکھ نہ بھاتا تھا تو آج بھی ایسوں کو اس کی جسمانی موت کا فائدہ نہ اٹھانے دو۔ آگ لگانے والے تو مسلسل آگ لگا رہے ہیں، احتجاج کے نام پر وطن کے سینے میں گولیوں کی فصل بو رہے ہیں۔ بلاول، بختاور اور آصفہ کے پاکستان کی گلیاں بے گناہوں کے لہو سے دھو رہے ہیں تو کیا ان کی ماں تڑپتی نہ ہوگی ......! تم سب کو داتا دربار اور سیہون والے فقیر کا واسطہ! خاکم بدہن اگر پاکستان نہ رہا تو بھٹو کے نام لیوا کہاں جائیں گے؟ ہماری بی بی پہلے ہی سے بہت دکھی تھی اب پاپا کی پنکی کو اور دکھ نہ دو ساری عمر تکلیفیں سہیں، شوہر اور بچوں سے دوری کا کرب برداشت کیا، بھائیوں کی نعشوں پر خون کے آنسو بہائے، باپ کی موت کا صدمہ سینے میں شیر کا جگر رکھ کر سہا اب اس کے ملک کو برباد کر کے اس کی روح کو تکلیف نہ دو......! املاک کی تباہی اس کی تباہی ہے کسی غریب کی موٹر سائیکل کا غصے کی آگ میں بھسم ہو جانا اس کے افکار کو جلا رہا ہے۔ خدارا ہوش میں آؤ اور بے نظیر کے پاکستان کو بچاؤ......! تمہیں یاد ہے نا کہ وہ نفرت کو ابدی نیند سلانے کیلئے ہمیشہ جاگتی رہتی تھی، سو وہ آج بھی جاگ رہی ہے، اس کے نظریئے کے سفر میں کبھی رات نہیں آئی اور وہ چاہتی ہے کہ ہم بھی جاگتے رہیں انکو سلانے کے لئے جنہیں خوشیوں سے دمکتا ہمارا چہرہ کھٹکتا ہے۔ یہ قاتل پھر آزاد ہو گئے ہیں تمہیں اور مجھے زندگی سے آزاد کرنے کے لیے۔ ارض پاک کو دوبارہ خون سے نہلانے کی سازش کی جا رہی ہے اپنی ساعتوں کو مجتمع کر کے شہید کی پکار سنو! اپنے دل کی فریاد پر کان دھرو! مرنے والا اپنے سینے کی خرخراہٹ نہیں سنتا لیکن اس کے بستر کے قریب بیٹھنے والے ضرور سنتے ہیں۔ ذبح شدہ پرندہ اضطراری طور پر پھڑ پھڑاتا ہے اور نہیں جانتا کہ پھڑ پھڑا رہا ہے لیکن دیکھنے والے جانتے ہیں۔ آج ہم سب دیکھ رہے ہیں 18 اکتوبر سے!...... نہیں! ...... اس سے بھی پہلے نعشوں کو گرتا ہوا، انسانیت کو مرتا ہوا، دن کی وہ کون سی گھڑی ہے جس

میں ہماری روحیں درد سے نہ بے چین ہو کر آہیں نہیں بھرتیں، سال کا وہ کون سا دن ہے جس میں ہمارے دل پیاروں کی یاد میں نالہ و ماتم نہیں کرتے سب جانتے ہیں کہ ہم یاس اور نا امیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہیں بلکہ یوں لکھوں تو زیادہ مناسب ہوگا کہ ظلم کرنے والوں کی شیطانیت کے گھیرے میں ہیں، آج زندگی کی وہ کون سی شے ہے کہ جس کی طرف ہم اشارہ کر کے یہ کہہ سکیں کہ ''یہ ہماری ہے'' اب تو اپنی زندگی کے بارے میں بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ''یہ ہماری ہے'' بہادروں کی طرح جینے والی شیرنی کی طرح ایک ہی جست میں یوں اوجھل ہو جائے گی شاید کسی نے نہ سوچا تھا مگر اب یہ تو سوچو کہ جذبات کے جھونپڑوں میں ہم دردی کے شگافوں سے داخل ہونے والا یہ سیلاب کہاں سے آ رہا ہے۔ جو بے نظیر کے بسائے ہوئے گھروں کو بہالے جانے کے لئے بھپر اجا رہا ہے اس دیس میں شام بوکھلائی اور بے گناہوں کے لہو میں نہائی ہوئی آتی ہے، دانے دنکے کی کھوج میں اپنے آشیانوں سے روز صبح نکلنے والے جانے شام کو گھر پہنچ سکیں گے یا نہیں بس ایک یہی دھڑ کا سا لگا رہتا ہے کہ جیسے جیسے رات تاریک ہو جاتی ہے فائرنگ کی آواز اور تیز ہو جاتی ہے۔ گلیوں میں کھمبے بجنے لگتے ہیں اور معصوم بچے سہم کر اپنی ماؤں کے پیچھے چھپنے لگتے ہیں پھر گھر کے کسی کونے سے آواز آتی ہے بیٹا اندر ہی رہنا! باہر نہ جانا، باہر گولیاں چل رہی ہیں'' اور اس کے کچھ دیر بعد بارود اور لہو کی بو میں بین کرتی جوان بہنوں کی چیخ و پکار، گہنے نوچتی سہاگنوں کا ماتم اور عالم سکوت میں خلا کو گھورتی ماؤں کے سوا فلک کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے بعد دیر تلک سکتہ اور حفاظت کا نیا دستہ ''خبر'' بن کر تعزیت کے لئے آنے والوں کا بہانہ بن جاتا ہے۔ اب یہاں تمدن کی مہک ہے اور نہ معاشرتی تہذیب۔ ہر چیز بے ترتیب ہو چکی ہے، ماضی سے رابطے کا کوئی تصور نہیں اور مستقبل کی کسی کو فکر نہیں۔ بے نظیر اسی فضا کا خاتمہ چاہتی ہے، وہ تمہارے چہروں پر خوف نہیں، لبوں پر مسکراہٹ دیکھنے کی متمنی ہے، سنسناتی ہوئی گولیوں اور دہشت گردوں کی ٹولیوں کے سامنے وہ ایک ڈٹا ہوا پہاڑ ہے، تو کسی

دہشت گرد کو اجازت نہ دو کہ وہ اس نظریاتی پہاڑ پر اپنی شکست خوردہ اور جھنجھلائی ہوئی ضرب بھی لگائے ......! اسے ''تھی'' سمجھو گے تو دہشت گردوں سے ہار جاؤ گے وہ ہے تم جیت جاؤ گے دعا کے لئے اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ بارگاہ ایزدی میں ملتجی ہیں کہ ''اے اللہ پاکستان کی حفاظت فرما'' ......! یہ اس اکیلی کی نہیں ہم سب کی طرف سے دعا ہے، آیئے کہ اس کے ہاتھوں کے ساتھ ہم بھی اپنے ہاتھ اٹھا دیں اور جس کسی کے ہاتھ میں بھی ہتھیار ہیں، اسے بے نظیر کی خاطر ہمیشہ کے لئے گرا دیں، اسے انتہا پسندی تو نہ کھا سکی ...... البتہ بے نظیر نے انتہا پسندی کو شکست ضرور دے دی!!!

عباس اطہر
کنکریاں

کہانی ختم

محترمہ بینظیر بھٹو کی کہانی تمام ہوگئی۔ ساری سیاستیں، مخالفتیں، جماعتیں، نفرتیں اور محبتیں۔ وہ سب کچھ جوان کی زندگی کا حصہ تھا ماضی کا حصہ بن گیا۔ زندگی اور اس کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ کوئی نہیں جانتا۔ اگلے لمحے نے اپنے دامن میں کیا سمیٹ رکھا ہے۔ محترمہ کی 54 سالہ زندگی کے ابتدائی 24 سالوں کو چھوڑ کر باقی 30 برس ایک چار سالہ اقتدار کے سوا سیاسی اور ذاتی دکھوں کی مسلسل کہانی ہے۔ مجموعی طور پر اسے ایک دکھ بھری زندگی ہی کہا جاسکتا ہے۔ وہ 21 جون 1953ء میں پیدا ہوئیں اور 4 جولائی 1977ء تک یقیناً ایک شاندار زندگی گزاری۔

پہلے کراچی میں تعلیم حاصل کی پھر آکسفورڈ چلی گئیں۔ دوران تعلیم انہوں نے اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کی وزارت عظمیٰ کا زمانہ دیکھا۔ وہ انہیں اپنے جانشین کے طور پر تیار کرنا چاہتے تھے۔ وہ کچھ عرصہ پاکستان ٹیلی ویژن پر خارجہ امور پر گفتگو کے ایک پروگرام میں شرکت کرتی رہیں۔ شملہ مذاکرات کے موقع پر بھٹو انہیں اپنے ساتھ لیکر گئے تھے۔ وہ آکسفورڈ میں اپنی تعلیم مکمل کر کے 24 جون 1977ء کو واپس آئیں۔ 5 جولائی 1977 کو جنرل ضیاء الحق نے حکومت کا تختہ الٹ کر بھٹو صاحب کو وزیراعظم ہاؤس سے حراست میں لے لیا۔ چند دن بعد وہ رہا ہو کر کراچی چلے گئے اور پھر انتقام کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ بھٹو قتل کیس میں گرفتار کیے گئے۔ ضمانت پر رہا ہو کر کراچی واپس آئے تو ایک رات 70 کلفٹن پر دھاوا بول کر پورے گھر کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد انہیں مارشل لاء ضابطے کے تحت گرفتار کرلیا۔ مقدمہ چلا، لاہور ہائیکورٹ سے سزائے موت ہوئی پھر سپریم کورٹ سے اس کی توثیق عمل میں آئی۔ 4 اپریل کی رات کو وہ بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند تھیں جبکہ چند میل کے فاصلے پر ان کے عالیشان باپ کو راولپنڈی جیل میں

پھانسی دی جا رہی تھی۔ انہیں تدفین سے پہلے اپنے باپ کا منہ دیکھنے کی اجازت بھی نہیں ملی۔ باپ کے قتل کے بعد ہتھیار ڈالنے کے بجائے، انہوں نے اپنے آپ کو ایک بہادر باپ کی بہادر بیٹی ثابت کیا اور بیگم نصرت بھٹو کی معیت میں انتخابی مہم شروع کر دی۔ انتخابی جلسوں میں پیپلز پارٹی صاف جیتی ہوئی نظر آتی تھی۔ جس کی وجہ سے ضیاء الحق کو انہیں ملتوی کرنا پڑا۔

جس سیاسی زندگی کا خاتمہ 27 دسمبر کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ہوا اس کی ابتدا یہ تھی کہ ''میں چھوٹے جیلر کے سامنے بے بس کھڑی تھی اور میرے ہاتھوں میں بچے کھچے سامان کی ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی اور بس۔ کولون شالیمار کے عطر کی خوشبو ان کے کپڑوں سے ابھی تک آ رہی تھی میں نے ان کی قمیض کو اپنے ساتھ بھینچ لیا اور مجھے اچانک کیتھلین کینیڈی یاد آ گئی۔ جس نے ریڈ کلف میں اپنے سینیٹر والد کے قتل کے بعد اس کا لباس پہن لیا تھا''۔

انہوں نے باپ کا لباس تو نہیں پہنا لیکن ان کا پرچم اٹھا کر اپنی جنگ جاری رکھی۔ چھ مرتبہ نظر بندی کاٹی، جس میں مچھ جیل کی قید سخت بھی شامل تھی، ظلم کے ایک طویل سلسلے سے گزر کر وہ وطن چھوڑ گئیں لیکن لندن میں بیٹھ کر پارٹی کی قیادت کرتی رہیں۔ 10 اپریل 1986ء کو وہ جلاوطنی ختم کر کے لاہور واپس آئیں اور ان کا شاندار استقبال ملک کی تاریخ کا حصہ تھا۔ 1988ء کے انتخابات میں سب سے زیادہ نشستیں لینے والی پارٹی کی سربراہ کے طور پر انہیں وزارت عظمیٰ مل گئی۔ یہ اقتدار 18 ماہ بعد ختم ہو گیا 1993 میں وہ زیادہ طاقت سے منتخب ہو کر دوبارہ اقتدار میں آئیں لیکن یہ دوسری حکومت صرف ڈھائی سال چل سکی اور انہیں کرپشن کے ان گنت مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مقدمے پر سزا سنائے جانے سے ایک دن پہلے وہ ملک سے باہر چلی گئی تھیں۔ یہ جلاوطنی 18 اکتوبر کو ختم ہوئی۔

اور انہوں نے اس طرح کراچی میں لینڈ کیا کہ مزار قائد اعظمؒ تک لاکھوں لوگ ان کے استقبال کیلئے جمع تھے۔ جلاوطنی کے زمانے میں بینظیر کے سب سے چھوٹے بھائی شاہنواز بھٹو کی پراسرار موت ہوئی، دوسرے اقتدار کے خاتمے سے پہلے دوسرے بھائی مرتضیٰ بھٹو کو کراچی کی سڑک پر قتل کر دیا گیا۔

سینیٹر ایڈورڈ کینیڈی نے اپنے دو بڑے بھائیوں کے قتل کے بعد امریکی صدارت کی خواہش ہمیشہ کیلئے ترک کر دی تھی لیکن بینظیر کی بہادری اس کے باوجود برقرار رہی کہ کراچی کے استقبال کے دوران وہ بم دھماکوں میں بال بال بچی تھیں۔ موت کا خوف سر پر مسلسل منڈلاتا رہا لیکن انہوں نے اپنی انتخابی مہم جاری رکھی۔ وہ ووٹوں کی طاقت پر جیتنے اور تیسری بار اقتدار میں آنے کیلئے پر امید تھیں۔ اقتدار شاید اس لئے ہمیشہ ان کی سیاست کا ہدف رہا کہ وہ اپنے مقتول باپ کے مشن سے کسی قیمت پر دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں تھیں۔ پاکستان کے حوالے سے ذوالفقار علی بھٹو کے کچھ خواب تھے جس میں ہمارا ایٹمی پروگرام شامل ہے۔ انہی خوابوں کی تعبیر کے سلسلے میں محترمہ نے پاکستان کو میزائل ٹیکنالوجی کا تحفہ دلوایا۔ بھٹو، پیپلز پارٹی اور بینظیر کیلئے میں نے اپنے عقیدت بھرے جذبات کبھی نہیں چھپائے۔ میں بینظیر صاحبہ پر نکتہ چینی بھی کرتا رہا ہوں خاص طور پر اس حوالے سے کہ انہوں نے موجودہ حکمران سے مفاہمت کو اپنی سیاست اور زندگی کی مجبوری سمجھ لیا تھا اور ایک عالی خاتون ہونے کے باوجود وہ اندازہ نہیں لگا سکیں کہ ملک کے اندر موجود بھٹو کی مخالف طاقتیں ان کا وجود برداشت نہیں کرتیں اور ان کا آخری سیاسی سفر ایک ناگہانی موت پر آ کر ختم ہو سکتا ہے۔ میں بہت کچھ لکھنا اور بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن قلم ساتھ دے رہا ہے نہ دماغ میرے سامنے ٹیلی ویژن سکرین پر محترمہ بینظیر کا بند تابوت باہر لایا جا رہا ہے جو دنیا سے اس طرح رخصت ہوئیں کہ گردن اور سر پر گولیوں کے دو زخم تھے اور دل پر باپ اور دو بھائیوں کے قتل کے داغوں کے علاوہ ایک ایسی ماں کا بوجھ تھا جو مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد ایک چلتی پھرتی لاش میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ایک ہارے ہوئے ملک کو نئی زندگی دی۔ ہم نے اس کے خاندان کا آخری سیاسی چراغ بھی گل کر دیا۔ ہم بھی کیا لوگ ہیں خدا ہم پر رحم کرے۔

عبدالقادر حسن

غیر سیاسی باتیں

جو چلے تو جاں سے گزر گئے

بھٹو خاندان کا آخری خون آلود چراغ بھی اس ملک کے درو بام پر روشن ہو گیا۔ ظلم کی انتہا ہو گئی۔ پہلی بار معلوم ہوا کہ سکتہ طاری ہونے کی کیفیت کیا ہوتی ہے پوری رات گزر چکی ہے ذہن ماؤف ہی رہا اور اب جب چند سطریں لکھنے پر مجبور ہوں کہ اس طرح شاید دل کا غبار قدرے کم ہو جائے تو الفاظ غائب ہیں اور سمجھ میں نہیں آ رہا کہ زندگی بھر جس سے اختلاف کرتے رہے اس کے پاس ایسی کیا کرامت تھی کہ اس کی جدائی نڈھال اور بے حال کر گئی۔ یوں لگ رہا ہے اور ندامت اس حد تک دل و دماغ کے آر پار ہو رہی ہے جیسے آج وہ ہم سب پر طنز کر رہی ہو اور سرخرو ہو کر کہہ رہی ہو کہ۔

مرے چارہ گر کو نوید ہو کہ صف دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر، وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سر کفن میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانکپن پس مرگ ہم نے بھلا دیا

بے نظیر کو پورا پاکستان آنسوؤں، سسکیوں اور غم واندوہ کی انتہاؤں سے گزر کر وداع کر رہا ہے۔ یہ صرف ایک بیٹی، بہن کی موت نہیں اس پر پورا ملک داؤ پر لگ گیا ہے۔ اس سے تو بہت بہتر تھا وہ وطن واپس ہی نہ آتی مگر اسے واپسی کا بہت شوق تھا۔ اس کے لیے اس نے وہ کچھ کیا جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا یا وہ نہیں کرنا چاہتی تھی مگر وہ سب کچھ کر گزری کہ اپنے وطن عزیز کی بہاریں دیکھ سکے جواب اس کے بغیر خزاؤں میں بدلتی جا رہی ہیں۔ وہ وطن لوٹنے سے پہلے ہی بار بار کہہ رہی تھی کہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے اور اس کے دشمن کتنے طاقت ور ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کی کسی حس نے اسے آنے والے خطروں سے آگاہ کر دیا تھا مگر وہ اس کے باوجود اپنی ضد پر قائم رہی۔ اس کی یہ ضد

ہمیں لے ڈوبی۔ آج اگر ایک دوسرے لیڈر میاں نواز شریف یہ نہ کہتے کہ وہ اس کا مشن لے کر چلیں گے اور وہ اس کی میت پر دھاڑیں مار مار کر نہ روتے تو ہماری مایوسی کے اندھیرے ہمیں نگل جاتے۔ کسی نے سچ کہا کہ ملک کی زنجیر ٹوٹ گئی۔ اب پتہ چل رہا ہے کہ ملک بھر میں جو ماتم برپا ہے وہ اسی زنجیر کے ٹوٹ جانے کی صدا اور اس کا ماتم ہے۔ بے نظیر کا قتل جو قوم کے لیے شہادت ہے ہماری حکومت کی انتہائی غفلت، لاپرواہی یا نالائقی کا المیہ ہے۔ جس طرح یہ سانحہ سامنے آیا اس کی تفصیلات بتاتی ہیں۔ کہ ان کی حفاظت کی طرف سے مکمل غفلت کا ثبوت دیا گیا ان کی گاڑی کو تیز رفتاری سے روانہ ہونا تھا لیکن پولیس وغیرہ کی بھاری نفری بھی اس کا راستہ صاف نہ کر سکی اور بہادر خاتون نعروں کا جواب دینے پر مجبور ہو کر گاڑی کی چھت کھلوا کر سامنے آئی تو مشاق نشانہ باز نے اس کے سر کو نشانہ بنایا اور وہ گاڑی میں گرتے ہی ختم ہو گئیں۔ جی ایچ کیو کی نظروں کے سامنے پاکستان کی امید کا چراغ گل ہو گیا۔ بے نظیر کی شہادت لاتعداد سوال چھوڑ گئی ہے اور یہ سارے سوال اس ملک کے مستقبل کے بارے میں ہیں۔ اب یہ میاں نواز شریف کی فہم و فراست اور جرات و جسارت پر منحصر ہے وہ بے نظیر کا خلا کس طرح پر کرتے ہیں کیونکہ بدقسمتی سے پیپلز پارٹی میں اب کوئی ایسی شخصیت دکھائی نہیں دیتی جو بے نظیر کے ورثے کو سنبھال سکے۔ ان کی شہادت سے پیپلز پارٹی کا گھر اجڑ گیا ہے ان کی ایک بہن صنم بی بی زندہ ہے لیکن اس کا سیاست سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ بے نظیر شہید کی ماں اگر ہوش میں ہیں تو اس چوتھے قتل کو برداشت کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا پورا خاندان اس ملک کی نذر ہو گیا، باقی کچھ نہیں بچا۔

چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتل شہر میں
یہ مزار اہل صفا کے ہیں، یہ ہیں اہل صدق کی تربتیں

اس وقت سوگ اور سکتے کی جو کیفیت پورے ملک پر چھائی ہوئی ہے اور لوگ یا تو گھروں میں سرنگوں ہو کر غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے ہیں یا پھر وہ بے تاب ہو کر باہر نکلتے ہیں اور دیوانہ وار سب کچھ تہس نہس کرتے چلے جاتے ہیں۔ عام پاکستانی حکمرانوں کو ایک

فریق سمجھ رہا ہے اس لیے وہ کسی سرکاری اپیل پر کان نہیں دھر رہا۔ الیکشن کو تو فی الحال خواب ہی سمجھا جائے۔ فی الوقت تو اس سانحہ کے فوری اثرات سے عہدہ برآ ہونا ہے اور قوم کو حوصلہ دلانا ہے کہ وہ اس غم کی گھڑی میں تنہا نہیں ہے قیادت سے محروم نہیں ہے۔ پیپلز پارٹی کی باقی ماندہ قیادت اور ملک کے دوسرے سیاستدانوں کا اب واحد فرض یہ ہے کہ وہ سب مل کر ایک ''بے نظیر'' بن جائیں اور اس عظیم نقصان کے ازالے کی فکر کریں۔ شکر ہے کہ میاں نواز نے اس کا احساس کیا ہے۔ جو اتفاق سے بچ نکلے تھے کیونکہ اس سانحہ سے کچھ پہلے ان کے استقبالیہ کیمپ پر حملہ ہوا جس سے چار کارکن جاں بحق ہو گئے جو میاں صاحب کے لیے ایک وارننگ تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دست قاتل کتنا دراز ہے اور اس کی خون کی پیاس کس قدر اسے ہلکان کئے ہوئے ہے۔ بات صرف ایک شہادت پر ختم نہیں ہوتی، آگے چل کر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی کی جان کی حفاظت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں،

''زندگی کی سب سے بڑی محافظ موت ہوتی ہے''

اور یہ موت اللہ کے اختیار میں ہے لیکن جان بچانا بھی فرض ہے۔ یہ فرض ہر کسی کو خود ہی ادا کرنا ہے کیونکہ حکومت نے تو لگتا ہے ہماری جان و مال سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔

میں جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو بھٹو خاندان کے قبرستان میں ایک اور مکین پہنچ چکا ہو گا۔

ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا
لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آ گیا

عرفان صدیقی

نقشِ خیال

کس کی زنجیر ہلائیں......!

بے نظیر بھٹو اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ سانحہ ہو گیا کہانیاں رہ گئی ہیں۔ سب سے بڑی حقیقت یہی ہے کہ پیپلز پارٹی یتیم ہو گئی ہے۔ اس پارٹی کا ضمیر ہی بھٹو کے عشق سے اٹھا اور اسی عشق میں گندھ کر جنوں بن گیا۔ ایک فوجی حکمران کے عہد میں ذوالفقار علی بھٹو صلیب پر جھول گئے۔ اس گہرے زخم نے بھٹو کے عشاق کو سرفروش جیالوں میں بدل دیا۔ بینظیر بھٹو نے باپ کی سیاسی وراثت سنبھالی۔ جیالوں نے اسے بھٹو کی نشانی جان کر سر آنکھوں پر بٹھایا اسے چاہا اسے پوجا۔ سیاست میں ایسی گہری عقیدت کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ بھٹو خاندان کو چاہنے والوں نے بے کراں محبتوں سے مالا مال کر دیا۔ باپ ایک بحرانی دور میں پاکستان کا توانا وزیر اعظم رہا۔ پیپلز پارٹی گیارہ برس تک مارشل لاء کے تازیانے کھاتی رہی۔ جونہی مطلع صاف ہوا بھٹو کی بیٹی وزارت عظمیٰ کے منصب پہ فائز ہو گئی۔ اسے دوبارہ یہ اعزاز ملا۔ ایک بار بھی وہ اپنے عہدے کی میعاد پوری نہ کر سکی۔ حالات کے جبر نے اسے طویل جلاوطنی پر مجبور کر دیا۔ بصد مشکل وہ وطن واپس پہنچیں اور سفاک بندوبست کے قہر کا نشانہ بن گئی۔

پیپلز پارٹی اور محترمہ بینظیر بھٹو کی سیاسی فکر اور انداز سیاست سے اختلاف کرنے والوں کی کمی نہیں۔ سیاستدان کتنا ہی محبوب کیوں نہ ہو ان سے نفرت کی حد تک اختلاف کرنے والے بھی ضرور ہوتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشرف بندوبست کی ہزار کوششوں کے باوجود آج بھی سولہ کروڑ پاکستانی بڑی حد تک دو دھڑوں میں تقسیم ہیں۔ کم وبیش 60 فیصد ووٹرز نواز شریف اور بینظیر میں تقسیم تھے اور باقی کے چالیس فیصد کے لگ بھگ دیگر جماعتوں میں۔ ساڑھے آٹھ برس کے دوران اس بے چہرہ بندوبست کی کوکھ سے کوئی لیڈر جنم نہ لے سکا۔ نتیجہ یہ کہ انتخابات کا اعلان ہوتے ہی نواز شریف اور بینظیر بھٹو

کے سوا سب بتاشے کی طرح بیٹھ گئے۔ دونوں نے عوام کے بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کیا۔ صاف دکھائی دینے لگا تھا کہ دھاندلی سے پاک انتخابات کی صورت میں مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی مشترکہ طور پر دو تہائی اکثریت بھی حاصل کر سکتی ہیں۔ صدر مشرف (ق) اور ایم کیو ایم سے مشاورت کے بعد اپنے ڈھب کی نگران حکومتیں بنا چکے تھے۔ انہوں نے اپنی پسند کا چیف الیکشن کمشنر بھی تعینات کر رکھا تھا۔ نچلی سطح پر طاقت کے تمام سر چشموں پر قابض ضلعی حکومتیں پنجے گاڑے بیٹھی تھیں۔ (ق) لیگ نے اربوں کے فنڈز سے ایک بڑی اشتہاری مہم بھی شروع کر رکھی تھی۔ 21 اضلاع میں دھاندلی کے انتظامات کو حتمی شکل دی جا چکی تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں شناختی کارڈ تیار ہو رہے تھے۔ لیکن نواز شریف اور بینظیر کے جلسوں اور جلوسوں نے ایک نئی تصویر ابھار دی۔ قومی اور بین الاقوامی میڈیا کو صاف دکھائی دینے لگا تھا کہ (ق) لیگ تحلیل ہو چکی ہے۔ نواز شریف اور بینظیر بھاری اکثریت حاصل کریں گے۔ حالات ایک ایسے موڑ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ بڑے پیمانے کی دھاندلی بھی رنگ نہ جما سکتی اور ردعمل اتنا شدید ہوتا کہ سنبھالے نہ سنبھلتا۔

بینظیر بھٹو کے قتل کے بعد ملکی سیاست کا منظر نامہ یکسر تبدیل ہو گیا ہے۔ کم از کم دیہی سندھ کی حد تک کوئی لیڈر باقی نہیں رہا جس پر سندھی یکسو ہوں۔ بینظیر بھٹو نے سندھی ہونے کے باوجود کبھی اپنے آپ کو سندھ کی حد تک محدود نہ کیا۔ وہ قومی سیاست کرتی اور وفاق کی زنجیر کہلاتی رہیں۔ اب دیکھنا ہو گا کہ سندھ کس کی جھولی میں گرتا ہے۔ قومی سطح پر بھی یہ ایک بڑا زیاں ہے کہ دو بڑی سیاسی جماعتوں میں سے ایک لیڈر سے محروم ہو گئی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اب پیپلز پارٹی کس آشوب سے گزرے گی۔ قیادت کی باگ دوڑ کون سنبھالے گا؟ بھٹو کے نام سے منسوب پارٹی کیا آسانی کے ساتھ زرداری کے لاحقے سے منسلک ہو جائے گی؟ فوری سوال یہ ہے کہ کیا پیپلز پارٹی بدستور الیکشن میں رہے گی یا وہ بھی بائیکاٹ کا راستہ اختیار کرے گی؟ ممکن ہے کچھ لوگ بینظیر کے لہو کو اپنی انتخابی مہم کا غازہ بنانے کی کوشش کریں لیکن یہ ایک بڑی بھول ہو گی۔ پی پی کے دلگیر اور غم زدہ کارکن

جواب مشتعل بھی ہیں، اس کھیل کو کسی طور پسند نہیں کریں گے۔ اب مسلم لیگ (ق) کے امیدواروں کے لئے بھی گھروں سے نکلنا اور انتخابی مہم میں شریک ہونا ممکن نہیں رہا۔ قیاس ہے کہ اگلے ایک دو دنوں میں خود حکومت کی طرف سے انتخابات ملتوی کر دینے کا اعلان ہو جائے گا۔

لیکن پھر کیا ہو گا؟ اس کا فیصلہ صرف ایک ہی شخص کر سکتا ہے۔ جس کا نام پرویز مشرف ہے۔ ایک راستہ یہ ہے کہ وہ پہلے ہی کی طرح اب بھی اپنے آپ کو ناگزیر خیال کرتے ہوئے ساری توجہ اپنے اقتدار کی مضبوطی پر مرکوز کر دیں۔ ملک کے طول و عرض میں پھوٹ پڑنے والے ہنگاموں کو سختی سے کچل دیں۔ تیسری بار ایمرجنسی مارشل لاء نافذ کر دیں۔ تیسری بار آئین معطل کر کے پی سی او حکمرانی کے نئے دور کا آغاز کر دیں۔ انتخابات کے دفتر کو لپیٹ کر طاقت کے زور پر اپنا سکہ جمائے رکھیں۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ شدید بحرانی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے وجود کی نفی کر کے نئے امکانات کے دریچے کھول دیں۔ اقتدار سے الگ ہو جائیں۔ اقتدار آئین کے تقاضوں کے مطابق چیئر مین سینٹ کے سپرد کریں۔ سیاسی جماعتوں کی مشاورت کے ساتھ اتفاق رائے کی قومی حکومت قائم کی جائے۔ یہ حکومت کھیل کے نئے اصول وضع کرے۔ زیادہ با اختیار الیکشن کمیشن اور زیادہ موثر چیف الیکشن کمشنر تعینات کرے اور صحیح معنوں میں منصفانہ انتخابات کے بعد اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دے۔ اگر صدر مشرف پہلے راستے کا انتخاب کرتے ہیں تو ملک بدستور بے چینی، بدامنی اور بے یقینی کی گرفت میں رہے گا۔ لاوا پکتا اور سڑکوں پر بہتا رہے گا۔ اس سانحے سے بھی پہلے وکلا، صحافی، طلبہ، انسانی حقوق کی تنظمیں اور سول سوسائٹی کے مختلف طبقے سراپا احتجاج تھے۔ کچھ سیاسی جماعتیں بائیکاٹ کئے بیٹھی تھیں۔ اب مسلم لیگ (ن) بھی بائیکاٹ کا فیصلہ کر کے اس احتجاجی مہم کا حصہ بن چکی ہے۔ مسلم لیگ (ق) خس و خاشاک ہو چکی ہے۔ وہ جناب صدر کے کسی کام کی نہیں رہی۔ ان حالات میں اگر صدر پرویز مشرف اپنے اقتدار کو ہی بالاترین ترجیح بنائے رکھتے ہیں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ

پاکستان پر کیا گزرے گی۔ 1971ء کے سانحے کی کم نصیب ساعت سے پہلے کئی مرحلے آئے جب جنرل یحیٰ خان، اپنی ذات کو ایک طرف رکھتے ہوئے پاکستان کی خاطر کوئی بڑا فیصلہ کر سکتے تھے لیکن وہ ایک بڑے المیے کا انتظار کرتے رہے۔ اب دیوار پر لکھا دکھائی دے رہا ہے۔ کہ اگر صدر پرویز مشرف اپنی ''کنٹی نیوٹی'' پر مصر رہتے ہیں تو آزاد نہ و منصفانہ انتخابات کا انعقاد سوالیہ نشان بنا رہے گا...... اور اگر قابل اعتبار انتخابات کے ذریعے عوام کی امنگوں کی ترجمان قیادت برسر کار نہیں آتی تو وفاق پاکستان شدید خطرات سے دوچار رہے گا۔

یہ سب بجا لیکن ہم کس سے سوال کریں؟ کس کی زنجیر ہلائیں؟ کسے پکاریں؟ کس دیوار سے سر پھوڑیں؟ کس کے سامنے ہاتھ جوڑیں؟ کوئی ہے جو میرے پاکستان کی چارہ گری کرے۔

عطاء الحق قاسمی

روزنِ دیوار سے

محترمہ کی شہادت کا ''خوں بہا؟''

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر القاعدہ کا وجود ختم ہو گیا تو ہم قتل کا الزام کس پر عائد کیا کریں گے؟ پاکستان کی بیٹی بے نظیر کو شہید کر دیا گیا اور اگلے ہی لمحے ثابت ہو گیا کہ اس کی ذمہ دار القاعدہ ہے۔ میں حیران ہوں کہ ابھی تک ذوالفقار علی بھٹو، شاہنواز بھٹو اور مرتضٰی بھٹو کے قتل کو القاعدہ کے کھاتے میں کیوں نہیں ڈالا گیا اور اکبر بگٹی کو بھی اس سے محروم کیوں رکھا گیا؟ پاکستان میں جو بھی المناک واقعہ رونما ہوتا ہے اس کی ذمہ دار القاعدہ ہوتی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کبھی ان المیوں میں شریک نہیں ہوتی۔ لیکن اس ''حقیقت'' کو تسلیم کرنے کے باوجود سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے بار بار توجہ دلانے کے باوجود ان کی سکیورٹی کا معقول بندوبست کیوں نہیں کیا۔ ابھی دو روز قبل رحمان ملک نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ گاڑیوں میں نصب جیمرز ناقص ہیں مگر اس کا نوٹس نہیں لیا گیا، اس کے علاوہ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ قاتل محترمہ کے اتنے قریب کیسے پہنچ گیا کہ اسے محترمہ کو پستول سے نشانہ بنانے میں بھی کوئی پرابلم نہیں ہوا جبکہ بیک اسٹیج پر عوام کا انتشار بھی نہیں تھا کہ قاتل کو اس بھیڑ میں داخل ہونے کا موقع مل جاتا۔ سوال تو بہت سے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پرویز مشرف کے آٹھ سالہ دور میں حکومتی شخصیتوں کو نشانہ تو بنایا گیا لیکن خدا کا شکر ہے حملہ آور ان میں سے کسی کی ٹارگٹ کلنگ میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ بھی ملک کے لئے ایک سانحہ ہوتا کہ قتل کسی گنہگار کا ہو یا کسی بے گناہ کا اپنے پیچھے بے شمار بحران چھوڑ جاتا ہے۔ تاہم ''القاعدہ'' ایسی ''ماڈرن سائنس اور ٹیکنالوجی کی ماہر'' دہشتگرد تنظیم جو امریکہ کے قلب میں نہایت حساس اور نہایت ٹیکنیکل قسم کے آپریشن کے ذریعے ہزاروں امریکیوں کو ہلاک کر سکتی ہے۔ (اگر یہ کام واقعی ان غاروں میں رہنے والوں نے کیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ وہ آٹھ سالوں کے دوران تمام کوششوں کے باوجود سربراہ مملکت تو کیا

کسی وزیر کی ٹارگٹ کلنگ بھی نہیں کر سکی مگر اس کے برعکس صرف چند دنوں میں وہ اپوزیشن کی ایک بہت بڑی شخصیت کو مارنے میں کامیاب ہو جاتی ہے؟ پاکستانیوں کے ذہنوں میں یہ سوالات موجود ہیں اور انہیں ان کے جوابات ملنا چاہئیں۔

پرویز مشرف صاحب کی حکومت کی یہ بہت واضح اور برملا خواہش تھی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف وزیر اعظم نہ بنیں کیونکہ مقبول لیڈر اسٹیبلشمنٹ کے لئے قابل قبول

ت میں حصہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے یعنی متوقع
ں بہا وصول کر کے پرویز مشرف کو سہارا دیتی
عوامی قوتوں کے ساتھ مل کر اس دہشت گردی
کرتی ہے جواب تک محترمہ بے نظیر بھٹو سمیت
رنگ چکا ہے اس سوال کا جواب آنے والے
یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ پیپلز پارٹی کی باقی
ت کا رخ جمہوری قوتوں کے اتحاد کی طرف
ہیں؟۔

ی خبر ملی تو پاکستان کے کروڑوں عوام کی طرح
یں لے کر بھینچ رہا ہو۔ مجھے سانس لینے کے
فون کی گھنٹیاں بج رہی تھیں مگر میں خود کو کسی
۔ اس صورتحال میں میرا فوری ردعمل یہ تھا بلکہ
اسکرین پر نمودار ہوں گے اور وہ اس سانحہ کی
کہ وہ عہدہ صدارت سے مستعفی ہوتے ہیں۔

کہ وہ اتنے بڑے سانحہ کو ہضم کر کے انتخابات
اقتدار کی صورت میں اپنی رہنما کے قتل کا خون
ہے یا وہ خون بہا لینے سے انکاری ہوتی ہے اور
کے نظام سے نجات دلانے کے لئے جدو جہد
ہزاروں بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ
دنوں میں مل جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ
ماندہ قیادت کی ترجیحات کیا ہیں اور ان ترجیحا
ہے یا وہ اسٹیبلشمنٹ کی خواہشات کی آئینہ دار

گزشتہ روز جب مجھے محترمہ کی شہادت کی
مجھے بھی ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی میرا دل مٹھی
لیے ان ہیلر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میرے
سے بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں پاتا تھا۔
مجھے یقین تھا کہ ابھی صدر پرویز مشرف ٹی وی
ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اعلان کریں گے

وہ اپنی تقریر میں قومی حکومت کے قیام کی بات کریں گے۔ جو ایک معینہ مدت میں انتخابات کرائے گی اس کی بجائے پرویز مشرف نے اسکرین پر آ کر فرمایا کہ وہ ''دہشت گردی'' کو ختم کر کے دم لیں گے دوسرے لفظوں میں وہ اس وقت تک برسر اقتدار رہیں گے جب تک

[illegible]

ت صرف یہی ہے کہ پرویز مشرف بھی فوری طور
کے بعد قومی حکومت کی نگرانی میں عام انتخابات کا
راراستہ منتخب کیا گیا تو یہ پاکستانی قوم سمندر میں
گردونواح میں لے جانے کے مترادف ہوگی جو
لے ہر جہاز کو اپنی طرف کھینچ کر نگل جاتا ہے اور
نزدیک بے نظیر بھٹو کی شہادت کا خوں بہا اگر لینا
مہوری قوتوں کی فتح کی صورت میں وصول کرنا
گا اسے قوم خوں بہا نہیں سمجھے گی بلکہ یہ سمجھے گی کہ

آئینہ دار ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب راہ نجا
پر عہدہ صدارت سے استعفیٰ دیں اور اس ک
انعقاد کیا جائے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی دوس
واقع ایک کشش ثقل برمودا ٹرائی اینگل کے گ
اپنی سطح پر تیرنے والے اور فضا میں اڑنے وا
پھر اس کا سراغ تک نہیں ملتا۔ چنانچہ میرے
ہے تو یہ خوں بہا آمریت سے نجات اور جم
چاہیے اس کے سوا کہ جو بھی وصول کیا جائے گ
شہید کے خون کا سودا کر لیا گیا ہے۔

فاطمہ احمد

بینظیر زندگی، بینظیر موت

میر انیس نے کہا تھا۔

انیس کوئی دم کا بھروسہ ہے ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

میں نے اس شعر کو ایک دفعہ نہیں ہزاروں دفعہ پڑھا، گنگنایا اور ہر مرتبہ کے مطالب و معنی کی گرہیں کسی نہ کسی دوسرے زاویے سے کھلتی چلی گئیں۔ ذاکروں نے جلسوں میں اس شعر کا استعمال واقعہ کربلا کے مناظر بیان کرنے میں بڑی خوبصورتی سے حضرت عباس علمبردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کیا ہے۔ جب وہ مشکیزہ اٹھا کر دریائے فرات کی طرف بڑھنے والے تھے اس وقت بھی اس شعر نے اس کا منظر سمجھنے میں میری بہت مدد کی واقعی شاعر لوگ بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں وہ افسانوں کو ایک شعر میں قید کرنے اور خیالات کو آبشار جو میں بہا دیتے ہیں میں خود بھی شعر کہتی ہوں اور جانتی ہوں کہ اچھا شعر مہینوں مجھے ماہی بے آب کی طرح تڑپا دیتا ہے مگر انیس نے تو حد ہی کر دی ہے۔ اس شعر میں اس نے کیا اشارہ دیا ہے۔ چراغ لے کے ہوا کے سامنے کون ذی ہوش ہو جاتا ہے مگر کچھ لوگوں کو ہوا کے دوش پر چراغ جلانے کا شوق ہوتا ہے وہ اس طرح کے خطرات میں کود جانے کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ ان ہی دیوانوں میں ایک فرزانی ہماری بینظیر بھٹو تھی۔ جس کو سمجھانے والوں نے سمجھایا کہ چراغ لے کر تم کہاں ہوا کے سامنے جا رہی ہو۔ مگر وہ کہاں مانتی تھی اس کو زندگی سے جتنا پیار تھا اس سے بہت زیادہ تو وہ موت پر فریفتہ تھی۔ 27 دسمبر 2007ء کی شام اس کے چاہنے والوں کے لیے شام غریباں ثابت ہوئی۔ ظالموں نے اس ہر دلعزیز قائد کو ہم سے جتنی جلدی چھین لیا اس کی توقع نہ تھی۔ وہ اپنی آصفہ، بختاور اور بلاول کو ہی آزردہ نہیں کر گئی بلکہ پاکستان کے 16 کروڑ عوام کو سوگوار کر دیا۔ اس طرز کی موت ہم نے پہلے نہ دیکھی نہ سنی اس نے جینے کا ڈھب ہی خوبصورت ایجاد کیا تھا اور اپنے مرنے کی طرز بھی خوب شان اور دھج سے تخلیق کی اس کے سینے

میں جو تڑپ تھی اس کا نکھار اس کے مرنے کی ہر ادا میں ہویدا تھا۔ اس کے مرنے کا وقار مثل ہے اور اس کے جینے کی ادا بھی پوری طرح زندہ ہے اس کو مارنے والے ہمشیہ کے لیے مر گئے اور مرنے والی ہمیشہ کے لیے زندہ ہوگئی اس کو اب کوئی نہیں مار سکے گا۔ مارنے والے روز مرتے رہیں گے بینظیر زندگی اور بینظیر موت ہم نے صدیوں کے بعد اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ ایسی موت روز روز کسی کو نصیب نہیں ہوتی لیکن اس وقت پاکستان کو اس طرح کی موت کی ضرورت نہ تھی۔ اس موت سے جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے اور جو سیاسی خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی نہ پر ہوگا۔ اپنے والد سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی جانشین نے شہید کی جانشینی کا حق ادا کر دیا ہے۔ اپنے والد کے نقش پا پر چلتی ہوئی جمہوریت کی شمع ہتھیلی پر رکھ کر خیبر سے کراچی تک، گلگت سے گوادر تک اور سکر دو سے سکھر تک چاروں صوبوں میں وفاق کی علامت بن کر اپنی جان تک قربان کر دی۔ اس کی سیاست کے بارے میں سیاست دان ہی روشنی ڈالیں گے۔ مگر میرے جذبات بینظیر کی محبت اور اس کی جدائی میں اسی نوعیت کے ہیں جو میں قرطاس پر قلم برداشتہ رقم کر رہی ہوں۔ اس کی موت سے جن لوگوں کو فائدہ ہونا تھا وہ بھی نقصان میں چلے گئے ہیں۔ قاتل کتنا ظالم تھا اس نے اتنا بڑا ظلم کیا چاروں صوبوں کی زنجیر کی کڑیوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ قاتل کو کیا خبر تھی کہ وہ اس ہستی کو جس کے اشارہ چشم و ابرو پر اس کے جانثار اپنی ہزاروں جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ اس کو ختم کرنے کا تصور ہی اس نے کیوں کر کیا۔ بینظیر بھٹو سے آپ سیاسی اختلاف کر سکتے تھے۔ اس کے وجود کو نابود کرنے سے آپ کو کیا ملا۔ عبث ہم ان طاقتوں پر الزام تراشی کرتے رہے ہیں کہ یہ فلاں نے حرکت کی ہے یہ فلاں نے قتل کروایا۔ ہم ذرا سوچیں تو معلوم ہوگا کہ ہم آلہ کار بن کر یہ قیامت برپا کرتے ہیں اور پھر دوسروں پر الزام دھرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں جس نے ایک شخص کو قتل کیا اس نے گویا پوری انسانیت کو قتل کیا بینظیر کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ اس کی زندگی بینظیر تھی اس نے اپنی موت کو بھی بینظیر بنا دیا اللہ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ آصفہ، بختاور اور بلاول کا اللہ حامی و ناصر ہو۔

مجیب الرحمٰن شامی

وفاق پاکستان کی ''بے نظیر علامت''

محترمہ بے نظیر بھٹو اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ پاکستانی جمہوریت کو توانائی بخشتے وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں، جام شہادت نوش کر لیا، اور زندہ جاوید ہو گئیں...... اپنے لاکھوں، کروڑوں پرستاروں کو، جانثاروں کو، زندہ درگور کر گئیں...... موت ان کے تعاقب میں تھی۔ 18 اکتوبر کو وہ وطن واپس پہنچیں تو ان پر شدید حملہ ہوا لیکن انہوں نے موت کو شکست دے دی، خون کی ندیاں بہیں لیکن بے نظیر بھٹو نے گھر بیٹھے سے انکار کر دیا۔ ان کا اعلان تھا کہ وہ عوام کی طاقت سے پاکستان کا منظر تبدیل کر دیں گی۔ وہ صوبہ صوبہ پہنچیں، شہر شہر پھریں، کوئٹہ گئیں، پشاور گئیں، اور ہر جگہ اپنا پیغام پہنچایا...... اب ان کا رخ پنجاب کی طرف تھا اور راولپنڈی کے لیاقت باغ سے انہوں نے اپنے انتخابی سفر کا آغاز کرنا تھا۔

لیاقت باغ...... وہ باغ جس میں برسوں پہلے پاکستان کے پہلے منتخب وزیر اعظم لیاقت علی خان کو گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے عہد میں عبدالولی خان اپنے متعدد کارکنوں کی لاشیں اٹھا کر پشاور جانے پر مجبور ہوئے تھے کہ ان کے جلسے کو درہم برہم کر دیا گیا تھا اور اس پر گولیاں چلائی گئیں تھیں جس سے چند قدم کے فاصلے پر واقع جیل میں پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے پھانسی کا پھندا چوما تھا۔ اور تاریخ کو ایک نیا رخ دے دیا تھا۔ اسی لیاقت باغ کے باہر محترمہ بے نظیر بھٹو...... پاکستان کی سابق اور متوقع وزیر اعظم...... کی جان لے لی گئی۔ کئی دوسرے پُر امن اور بے گناہ پاکستانی بھی جاں بحق ہوئے۔ پاکستانی سیاست کے سر سے چادر اتار لی گئی اور جمہوریت کا چہرہ خون آلود ہو گیا۔

ابتدائی خبر یہ تھی کہ خودکش حملے سے پہلے گولیاں چلائی گئی تھیں اور ایک گولی بے نظیر کی گردن پر لگی، پھر بتایا گیا کہ وہ گولی کا نشانہ نہیں بنیں بلکہ خودکش حملہ آور کے پیدا کردہ دھماکے نے ان کے دل کی دھڑکن بند کر دی...... اور وہ جو پاکستانی سیاست کی دل کی دھڑکن

تھیں، وہ جو دلوں کو زندگی بخشتی تھیں، ان کے دل کو زندہ نہ رکھا جاسکا۔ ان کا دل ڈاکٹروں کی تمام تر کوشش کے باوجود حرکت میں نہ آسکا۔ بے نظیر بھٹو عالم اسلام کی پہلی خاتون وزیراعظم تھیں...... ذوالفقار علی بھٹو کی دختر بلند اختر...... بڑے باپ کی بڑی بیٹی، عوامی سیاست پر یقین رکھنے والی اور جمہوری عمل کو پاکستان کیلئے آب حیات قرار دینے والی...... وہ بڑے نشیب وفراز سے گزریں۔ ان کے خاندانوں کو کئی سانحوں کا سامنا کرنا پڑا۔ والد اور دو بھائیوں کی غیر فطری موت کا صدمہ اٹھایا، پاکستان اور جمہوریت پر ان کا ایمان غیر متزلزل رہا...... وہ وفاق پاکستان کی بے نظیر علامت تھیں۔ ان کے والد نے پاکستان کا ایٹمی پروگرام شروع کیا، پاکستان کو ناقابل شکست بنانے کیلئے ایٹمی طاقت بنانے کا خواب دیکھا تو خود مرحومہ نے پاکستان کو میزائل ٹیکنالوجی دینے کیلئے دن رات ایک کئے اور پاکستان کے دفاع کو ایک نئی قوت بخش دی۔

بے نظیر بھٹو نے جس انتخابی مہم میں جان دی بہت بڑی حد تک وہ انہی کی مرہون منت تھی۔ بلاشبہ وہ ایک رہنما تھیں۔ ان کا ایک ''ویژن'' تھا۔ وہ بھیڑ میں گم ہو جانے والی نہیں، اپنی منزل اور اپنے راستے کے واضح تصورات رکھنے والی تھیں وہ نہ ہوتیں تو 8 جنوری کے انتخابات مشکوک رہتے، انتخابی مہم رواں نہ ہو پاتی، وہ انتخابات کے بائیکاٹ کی مہم میں شریک ہو جاتیں تو آج کا منظر بالکل مختلف ہوتا، انہوں نے اپنے فیصلے آپ کئے اور سیاست کو اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کر دیا۔ دہشت گردوں سے ڈرنے، اور ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا اور مردانہ وار ان کو للکارتی رہیں۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ وہ عوام کی طاقت سے دہشت گردوں کو شکست دے کر رہیں گی۔

صدر پرویز مشرف نے اس بڑے سانحہ پر 3 روز تک سوگ منانے کا اعلان کیا ہے، اس دوران پرچم سرنگوں رہے گا ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے، ان کی قربانی کو قبول کرے اور ان کے پسماندگان...... جن میں ان کے شوہر، بچے، ہوش وحواس سے محروم والدہ، بہن، دیگر عزیز اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کروڑوں افراد شامل ہیں...... کو

صبر دے۔

محترمہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے ضروری ہے کہ انتخابی عمل کو جاری رکھا جائے۔ انتخابات شفاف ہوں اور ضرور ہوں۔ وفاق پاکستان کی حفاظت کیلئے سب سینہ سپر رہیں۔ پاکستان کے تمام ذمہ دار اور سیاسی جماعتیں سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایک دوسرے کی لغزشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے نئے جذبے اور نئے رنگ سے آگے بڑھنے کا اعلان کریں۔ بے نظیر تو اپنے امتحان میں کامیاب ہوگئیں لیکن وہ سب اہل سیاست جو ابھی عرصہ امتحان میں ہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں...... پاکستان ان سے صبر وتحمل، برداشت، عزم اور حوصلے کی توقع رکھتا ہے، خدا خیر کرے! وہ اسے مایوس نہ کریں...... پاکستان زندہ باد...... بے نظیر زندہ باد۔

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

بے نیازیاں

شہید بے نظیر

بہت کم عورتیں ہوں گی جن کے ساتھ شہید کا لفظ لگتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آنسوؤں کی بے بسی میں ڈوبتے ہوئے کیسے یہ بات لکھ رہا ہوں کہ وہ ایک خوش قسمت عورت تھی بلکہ ہے۔ مقتول کیلئے یہ اعزاز تو ہے کہ قاتل نہیں۔ مقتول کیلئے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ وہ ظالم نہیں۔ پاکستان میں بڑے بڑے ظلم ہوئے اور ہو رہے ہیں مگر یہ ظلم بہت بڑا ہے۔ یہ ظلم بھٹو کے عدالتی قتل سے کم ظلم نہیں۔ یہ المناک، دردناک، شرمناک اور خطرناک ہے۔ امر ہونے کیلئے مرنا ضروری ہے۔ اس کی زندگی میں بھی مجھے پتہ تھا کہ وہ بڑی عورت ہے۔ مرنے کے بعد ان لوگوں کو بھی پتہ چل گیا ہے جو اسے نہیں مانتے تھے۔ بھٹو بھی ایک متنازعہ لیڈر تھا۔ محبوب ہونے کیلئے متنازعہ ہونا شاید ضروری ہے مگر اب اس کے دوست دشمن ایک طرح سے اس کے مداح ہیں۔ شہید بے نظیر بھٹو اپنے والد شہید ذوالفقار علی بھٹو کی سچی بیٹی تھی۔ وہ جو صرف بیٹے بیٹیاں ہوتی ہیں انہیں سمجھایا نہیں جا سکتا کہ سچی بیٹی ہونا کیا ہوتا ہے۔ اس کیلئے اب یہ کہنا کافی ہے کہ جیسے بے نظیر بھٹو ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی تھی، بھٹو وزیراعظم ہوا تو بے نظیر بھٹو وزیراعظم ہوئی، بھٹو شہید ہوا تو بھٹو کی بیٹی بھی شہید ہوئی۔ پھانسی کا پھندا بھٹو کی گردن میں ڈالا گیا۔ اب بے نظیر بھٹو کی گردن میں بھی گولی لگی۔ وہ لہو جو تختہ دار پر لٹکے ہوئے بھٹو کے بدن میں جذب ہو گیا تھا، وہ لہو بے نظیر بھٹو کے بدن سے چھلک کر ایک سیل رواں کی طرح بہہ نکلا۔ یہ ہوتا ہے خون کا رشتہ۔ اس نے اپنے آخری خطاب کا جئے بھٹو سے آغاز کیا، اس کا انجام کیا نکلا، یہ انجام اختتام نہیں ہے، یہ آغاز کا ایک راز ہوتا ہے اور یہ راز ہے کہ اس ملک میں سے بھٹو کا کردار ختم نہیں کیا جا سکتا۔ بے نظیر بھٹو بھی مزیدار اردو بولتی تھی، یہ اردو بھٹو کی اردو سے ملتی جلتی بھی تھی اور مختلف بھی تھی، یہ نعرہ وہ لوگوں کے ساتھ مل کر لگاتی تھی، کل بھی بھٹو زندہ تھا، آج بھی بھٹو زندہ ہے۔ مجھے حبیب جالب یاد آتا ہے۔

ہر گھر سے بھٹو نکلے گا، تم کتنے بھٹو مارو گے

میں سیاست کی طرف نہیں جانا چاہتا مگر مجھے کوئی چیز اس طرح کھینچتی ہے، کوئی بلا کے لایا تھا۔ بے نظیر بھٹو کی جلاوطنی کی جنت ہم وطنی کی ہمت کی طرف، وہ کیوں آئی تھی، یہ تو میں بھی چاہتا تھا کہ وہ آجائے۔ نواز شریف کیلئے بھی میری یہی خواہش تھی، مگر ہمیشہ آزمائش تو خواہش ہی بنتی ہے۔ ایک ٹیلی فونک خطاب کا انتظام منور انجم نے کیا تھا۔ پریس کلب میں زیر اہتمام سجاد بخاری اور عبدالقدیر خاموش، بے نظیر بھٹو بول رہی تھیں۔ انہیں کسی نے کہہ دیا کہ اجمل نیازی بھی موجود ہے۔ انہوں نے بے ساختہ پن کے والہانہ پن سے میری پذیرائی کی۔ مجھے ان کی محبت کا یہ انداز کبھی نہیں بھولے گا۔ بھٹو اور بھٹو کی بیٹی کیلئے میرا کلمہ خیر ایک خوشبو کی طرح میرے دل میں کھو گیا۔ انہوں نے کہا کہ کوئی سوال کرو، میں نے ان سے بھی کہا کہ مجھے سوال کرنا نہیں آتا۔ ایک آرزو آپ کی جھولی میں ڈال رہا ہوں۔ آپ آجایئے، نئے سرے سے آیئے اور نیا زمانہ لے کر آیئے۔ یہاں کے غریب اور غیور لوگ آپ کے منتظر ہیں اور مضطرب بھی ہیں۔

اب میں روتا ہوں کہ کاش وہ نہ آتیں، شاید یہ وطن اس قابل ہی نہیں، میں کئی لوگوں کے اس اعتراض کا جواب دے چکا ہوں کہ نواز شریف یہاں سے چلے گئے تھے، تو انہوں نے اچھا کیا، بے نظیر بھٹو کی میت کے پاس دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے نواز شریف کو لوگوں نے دعائیں دیں اور کہا کہ آپ بھی احتیاط کریں، ظالم آپ کو بھی زیادہ دیر برداشت نہیں کریں گے۔

وہ دہشت گردی کو جمہوری عمل سے ختم کرنے آئی تھی مگر دہشت گردی کا شکار ہو گئی۔ یہ دہشت گرد کون ہیں؟ دہشت کیا ہے؟ امریکہ میں نائن الیون کے بعد دہشت گردی کا ایک بھی واقعہ نہیں ہوا، ہمارے ہاں تو دہشت گردی کا سیلاب آگیا ہے، یہ خون کا سیلاب ہے اور اس میں نجانے کیا کیا ڈوبتا جاتا ہے۔ بے نظیر بھٹو نے بے بی سے بی بی تک اور پھر محترمہ تک ایسا سفر کیا تھا اور وہ اس منزل کی طرف ایک رہنما کیطرح چل رہی تھیں۔ بی بی لیڈر

کے معنوں میں آتا ہے جس میں محبت بہت ہے۔ محبت اور عزت ایک ہی جذبہ ہے، محبوب سے زیادہ محترم کون ہے، وہ لیڈر تھیں اس لئے ان کیلئے محبوب لیڈر کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ وہ عورت تھیں مگر تمام تر والہانہ پن کے بانکپن کے باوجود ان کیلئے ''محبوبہ'' کا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا اور یہ ان کی شخصیت کے جلال و جمال کی وجہ سے تھا۔ وہ جب بھی خطاب کرتیں تو کہتیں کہ تمہاری یہ بہن تمہارے ساتھ ہے تمہیں ڈرکس کا ہے۔ ہمارے ہاں ریت روایت کا تقاضا ہے کہ ہم بہن کا احترام ماں کی طرح کرتے ہیں، تو کیا بہنوں کے ساتھ یہ کچھ کیا جاتا ہے جو ہم نے اپنی عظیم بہن محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ کیا۔ مجھے لگتا ہے کہ بے نظیر بھٹو کیلئے بہن کا لفظ بھی لیڈر کے ہم معنی تھا۔

مجھے یاد ہے کہ بہت پہلے جب وہ دوسری بار وزارت عظمیٰ سے ہٹائی گئیں تو وہ اسلام آباد ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ ان کے بچے ناہید خان کے ساتھ موجود تھے۔ وہاں کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ میں اور برادرم توفیق بٹ ان کے احترام میں کھڑے ہوگئے، وہ بچوں کی بجائے سیدھی ہماری طرف آئی اور پھر ہمارا شکریہ ادا کیا۔ ابھی چند ہفتے پہلے جب وہ لاہور آئی تو سینیٹر لطیف کھوسہ کے گھر ہم چند کالم نگاروں کو بلا بھیجا۔ کھانے کی میز پر میں ان کے بالکل سامنے تھا، وہ بہت ریلیکس تھیں، کشادہ اور شگفتہ بے ساختہ باتیں کرتی رہیں۔ کراچی کے استقبال اور بم دھماکے کی بات ہوئی تو وہ دردمندی اور دانشمندی سے بات کرتی رہیں۔ شاید میں یہ بات ان کی زندگی میں نہ کر سکتا جبکہ اس میں ایک معصوم اور پاکیزہ ارادہ ہے۔ وہ دلیر بھی تھی اور دلبر بھی تھی، دونوں میں ایک نقطے کا فرق ہے اور یہ نقطہ روشنی کے دائرے کی طرح اس کے اردگرد رہتا تھا۔ اس خاتون لیڈر سے بہت اختلاف لوگوں کو تھے مگر قاتل نے سب کو اس کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا، وہ زندہ تر ہو گئی، کوئی اور مثال نہیں کہ کسی کیلئے پورا ملک سوگ میں ہے سو جو عزت اسے اب ملی ہے، کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ جو بیش بہا آسائش کی زندگی بھی چھوڑ کے آئی۔ اس ملک کے عوام کو جمہوری منزل کی طرف لے جانے کیلئے اور اگر وہ وزیراعظم بھی بننے آئی تھی تو اسے معلوم تھا

کہ اس بدنصیب ملک کا وزیر اعظم ہونا کوئی اعزاز تو نہیں، وہ کس کے بہکاوے میں آ گئی۔ کس نے وطن بلا کے اس کے سارے راستوں پر جال پھیلا دیئے۔ افغان صدر حامد کرزئی بے نظیر بھٹو سے کیوں آ کے ملا۔ امریکہ اس ملک کے سب اعلیٰ لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا۔ بے نظیر بھٹو امریکہ کیلئے پاکستانی جنگ میں شہید ہوئی۔ بہت عرصہ پہلے میری موجودگی میں شاہ محمود قریشی اور فرزانہ راجہ سے ایڈیٹر نیشن ایم اے نیازی نے کہا تھا کہ بی بی وطن آئی تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

نہ بھولے گا اسے صدیوں زمانہ
یہاں جو حادثہ کل ہو گیا ہے

کشور ناہید

الوداع گلاب پوش بی بی۔ الوداع

وہ گہرا اور کھلتا ہوا سبز رنگ اور رائل بلیو کو بہت پسند کرتی تھی۔ جب اس نے سب سے کم عمری میں پاکستان کی وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف لیا تو اس وقت بھی اس نے پسندیدہ رنگ پہنا ہوا تھا۔ دوسری دفعہ جب وزیر اعظم بنی تو بھی اپنے پسند کے رنگ میں ملبوس تھی۔ اسے گلاب کی خوشبو پسند تھی۔ داتا صاحب جانا اسے پسند تھا جب اس کو کسی شداد نے گولیاں ماریں اس وقت بھی وہ نیلے لباس میں تھی گلے میں گلاب کے پھولوں کا ہار تھا بازو پر ہر موقع پر سینکڑوں لوگ اس کو امام ضامن باندھتے تھے۔ اس کے سر سے دوپٹہ ڈھلک جاتا تو احتیاط سے پھر سر ڈھک لیتی تھی بہت لوگ کہتے تھی بی بی بڑے بدشکل رنگ اور کپڑے پہنتی ہے مگر وہ تو طبیعتاً قلندر تھی۔ مجھے یاد ہے جب مسز کلنٹن آئی تھیں۔ تب بھی اس نے نیلے رنگ کی قمیض، سفید دوپٹہ اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھی۔ جب موت نے اس کے دروازے پر دستک دی اس وقت بھی وہ سفید دوپٹہ، سفید شلوار اور نیلے رنگ کے چولے میں تھی جمہوریت کی دیوانی خوش تھی، ہنس رہی تھی۔ یونہی ہنستے ہنستے قہر آلود ہاتھوں نے اس کی شہ رگ میں ایسے دو گولیاں ماریں کہ وہی ہنسی مرتے وقت بھی اس کے چہرے پر مرتسم تھی۔ جب وہ پہلی دفعہ وزیر اعظم بنی اور اس سے دو سال پہلے جگہ جگہ جلسہ کرتی پھری۔ اس کے سر پہ دوپٹے کو پورے یورپ نے نئے اور خوبصورت فیشن کے طور پر قبول کیا۔ میں اس سال وینس میں تھی ہم بہت سے سیاح کشتی میں سیر کے لئے جا رہے تھے۔ میرا دوپٹہ دیکھ کر سب نے پوچھا تم کس ملک سے ہو۔ جب میں نے بتایا کہ میں پاکستان سے ہوں، بے نظیر کے ملک سے ہوں ساری عورتوں نے آگے بڑھ کر میرے دوپٹے کو بے نظیر کے دوپٹہ اوڑھنے کے انداز میں اوڑھایا۔ پھر باقی عورتوں نے مفلر کی شکل کے دوپٹوں کو میرے ساتھ اپنے سروں پر لیا۔ یہ تھی مقبولیت عورت کی جس کو متشددانہ طریقے پر کسی شقی القلب نے دو گولیاں شہ رگ پہ اور ایک گولی ماتھے پہ یہ یقین کرنے کے لیے ماریں کہ وہ جری خاتون بچ نہ جائے۔

جب وہ پہلی دفعہ وزیراعظم بنی تو چونکہ بہت کم عمر تھی۔ اس لیے اس کو مشورہ دینے والے کبھی بتاتے تھے کہ اس سوٹ کے ساتھ یہ عینک پہنیں اس سوٹ کے ساتھ یہ بیگ لیں، اس شام یہ لہنگا پہنیں اور اس شام غرارہ پہنیں۔ کبھی کبھی غیر ملکی عشائیہ میں اس نے لہنگا پہنا بھی تو بھی وہی سبز رنگ اس کا لباس تھا۔ جب وہ پہلی دفعہ وزیراعظم بنی تو چند مصری اور دیگر مفتیوں نے فتویٰ دیا کہ عورت وزیراعظم نہیں ہو سکتی ہے۔ کچھ نے یہ بھی شوشہ چھوڑا کہ عورت کو سلامی دینا مردانگی کے خلاف ہے، اس زمانے میں فاطمہ مرینسی نے قرآن اور خلفاء کے حوالے سے ثابت کیا کہ خاتون، پہلے بھی سربراہ مملکت رہی ہے اور بے نظیر کا وزیراعظم ہونا بالکل قانون اور اسلامی فقہ کے مطابق ہے۔ آج سے پندرہ برس پہلے اس خاتون کو علم تھا کہ ہر روز اس کو دھمکیاں ملتی تھیں کہ تم ماردی جاؤ گی وہ خاتون پھر بلٹ پروف واسکٹ پہننے لگی تھیں وہ جیکٹ، اکثر قمیض کے ہم رنگ ہوتی تھی، پر شلوار اور دوپٹہ وہی سفید ہوتے تھے، کیا خبر تھی کہ یہی سفید رنگ اس کا آخری ملبوس بنے گا۔ اس پر ہر لباس پھبتا تھا مجھے یاد ہے جب وہ شملہ معاہدے کے لئے بھٹو صاحب کے ساتھ گئی تھیں اس دن شاید پہلی مرتبہ ساڑھی پہنی تھی۔ سلیولیس بلاؤز، کٹے ہوئے بکھرے بال ایسے جیسے نوجوان لڑکی کے ہو سکتے ہیں۔ معصوم مسکراہٹ اور باپ کی پسندیدہ بیٹی، ہر جگہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

باپ کو یہ بیٹی اتنی پسند تھی کہ آخری ملاقات کے دوران پنڈی کوٹھری میں باپ اور بیٹی پلنگ پر لیٹے، کانوں میں باتیں، کئی گھنٹے تک کرتے رہے تھے۔ وہ ساری باپ کی ہدائتیں، اس خاتون نے اپنا زیور بنائی تھیں۔ لہجہ میں اس قدر شفاف، اور بیان میں اس قدر واضح کہ سننے والے کو قائل کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جب وہ پہلی مرتبہ وزیراعظم بنی تو سارے سینئر پارٹی رہنماؤں کو اس نے انکل تو کہا مگر جب انہوں نے اسے بچہ سمجھ کر اپنے مشوروں سے نوازنا شروع کیا تو وہ سمجھ گئی کہ اب تو اپنی ہی عقل پر اعتماد کرنا پڑے گا۔ اس کے اعتماد نے اس کے اپنے ہی بنائے ہوئے صدر کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ اس کو بی بی کا یہ رنگ اچھا نہیں لگا آخر اس نے بے وفائی اس ڈھٹائی کے ساتھ کی کہ بی بی کی حکومت کو ہی

برطرف کر دیا۔ ہم لوگ جو بھٹو صاحب کے چاہنے والے تھے۔ وہ بھٹو صاحب کی بیٹی کے ہاتھ میں تسبیح دیکھ کر جز بز ہوتے تھے، جب وہ مزاروں پر حاضری دینے جاتی، صدق دل سے دعا کیلئے ہاتھ اٹھاتی تھی، ہم جیسے لبرل لوگ اس سے ناراض ہو جاتے، مگر وہ یہ سب کچھ مصنوعی طریقے پر نہیں کرتی تھی۔ اس کے اندر کوئی پیر طریقت بیٹھا تھا وہ اچھی بھلی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی موت نے اس کے کان میں کہا! ارے کھڑی ہو، ونڈو کھولو اور کھڑی ہو کر استقبال کرو میرا۔ وہ جو روحانیت میں لپٹی تسبیح پکڑے کھڑی ہوئی تو موت نے دو گولیوں کی شکل میں اس کی شہ رگ کو اور ایک گولی کی شکل میں اس دماغ کو کھا گئی جس کی تعریف میں سکیورٹی کونسل کی تاریخ میں پہلی مرتبہ تعزیتی ریفرنس ہوا۔ سی این این اور بی بی سی پورے چوبیس گھنٹے مسلسل پروگرام اس بی بی کے لئے نشر کرتے رہے جو دنیا بھر میں بہت بڑا دماغ تھیں۔ اس کو یاسر عرفات بھی پیار کرتے تھے۔ النہیان نے وہ محبت دی کہ جسے پناہ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ بی بی کو ہر دوسرے مہینے لیکچر دینے کے لئے امریکہ، یورپ اور برطانیہ میں بلایا جاتا تھا اب ہے ہمارے پاس کوئی ایسا، جس کو یوں بلایا جائے جس پر ہم فخر کرسکیں۔

مگر اسلامی ممالک کو عورت کی لیڈری پسند ہی نہیں ہے یہ سارے خلیجی ممالک اس کو برداشت کرتے تھے۔ یہ ممالک محترمہ فاطمہ جناح کو بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ فاطمہ جناح کو بھی بہت پر اسرار طریقے سے مار دیا گیا تھا اب یہی حال کرنا تھا بی بی کا؟ بھٹو صاحب نے تو لکھ دیا تھا۔ If I am Assasinated بی بی نے بھی آنے سے پہلے بتا دیا تھا کہ اس کو مارنے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں کوئی ہے جو ان کا نام لے، کوئی ہے جو اس المیے کی ذمہ داری لے۔ محرم سے پہلے ہی عزاداری کا ماحول دے کر جانے والی، پلٹ کے تو دیکھ جیسا تیرے باپ کا ماتم گھر گھر تھا، لوگ ایک دوسرے سے رو کر تعزیت کر رہے تھے، تو نے بھی باپ کی طرح ہماری قوم کو بے بس، بن لیڈر، یتیم چھوڑ دیا۔ تمہیں گلاب پسند تھے۔ اب ہمیشہ تمہاری لحد پر گلاب کھلا کرینگے۔

کئی نسلیں اس المیے کے اثر سے نہ نکل پائیں مگر ایسے گھرانے چند ایک ہی ملتے ہیں جن کے وارث یکے بعد دیگرے نشانہ بنتے گئے۔ جدید تاریخ میں کینیڈی، گاندھی اور بھٹو خاندان اس کی مثالیں ہیں۔ اندرا اور راجیو گاندھی کو تو اپنے دور اقتدار کی بعض غلطیوں کا نشانہ بننا پڑا، البتہ کینیڈی اور بھٹو خاندان کو ان کی عوامی مقبولیت سے خوفزدہ ہو کر نشانہ بنایا گیا۔ امریکی ستارہ شناس جینی ڈکسن نے کینیڈی برادران کی المناک موت کی پیش گوئی کی تھی جو درست ثابت ہوئی۔ ایسے ہی ماہر ستارہ شناس یاسین وٹو نے گرمیوں کی ایک حبس آلود شام میں پیش گوئی کی تھی بے نظیر بھٹو وطن واپس آئیں گی تو انہیں گولی ماردی جائے گی، مگر چونکہ وہ بڑی لیڈر ہیں۔ اس لیے موت کے خوف سے باہر نہیں بیٹھ سکتیں۔ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ پاکستان کو اس سانحے سے بچائے۔ سفید فام امریکی اسٹیبلشمنٹ سے نبرد آزما سیاہ فام رہنما ڈاکٹر مارٹن لوتھر بھی 1968ء کے ایک دن ایسی ہی اندھی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ عظیم باکسر محمد علی کے فکری مرشد شہباز مالکم ایکس، جنہیں قبول اسلام کی سعادت حاصل ہوئی وہ بھی ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے قتل کر دیئے گئے۔

پھر چار اپریل کی سیاہ رات آئی۔ جب ذوالفقار علی بھٹو کو راولپنڈی میں پھانسی دے دی گئی۔ اس وقت کے سیکرٹری داخلہ روئیداد خان نے اپنی کتاب میں لکھا'' میں وہ تمام رات کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتا اور سقراط کے وہ آخری الفاظ یاد کرتا رہا کہ جنہیں افلاطون نے اپنی کتاب معذرت (Apology) میں یوں درج کیا ہے'' افلاطون اب جانے کا وقت آچکا ہے۔ ہم دونوں کو جانا ہے۔ مجھے مرنے کے لیے تمہیں جینے کے لیے کون سا راستہ بہتر ہے۔ میرا یا تمہارا خدا ہی جانے''۔

اسی بھٹو کا چھوٹا بیٹا شاہنواز فرانس کے ایک فلیٹ میں پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے جیالے برملا اس قتل کا ذمہ دار برفیلی آنکھوں اور منافقانہ مسکراہٹ والے ڈکٹیٹر جنرل ضیاء کو ٹھہراتے رہے ہیں۔ شہر نگاراں کراچی 96ء کی اس سیاہ رات کا بھی شاہد ہے، جب بھٹو کے لاڈلے میر مرتضٰی بھٹو کو کلفٹن میں اس کے گھر سے چند گز دور گولیوں سے چھلنی

کر دیا گیا۔ شیروں جیسی شخصیت کا مالک میر مرتضٰی ویسی ہی جرات اور دلیری سے مرا، جس کی بھٹو خاندان کے ایک فرزند سے توقع کی جاسکتی ہے۔ لاہور کے ایک نوجوان اخبار نویس نے میر مرتضٰی کی تحقیقات کرنیوالے ایک پولیس افسر سے انٹرویو کیا تو یہ انکشاف ہوا کہ گولیاں سامنے کی بجائے اوپر درختوں کی جانب سے آئی تھیں۔ پولیس افسر نے بے چارگی سے کہا ''اگر میں تحقیقاتی رپورٹ میں یہ لکھ دیتا تو آج آپ کے سامنے نہ بیٹھا ہوتا''۔

میرے ذہن میں چلتی فلم کا آخری سین جامد ہو جاتا ہے۔ سرخ وسفید پھولوں سے لدی، مسکراتی آنکھوں اور جگمگاتے چہرے والی بے نظیر بھٹو سٹیج سے اترتے ہوئے ہاتھ ہلا کر کارکنوں کے نعروں کا جواب دے رہی ہیں۔ معمول سے زیادہ ہشاش بشاش اور خوش بے نظیر بھٹو اپنی گاڑی میں بیٹھتی ہیں۔ کارکنوں کے ہجوم کو دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا۔ وہ ہاتھ ہلانے کے لئے گاڑی کی چھت ہٹا کر کھڑی ہوئیں۔ یہی لمحہ انکی زندگی کا آخری لمحہ ثابت ہوا۔ سر اور گردن میں لگنے والی گولیوں سے تیورا کر وہ گاڑی میں گر گئیں۔ کبھی نہ اٹھنے کے لئے...... یوں بھٹو کی جانشین اپنے باپ کی طرح پورے بانکپن اور سج دھج سے رخصت ہو گئیں۔ شیکسپیئر کے المیہ ڈرامے جولیس سیزر میں سیزر کا دوست مارک انتھونی روما کے عوام کے سامنے اپنی شہرہ آفاق تقریر میں کہتا ہے'' سیزر گر پڑا۔ آہ وہ کیا گرنا تھا، وہاں میرے ہم وطنو اس وقت میں اور آپ ہم سب گر گئے''۔

اٹھائیس سال پہلے اسی راولپنڈی کی جیل سے ذوالفقار علی بھٹو نے بے نظیر کی سالگرہ پر اسے ''میری پیاری بیٹی'' کے نام سے ایک خط لکھا تھا۔ بھٹو لکھتے ہیں'' پیاری بیٹی'' جیل کی کوٹھری سے میں تمہیں کوئی تحفہ نہیں دے سکتا۔ میرا سب سے جذباتی عشق عوام کے ساتھ ہے۔ میں تمہیں عوام کا ہاتھ تحفے میں دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے مقابلہ میں تم زیادہ بہتر طور پر لڑ سکو گی۔ تمہاری تقاریر زیادہ فصیح وبلیغ اور جدوجہد میں زیادہ توانائی اور جوش ہو گا۔ مجھے یاد ہے کہ 1957ء کے ایک سرما میں جب تم صرف چار سال کی تھیں، ہم المرتضٰی کے بلند چبوترے پر بیٹھے تھے۔ میرے ہاتھ میں گن تھی۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے ایک جنگلی

طوطا مار گرایا۔ جب وہ گرا تو تم نے چیخ ماری۔ اسے اپنی موجودگی میں دفن کرایا اور کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ ایک مردہ طوطے نے 57ء کے موسم سرما میں لاڑکانہ میں ایک چھوٹی سی لڑکی کو رلا دیا تھا۔ 21 سال بعد وہ چھوٹی بچی ایک ایسی نوجوان لڑکی بن گئی ہے، جس کے اعصاب فولادی ہیں اور جو ظلم کی طویل رات کی وحشت کا بہادری سے مقابلہ کر رہی ہے۔ حقیقتاً تم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تمہاری رگوں میں بہادر سپاہیوں کا خون موجزن ہے"۔

بلاشبہ بھٹو کی لاڈلی بے نظیر نے اپنی جان دے کر اپنی جرات اور دلیری کا لوہا منوالیا۔ خیال تھا کہ اس واقعہ کے سیاسی اور قومی مضمرات پر کچھ لکھا جائے مگر منتشر ذہن کے ساتھ یہ ممکن نہ ہو سکا۔ حرف آخر یہ کہ نائن الیون کے بعد امریکی دانش ور نے کہا تھا کہ اس واقعہ سے یہ دنیا پہلے جیسی نہیں رہے گی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی المناک موت کے بعد پاکستان کا سیاسی منظر نامہ بھی یکسر بدل جائے گا۔ بے نظیر بھٹو نے مر کے بھی ثابت کر دیا کہ انہیں چاروں صوبوں کی زنجیر کہنا بجا تھا، پورے ملک میں ایک جیسا سوگ منایا جا رہا ہے۔ افسوس کہ وفاق کی علامت اور انتہا پسندوں کو روکنے والی یہ زنجیر بھی ٹوٹ گئی۔

محمد یٰسین وٹو

گردش افلاک

بہادر خاتون......ایک عظیم لیڈر

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں بھٹو خاندان کا گزشتہ کم و بیش نصف صدی سے سیاسی کردار چلا آرہا ہے کبھی اقتدار میں اور کبھی انتظار میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز صدر جنرل محمد ایوب خان کے دور اقتدار میں کیا۔ مختلف وزارتی عہدوں سے ہوتے ہوئے ان کے دورِ آخر میں پاکستان کے وزیر خارجہ مقرر ہوئے اور 1960ء کے عشرے میں بھٹو، سورن سنگھ (بھارتی وزیر خارجہ) مذاکرات کو بہت شہرت ملی تھی۔ ان کو مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرنے کا ٹاسک سپرد کیا گیا تھا۔ اگرچہ ان دونوں وزرائے خارجہ کے مذاکرات کے کئی دور ہوئے لیکن ان سب کا نتیجہ زیرو ہی رہا۔ تاہم ان مذاکرات کی وجہ سے ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو عالمی سطح پر (اور ملکی سطح پر بھی) بہت شہرت ملی۔ پھر پاکستان بھارت ستمبر 1965ء کی جنگ آگئی۔ جنگ کے بعد جنگ سے پیدا ہونے والے مسائل سے نبٹنے کیلئے سوویت یونین کی سرپرستی میں تاشقند میں مذاکرات ہوئے جن میں پاکستان کے صدر جنرل ایوب خان اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اور دیگر ارکان شامل تھے جبکہ بھارتی وفد وزیراعظم لال بہادر شاستری کی قیادت میں شریک ہوا اور دونوں ملکوں کے درمیان معاہدہ تاشقند طے پایا جس کے بعد دونوں ملکوں کی فوجیں جنگ سے پہلے والی پوزیشنوں پر واپس چلی گئیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جنرل ایوب خان نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کو کابینہ سے فارغ کر دیا۔ دونوں جانب سے کچھ تلخ بیانات کے بعد بھٹو صاحب بالکل ہی ایوب خان کے مقابلے میں آگئے اور انہوں نے بیان دیا کہ ان کے پاس تاشقند کا راز ہے جو وہ قوم کو

کے مقابلے میں آگئے

بتائیں گے اور یہ کہ تاشقند میں کشمیر کا س ... ودا کر دیا گیا ہے وغیرہ۔ اس سے بھٹو صاحب کو بہت

عوامی پذیرائی ملی۔ عوام جنرل ایوب خ ... خان کے دس سالہ اقتدار سے تنگ آچکے تھے۔ ایک

مسلم لیگ (کنونشن لیگ) ایوب کی قیا ... دت میں حکومت میں تھی۔ جناب ممتاز دولتانہ اگرچہ

بہت بڑے سیاستدان اور تحریک پاکستان کے نامور کرداروں میں سے تھے لیکن وہ پبلک اور جلسہ گاہوں کے کم کم کھلاڑی تھے۔ وہ ڈرائنگ روم کے ماہر سیاستدان سمجھے جاتے تھے۔ اپوزیشن کے میدان میں ایک خلا موجود تھا جناب بھٹو کو بائیں بازو کی لابی کے دانشوروں کا تعاون حاصل ہو گیا اور انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی لاہور میں بنیاد رکھ دی۔ (نومبر 1967ء) پورے پنجاب میں جناب بھٹو کو زبردست پذیرائی مل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان پیپلز پارٹی پورے مغربی پاکستان میں سب سے بڑی سیاسی پارٹی بن گئی۔ اسلامی سوشلزم اور "روٹی کپڑا اور مکان مانگ رہا ہے ہر انسان" اس کے مقبول ترین نعرے تھے۔ ایوب خان رخصت ہوئے تو جنرل یحییٰ خان آگئے 1970ء کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی مغربی پاکستان کی سب سے بڑی پارلیمانی پارٹی بن کر ابھری اور مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ نے سب کا صفایا کر دیا دونوں بڑے سیاسی لیڈروں میں مفاہمت نہ ہو سکی۔ جنرل یحییٰ خان اقتدار منتقل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مشرقی پاکستان میں سیاسی بے چینی کے بعد حالات دگرگوں ہوتے گئے ساتھ ہی بھارت نے دراندازی جاری رکھی بالآخر 1971ء کی پاکستان بھارت جنگ آگئی جس میں مشرقی محاذ پر پاکستانی فوج کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور مغربی پاکستان اب پاکستان بن گیا جس میں اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کے پاس آ گیا۔ انہوں نے 1972ء سے 1977ء تک پانچ برس حکومت کی پھر الیکشن کرائے تو ان میں کچھ ظاہری دھاندلی کے مناظر سامنے آئے اپوزیشن نے بائیکاٹ کر کے تحریک چلا دی پھر جنرل ضیاء الحق آگئے۔ موجودہ سرکاری وکیل احمد رضا خان قصوری کے والد کے قتل کا مقدمہ چلا جس میں بھٹو صاحب کو سزائے موت ہو گئی۔ جنرل ضیاء الحق کا گیارہ سالہ دور گزرا۔ طیارے کے حادثے میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ غلام اسحاق خان قائم مقام صدر بن گئے۔ بینظیر بھٹو جو اس دوران باہر چلی گئی تھیں اپنی جلاوطنی ختم کر کے پاکستان واپس آ گئیں۔ وہ لاہور ائیر پورٹ پر اتریں۔ اہل پنجاب نے ان کا فقید المثال استقبال کیا اور ان کو طاقتور سیاسی عوامی

لیڈر بنا دیا اور عام انتخابات میں انکی پیپلز پارٹی نے کامیابی حاصل کی اور وہ 1988ء میں پاکستان کی وزیر اعظم بن گئیں۔ پوری اسلامی دنیا میں انکو پہلی خاتون وزیر اعظم ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ قریباً ڈیڑھ برس بعد ان کی حکومت صدر غلام اسحاق خان نے ختم کر دی۔ 1993ء کے نئے الیکشن ہوئے بینظیر بھٹو دوبارہ پاکستان کی وزیر اعظم بن گئیں۔ لیکن پھر ڈھائی برس بعد ان کے اپنے ہی بنائے ہوئے صدر سردار فاروق احمد خاں لغاری نے انکی حکومت برطرف کر دی۔ میاں محمد نواز شریف چاروں صوبوں کے نتائج سے دو تہائی اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ان کو بھی دوبارہ وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر بیٹھنے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ صدر سردار فاروق لغاری اور عبوری وزیر اعظم ملک معراج خالد کے دور میں محترمہ اور آصف زرداری کے خلاف قائم کئے گئے مقدمات چلتے رہے محترمہ باہر چلی گئیں۔ محترمہ اگرچہ ملک سے باہر تھیں لیکن یہ ان کے لئے سخت آزمائش کا دور تھا۔ شوہر آصف زرداری جیل میں تھے، والدہ نصرت بھٹو بیمار تھیں، بچوں کی تعلیم اور دیکھ بھال ان کے اپنے ذمہ تھی سیاسی بکھیڑے، مقدمات اور الزامات اعصاب شل کر دینے والے تھے ایسے حالات میں بڑے بڑے حوصلہ ہار دیتے ہیں لیکن محترمہ نے حوصلہ نہیں ہارا۔ محترمہ بینظیر بھٹو نے عالمی سطح پر اپنی سرگرمیاں اور عالمی لیڈروں سے سیاسی ملاقاتیں جاری رکھیں۔ بالآخر وہ امریکہ اور یورپی یونین کی طرف سے صدر مشرف پر دباؤ کے نتیجے میں وطن واپسی میں کامیاب ہو گئیں اور 18 اکتوبر 2007ء کو پاکستان آمد پر انکا پھر فقید المثال استقبال کیا گیا لیکن کراچی میں ان کے استقبالی جلوس میں فائرنگ اور خودکش حملے کے ذریعے ان کی جان لینے کی پہلی کوشش کی گئی لیکن وہ بہادر خاتون خوفزدہ نہیں ہوئی۔ اس نے ڈیل کو پس پشت ڈالتے ہوئے جرنیل کی حکومت کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔ راولپنڈی کے لیاقت باغ میں تاریخی جلسہ سے خطاب کے دوران محترمہ نے پنجاب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہیں سے ذوالفقار علی بھٹو کو پذیرائی ملی اور خود وہ بھی دو بار وزیر اعظم بنیں اور محترمہ نے کہا کہ آمریت کے خلاف پنجاب کے غیور عوام ان کا ساتھ دیں

گے اور ڈکٹیٹر کو شکست دیکر جمہوریت بحال کریں گے۔ میاں محمد نواز شریف اور محترمہ بینظیر بھٹو کی انتخابی جدوجہد سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کنگز پارٹی کو شکست ہوگی اور اپوزیشن کے ان دنوں رہنماؤں کو ہی کامیابی ہوگی۔ لیکن اسی روز یعنی 27 دسمبر 2007ء کو پہلے نواز شریف کے استقبالی جلوس پر حملہ ہوا فائرنگ سے پانچ افراد جاں بحق ہوئے پھر اسی شام کو محترمہ بینظیر بھٹو جب اپنا جلسہ مکمل کر کے واپس جا رہی تھیں تو دست قاتل نے ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ یہ پاکستان کی سالمیت کے خلاف ایک خوفناک سازش ہے۔ یہ پاکستان کی ایک بڑی سیاسی پارٹی ہی کا نقصان نہیں اس کی تلافی بظاہر ناممکن ہے۔ مخدوم امین فہیم، آصف زرداری، میاں نواز شریف، شہباز شریف، قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمان، عمران خان، صاحبزادہ حاجی فضل کریم، پروفیسر ساجد میر اور دیگر قومی سیاستدانوں کی دانش کا امتحان ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف اس سازش کے اثرات کو زائل کرنے کیلئے پارٹی پالیٹکس سے بالا ہو کر کردار ادا کریں۔

محمود شام

مملکت اے مملکت

بینظیر بھٹو۔1970ء سے 2007ء تک۔کچھ یادیں

1970ء، 70 کلفٹن کا تاریخی ڈرائنگ روم۔ یہ بے نظیر ہیں۔ چھٹیوں میں آئی ہوئی ہیں۔ ان سے موجودہ حالات پر انٹرویو کر لیں۔'' پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین، سابق موجود ہیں۔ لندن میں زیر تعلیم، 17 سالہ پاکستانی طالبعلم، یحییٰ خان کا مارشل لاء موضوع دائیں اور بائیں بازو کی کشمکش۔ خاص طور پر نوابزادہ نصر اللہ کے بیانات پر اظہار خیال۔ انکل کو اس طرح ڈیڈی کے خلاف بیانات نہیں دینے چاہئیں۔ Facts کو سامنے رکھنا چاہیے۔ پاکستان کا مستقبل ترقی پسندی سے وابستہ ہے۔ تاریخ کا پہیہ آگے بڑھتا ہے۔ میری پہلی یاد محترمہ بے نظیر بھٹو سے اس طرح وابستہ ہے۔ روسی قونصل خانے میں ان کے ویزے کے لیے ہمراہ جانا بھی ذہن کے اوراق پر دھندلا دھندلا موجود ہے۔ وہ لندن واپسی پر ماسکو میں رکنا چاہتی ہیں۔ 1972ء شملہ۔ صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو۔ اپنی صاحبزادی کو جواہر لعل نہرو کی صاحبزادی اندرا گاندھی سے ملوانے لے گئے۔ 1977ء۔ جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء۔ 24 سالہ بے نظیر بھٹو کو تعلیم سے فارغ ہوتے ہی عملی سیاسی زندگی کا آغاز کرنا پڑ رہا ہے۔ ایسی راہ، جو کانٹوں سے بھری ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ کب تک جدوجہد جاری رہے گی۔ اپنی پارٹی کے بہت سے لوگ ادھر ادھر ہو گئے ہیں۔ آج کے بڑے بڑے جمہوری چیمپئن، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے پہلو میں بیٹھے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ انتخابی مہم۔ مخدوم خلیق الزماں اور دوسرے جواں سال اپنے قائد کی بیٹی کو لے کر سندھ میں سرگرم ہیں۔ انتخابات ملتوی۔ غیر یقینی مستقبل۔ 70 کلفٹن

میں اپنے صحافیانہ فرائض کے سلسلے میں اکثر ملاقات ہوتی ہے۔ 1978ء ایک رات مجھے اطلاع ملتی ہے کہ ایوان صدر میں چیف جسٹس پاکستان، چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ فیصلہ پھانسی کی سزا۔ میں بے تاب ہوں کہ صبح ہو تو میں ایک بیٹی کو بتاؤں کہ اس کے عظیم والد کے لیے کیا فیصلہ ہو رہا ہے۔ 70 کلفٹن۔ لابی ایک قوم پرست سندھی رہنما۔ ایک پی پی پی کے رہنما جو بعد میں سینیٹر بنے۔ وہ کہہ رہے ہیں۔ کہ فیصلہ بھٹو صاحب کے حق میں آنے والا ہے۔ پی این اے والے ہنگامہ کریں گے۔ اس لیے فوج لگا رہے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کیسے لوگ ہیں کتنی غلط بیانی۔ وہ چلے جاتے ہیں تو میں ان سے کہہ رہا ہوں (اس وقت کسے خبر تھی۔ کہ شہادت بالا آخر ان کی بھی منزل ہے۔) کہ انتہائی باوثوق ذرائع کی اطلاع ہے کہ 18 مارچ کو پھانسی کی سزا سنائی جائے گی۔ ایک بیٹی کو اس کے والد کے لیے ایسی بات بتانے سے پہلے میں نے سو بار سوچا۔ لیکن مصدقہ اطلاع ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آپ بین الاقوامی شخصیات سے رابطہ کریں۔ اپنے لوگوں سے ملیں۔ یہ بھی اطلاع ہے کہ آپ کو نظر بند کرلیا جائے گا۔ میں اپنی ذمہ داری پوری کر کے آگیا ہوں۔ 18 جنوری کو میری اپنی پیشی بھی ہے۔ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کی اطلاع آئی ہے۔ 70 کلفٹن کے پاس سے گزرتا ہوں۔ وہ سب جیل بن چکا ہے۔

1979ء نظر بندی کے بعد سہالہ سے کراچی واپس۔ 70 کلفٹن۔ کچن کے ساتھ میٹنگ روم بیگم نصرت بھٹو۔ عدت میں ہیں۔ ان سے ملاقات نہیں ہوسکتی۔ بے نظیر بھٹو۔ پریس کانفرنس کر رہی ہیں۔ اندرون سندھ ریل سے جا رہی ہیں۔ بھٹو صاحب کی شہادت کا غم آپ کے پاس بہت بڑی طاقت ہے۔ اسے فوری طور پر اسٹیشنوں، جلسوں میں نہ بکھیریں وقت پر اس کا استعمال کریں۔ چو این لائی نے کہا تھا۔ اپنے دکھ کو طاقت میں بدل لو۔ 14 اگست 1979ء پھانسی کا دن 4 اپریل، عدت کے ایام پاکستان کے یوم آزادی پر ختم ہوتے ہیں۔ پاکستان بھر سے اظہار تعزیت کے لیے رہنما و کارکن آرہے ہیں بیگم نصرت بھٹو، تصویر غم، بے نظیر بھٹو، ایک عزم مصمم، سیاہ لباس، ماں، بیٹی، سیاسی قوت، سیاسی رہنما۔

ان سے اتحاد کے لیے سرگرم۔ نظر بندیوں کا سلسلہ وقفوں وقفوں سے جاری۔ بیگم نصرت بھٹو اپنی صاحبزادی پر فخر کرتی ہیں۔ کہ وہ اپنے باپ کی تصویر ہے۔ وہی ارادے استقامت، مستقبل کا شعور، پھانسی کے بعد پہلے بلدیاتی انتخابات حصہ لینا چاہیے یا نہیں۔ بے نظیر حصہ لینے کا فیصلہ کرتی ہیں۔ عوام دوست امیدوار کامیابی بھی حاصل کرتے ہیں۔ یہاں سے بے نظیر کے بڑے فیصلے لینے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیگم نصرت بھٹو علاج کے لیے بیرون ملک جا رہی ہیں۔ بے نظیر نظر بند ہیں۔ ان سے مختلف ذرائع سے اطلاعات کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ ٹیلی ویژن دیکھ رہی ہیں۔ اور جنرل ضیاء سے ملنے والوں کو پارٹی سے نکالنے کے نوٹس دے رہی ہیں۔ 1983ء ان کے کان کا عارضہ شدید ہو جاتا ہے۔ ان کے معالج سے ہم خبروں کے لیے ملتے رہتے ہیں۔ 1984ء حکومت انہیں خاموشی سے ایئر پورٹ پہنچانے اور ملک سے روانگی میں کامیابی ہو جاتی ہے۔ فون پر رابطہ رہتا ہے۔ 1985ء انتخابات۔ ایم آر ڈی بائیکاٹ کا اعلان کرتی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ لیڈیز (بیگم نصرت بھٹو، محترمہ بے نظیر بھٹو، دونوں ملک سے باہر ہیں) نے منع کیا ہے۔ جو بعد میں غلط ثابت ہوتا ہے۔ اپریل 1986ء وطن واپسی عظیم استقبال۔ ان کا وعدہ ہے کہ پہلا انٹرویو جنگ کے لیے ہمیں دیں گی۔ لندن میں بلایا گیا تھا جا نہیں سکتے تھے۔ وعدہ پورا ہوتا ہے۔ ملتان میں انٹرویو تفصیل سے۔ پھر ان کے ساتھ ہی 3 مئی 1986ء کو کراچی واپسی دوپہر سے ٹرک پر ان کے ساتھ۔ قائداعظمؒ کے مزار کے پاس جلسہ عام سے خطاب۔ 3 مئی حکومت گئی۔ لیکن حکومت اپنی جگہ۔ مستقبل کی منصوبہ بندی۔ پارٹی قیادت میں تبدیلیاں۔

پی پی پی اب بھی سرفہرست سیاسی پارٹی ہے۔ طاقت کا سرچشمہ بے نظیر

بھٹو کی شخصیت۔ بیگم بھٹو رفتہ رفتہ پیچھے ہوتی ہیں۔ 1987ء۔ منگنی، شادی کا سال۔ جونیجو افغان معاہدے پر دستخط سے پہلے سیاسی قائدین سے مشورے کرتے ہیں بے نظیر کی وزیراعظم ہاؤس سے وابستہ یادوں پر بات چیت۔ 1988ء جونیجو حکومت کی برطرفی۔ انتخابات کا اعلان۔ 17 اگست 1988ء پاکستان 1 تباہ ہونے کی اطلاع۔ 4 بجے شام کے

آس پاس ۔فون پر 70 کلفٹن رابطہ۔ پہلی اطلاع پریس کانفرنس ۔زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔انتخابات پی پی کی کامیابی۔ پہلی مسلمان خاتون وزیر اعظم کا اعزاز۔اکثر غیر ملکی دوروں میں ساتھ جانے کا اتفاق۔امریکی کانگریس سے خطاب۔ہر جملے پر تالیاں۔ ایک پسماندہ ملک کی روشن خیالی کا ثبوت۔خاتون کا انتخاب بطور وزیر اعظم جس کا نظارہ امریکہ و یورپ بھی نہ کر سکے۔

اگست 1990ء میں حکومت کی برطرفی، شوہر کے خلاف مقدمات، عدالتوں میں پیشیاں۔کبھی کبھی اداسی، مایوسی۔ پھر 1993ء میں لانگ مارچ کی دھمکی اور ڈرامائی مناظر۔دوبارہ وزیر اعظم۔اپنے صدر کا انتخاب۔اپنے صدر کے ہاتھوں حکومت کی معطلی۔ دبئ کیا صورت حال ہے۔حکومت میں پھر ضیا اسٹ بیٹھے ہیں۔کیسے روشن خیالی ہوگی۔18 اکتوبر 2007ء وطن واپسی۔عظیم الشان استقبال۔خودکش بم دھماکہ، تمام حفاظتی انتظامات بے نتیجہ، افراتفری، چار پانچ روز بعد جنگ کے لیے خصوصی انٹرویو۔وطن واپسی کے بعد کسی اخبار کے لیے پہلا اور شاید آخری باقاعدہ انٹرویو۔نومبر 2007ء سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس سے پہلے پانچ چھ ایڈیٹرز سے آف دی ریکارڈ صلاح مشورے۔الیکشن میں حصہ لیں یا نہیں۔ناہید خان، صفدر عباسی، فہمیدہ مرزا۔الیکشن میں حصہ لینا چاہئے میں ساتھ والی کرسی پر ہوں۔کسے خبر تھی کہ تین دہائیوں میں ملاقاتوں کے سلسلے میں انہیں آخری بار دیکھ رہا ہوں۔شخصیت میں پہلے سے کہیں زیادہ ٹھہراؤ۔ تامل، تحمل، مشاورت کا اہتمام، جلسے، ریلیاں، خودکش حملوں کا خطرہ، امریکی سفیر سے ملاقاتیں، جیو کے دفاتر کا اظہار یکجہتی کے لیے دورہ۔تیسری بار وزیر اعظم بننے پر پابندی کیسے ختم ہوگی۔کسی کو دو تہائی اکثریت نہیں ملے گی۔صدر پرویز مشرف۔اپنی ماورائے آئین ترامیم کو پارلیمنٹ سے منظور کروانے کے لیے پی پی پی سے مذاکرات کریں گے۔اسی میں تیسری بار وزیر اعظم بننے پر پابندی پر بات چیت ہوگی۔جمعرات کی رات انتہا پسندی ہٹانے میں کامیاب۔اور کتنوں کا لہو چاہئے اے ارض وطن۔کیا پی پی پی ختم ہو جائے گی۔کیا پاکستان کا سیاسی مستقبل بھی قتل ہوگیا۔بھٹو جب

تک زندہ رہتے ہیں ہنگاموں میں دن گزارتے ہیں۔ سیاسی افق پر چھائے رہتے ہیں۔ ان کی موت بھی انہیں سیاسی افق سے نہیں ہٹا سکتی۔ 1927ء میں پیدا ہونے والا بھٹو 1957ء سے پاکستان کے سیاسی افق پر چمکا۔ 1979ء تک وہی تب وتاب رہی۔ بھٹو کا اقتدار 1977ء میں ختم ہوا۔ بھٹو کا دور آج تک ختم نہیں ہوا۔ بے نظیر بھٹو 1953ء میں پیدا ہوئیں۔ 1977ء سے سیاسی افق پر طلوع ہوئیں۔ 2007ء تک مسلسل چمکتی رہیں۔ 1979ء سے بھٹو صاحب اب تک پاکستانی سیاست کا محور ہیں۔ اب ان کے ساتھ ساتھ بے نظیر بھٹو بھی سیاسی حوالہ بن کر زندہ رہیں گی۔

جنرل (ر) مرزا اسلم بیگ

دختر مشرق کی ناگہانی موت

محترمہ بینظیر بھٹو بھی بالآخر پاکستان کے مخصوص سیاسی انتشار کا شکار ہوگئیں۔ اپنی سوانح عمری میں انہوں نے خود کو مشرق اور پاکستان کی بیٹی قرار دیا۔ چون سالہ زندگی میں بے شمار نشیب و فراز دیکھ کر والد اور بھائیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ بھی راہی عدم ہوگئیں۔ وہ سابق صدر ذوالفقار علی بھٹو کی صاحبزادی تھیں جنہوں نے یحییٰ خان کے بعد 1971ء میں اقتدار سنبھالا 73ء کے آئین کے بعد بھٹو صاحب وزیر اعظم بن گئے۔ تاہم الیکشن میں دھاندلی پر ان کیخلاف احتجاجی تحریک شروع ہوئی جو 1977ء میں فوجی انقلاب پر منتج ہوئی، جنرل ضیاء الحق برسر اقتدار آئے اور انہوں نے 1979ء میں بھٹو صاحب کو پھانسی دیدی۔

آکسفورڈ اور ہارورڈ یونیورسٹی جیسے عالمی اداروں کی تعلیم یافتہ بے نظیر بھٹو 26 برس کی عمر میں پیپلز پارٹی کی غیر متنازعہ سربراہ بن گئیں۔ جنرل ضیاء الحق نے پیپلز پارٹی کو نقصان پہنچانے کی حتی الوسع کوشش کی، سوویت یونین کیخلاف امریکی حمایتی ہونے کی وجہ سے انہیں کافی حد تک آزادی تھی جس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اسی دوران طویل عرصے کے بعد محترمہ جلاوطنی ختم کر کے واپس آئیں اور پارٹی کی قیادت سنبھالی 1988ء اور 1993ء میں دو مرتبہ وزیر اعظم منتخب ہوئیں اور دونوں مرتبہ ہی بدعنوانی اور اقرباء پروری کے الزام میں ان کی حکومت برطرف کر دی گئی۔

1999 میں جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف کی حکومت برطرف کر دی اور انتہائی مشکل حالات میں پاکستان کی قیادت سنبھالی۔ اپنے دور حکومت میں انہوں نے نائن الیون جیسے واقعات کا سامنا اور القاعدہ وطالبان کیخلاف جنگ جیسے حساس فیصلے کیے۔ تاہم امریکی تعاون کے باوجود وہ پاکستان کے سرحدی علاقے میں پائے جانے والے طالبانی نظریات کو ختم نہ کرسکے۔ تمام مسائل کو بزور طاقت حل کرنے کے نتیجے میں قبائلی علاقوں میں امریکہ اور پاکستان مخالف جذبات جنم لینے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان میں بھی عراق طرز

کے خودکش حملے شروع ہو گئے اور طالبان سے نمٹنے سے ناکامی کی وجہ سے صدر مشرف کی مقبولیت کم ہو گئی۔ دوسری جانب چیف جسٹس آف پاکستان کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ سے خائف ہو کر پہلے ان کو برطرف کیا گیا اور پھر عوامی احتجاج سے مجبور ہو کر دوبارہ بحال کر دیا گیا۔ 2007ء کے وسط میں امریکہ نے انتقال اقتدار کیلئے محترمہ بینظیر بھٹو اور صدر مشرف کے درمیان معاہدہ کروایا۔ صدر مشرف نے انکے خلاف کرپشن کے تمام مقدمات ختم کر دیئے اور انہیں خود ساختہ جلاوطنی کے بعد پاکستان واپس آنے کی اجازت دے دی جس کے بعد 2008ء کے انتخابات میں وہ وزارت عظمیٰ کی امیدوار بھی تھیں۔ لیکن بعد میں محترمہ اور صدر مشرف کے درمیان ہونے والی ساز باز نے بجائے مضبوطی کے صدر کو مزید کمزور کر دیا جس پر انہوں نے نومبر کے آغاز میں ایمرجنسی نافذ کر دی۔ مگر اندرونی و بیرونی دباؤ سے مجبور ہو کر نہ صرف ایمرجنسی ختم کی بلکہ وردی بھی اتار دی اور سویلین صدر بن گئے۔ پس پردہ جو بھی معاملہ رہا ہو" مشہور یہی بات ہوئی کہ ساری بات صدر بش کی ذاتی ایما پر ہوئی۔ جس سے صدر مشرف اور محترمہ کے امریکی کٹھ پتلی ہونے کا تاثر ابھرا۔ صدر بش کے

...گولی نے صرف انہیں ... مگر اب ان لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو انکے جانی مخالف تھے۔ قاتل کی گ...
...ن حقیقی جمہوریت کی ... ختم نہیں کیا بلکہ پاکستان کو بھی کئی برس پیچھے دھکیل دیا ہے۔ یوں پاکستا...
...یں رہا، بلکہ 1971 ... پٹڑی پر چڑھتے چڑھتے رہ گیا۔ میں محترمہ کی سیاسی ڈیلوں کا کبھی حامی نہ...
...ے یہ کہنے میں کوئی عار ... میں سقوط ڈھاکہ کا ذمہ دار بھی انکے والد کو سمجھتا ہوں مگر تنقید برطرف مجھ...

نہیں کہ وہ بہادر اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ آمرانہ شکنجے میں کسے ہوئے ملک عزیز کو نکالنے
اور جمہوریت کی راہ پر ڈالنے کیلئے انہوں نے ہر قدم اٹھایا۔ مجھ جیسے نقادوں کے بھنور میں وہ
پھنسی تھیں، اسکا اندازہ انقادوں کو تو نہیں ہوسکتا۔ نقاد تو لگے بندے اصول اور مقرر کردہ
اعداد وشمار سے انحراف نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر ایک لیڈر بھی ان دقیانوسی طریقوں پر چلتا
رہے تو اس میں اور عام آدمی میں کیا فرق ہوگا؟

سابق امریکی صدر روز ویلٹ کے مطابق ناقدین اور باہر بیٹھے لوگوں کو حق حاصل نہیں
کہ وہ فیصلہ کریں کہ کونسا کام کیسے کرنا چاہیے اور کون سا کام کیسے کیا جاتا تو بہتر ہوتا، یہ فیصلہ
اس شخص کا ہوتا ہے جو میدان جنگ میں برسر پیکار ہوتا ہے۔ جو خاک آلودہ چہرے اور عرق

صدمہ برداشت کیا۔ انہیں عین عروج کے دور میں راستہ سے ہٹا دیا گیا اور وہ قتل بھی ان
لوگوں کے ہاتھوں ہوئیں جنہیں نہ دین کی سمجھ ہے نہ مستقبل کی پروا۔

دوسری طرف امریکہ کو بھی اب اس حقیقت کا احساس ہو جانا چاہیے کہ دشمن کو بم اور
بارود سے ختم کیا جا سکتا ہے لیکن نظریات کو نہیں۔ امریکہ اگر واقعی پاکستان سے مخلص ہے تو
اسے چاہیے کہ وہ بہترین سکولوں، معیاری یونیورسٹیوں اور جدید سہولیات کے حامل ہسپتالوں
کی تعمیر میں ہماری مدد کرے۔ آج پاکستان خطرناک دوراہے پر ہے قوموں کی تاریخ میں
ساٹھ برس زیادہ اہمیت نہیں رکھتے آج بھی ہم اگر درست فیصلے کر لیں تو نہ صرف اندرونی
انتشار پر قابو پا سکتے ہیں بلکہ بین الاقوامی برادری میں بھی باعزت مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

مسعود اشعر

آئینہ

بینظیر بھٹو کو کس نے مارا؟

بے نظیر بھٹو کو کس نے مارا؟ بھٹو خاندان کے ایک اور فرد کو اپنے راستے سے ہٹانے سے کسے فائدہ ہوگا؟ یہ ہیں وہ سوال جنہوں نے پورے پاکستان کو غم، غصے اور نفرت کی بھٹی میں جھونک رکھا ہے۔ کھوکھلی وضاحتیں اور کمزور صفائیاں ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکتیں۔ جس کے دل کو چوٹ لگی ہے وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ موت گولی لگنے سے ہوئی یا بلٹ پروف گاڑی کی چھت کا لیور (کیل) لگنے سے۔ اسے کسی ایجنسی نے نشانہ بنا کر مارا ہے یا القاعدہ نے؟ اس سے تو اس کی وہ محبوب شخصیت چھین لی گئی ہے۔ جس سے اس نے اپنی ساری زندگی کی آس لگائی ہوئی تھی۔ اور اس سے صرف یہی ایک شخصیت نہیں چھینی گئی ہے۔ بلکہ اس خاندان کی چار شخصیتیں اسی طرح پر اسرار حالات میں اس سے چھین لی گئی ہیں۔ وہ سوال کرتا ہے کہ 18 اور 19 اکتوبر کی درمیانی رات کو کراچی میں بے نظیر بھٹو کے جلوس پر جو گھناؤنا حملہ کیا گیا تھا اس کی تحقیقات کا کیا ہوا؟ اس کے فوراً بعد بے نظیر بھٹو نے مطالبہ کیا تھا کہ اس کی تحقیقات کسی غیر ملکی ایجنسی سے کرائی جائے۔ لیکن اس مطالبے کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا تھا کہ ہماری اپنی ایجنسیاں کافی ہیں اس کے لیے۔ بعد میں بے نظیر ملکی اور غیر ملکی ٹی وی چینلز کو تفصیل کے ساتھ بتاتی بھی رہیں کہ اس رات کیا ہوا تھا، وہاں روشنیاں کیوں بند کی گئی تھیں۔ ایک اکیلی کار وہاں کیوں کھڑی تھی؟ اور کوئی آدمی بار بار ایک بچے کو ان کی طرف کیوں بڑھا رہا تھا؟ مگر کسی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ اب غیر ملکی ٹی وی چینلز بھی مان رہے ہیں کہ ان دنوں امریکی ایجنسی FBI نے اس واقعے کی تحقیقات کے لیے پیش کش بھی کی

ہے۔امریکی ایجنسیاں نہ سہی برطانیہ کی اسکاٹ لینڈیارڈ تو اس کام میں سب سے زیادہ ماہر سمجھی جاتی ہے۔اس کی مدد ہی لی جاسکتی تھی۔اگر اسوقت ان غیر ملکی ایجنسیوں سے مدد لے لی جاتی تو شاید لیاقت باغ والا سانحہ نہ ہوتا کہ اصل مجرم سامنے آگئے ہوتے۔یہ بات عام آدمی کے دماغ میں بیٹھ گئی ہے۔اور انسان کے، اور وہ بھی غم زدہ انسان کے دماغ میں جو بات بیٹھ جائے وہ مشکل سے ہی نکلتی ہے۔لیاقت علی خان کی شہادت سے لے کر اب تک ہماری کس تفتیش اور کس تحقیق نے اصل مجرموں کو بے نقاب کیا ہے؟ اور تو جانے دیجے ۱۲ مئی کو کراچی میں جو خون کی ہولی کھیلی گئی اس کی تحقیقات کا حشر بھی سب کو معلوم ہے۔ٹھیک ہے دہشت گردوں کے خلاف بے نظیر کے بیانوں اور تقریروں سے طالبان القاعدہ اور ان کے حامی ان سے بہت ناراض تھے لیکن ہماری اسٹیبلشمنٹ کے ایک حصے اور اس حصے کی پیداوار سیاسی طاقتوں کی بھٹو خاندان کے ساتھ جو ''دوستی'' چلی آرہی ہے وہ بھی تو کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔بے نظیر کی روشن خیال اور لبرل سیاست اسی طبقے کے قلعے میں تو نقب لگارہی تھی یہ بات پرویز مشرف صاحب بھی خوب جانتے ہیں۔اور لیاقت باغ کے اس عظیم المیہ سے نقصان بھی سب سے زیادہ انہی کو پہنچا ہے۔وہ جو نقشے تیار کررہے تھے وہ سب بکھر گئے ہیں۔کل ہی سی آئی اے کا ایک افسر جو پاکستان میں رہ چکا ہے سی این این پر کہہ رہا تھا کہ اگر پاکستان کی سکیورٹی ایجنسیاں حکمرانوں کے تحفظ میں ہی لگی رہیں گی تو دہشت گردوں کے خلاف موثر طور پر وہ کیسے کام کرسکتی ہیں۔یہ امریکہ سے آنے والی آواز ہے ملک کے اندرونی حالات بے نظیر بھٹو کے جانکاہ سانحے کے بعد ایک نیا رخ اختیار کرچکے ہیں۔اس لئے اب حالات جوں کے توں نہیں رہ سکتے انہیں بدلنا ہی ہوگا۔اور وہ ضرور بدلیں گے۔

د بے نظیر نے وفاق کی سیاست کر کے سندھ سے

سندھ میں سنی گئی۔ذوالفقار علی بھٹو کے بع

ان جماعتوں کی جڑیں اکھاڑ پھینکی تھیں، جنہیں قوم پرست کہا جاتا ہے اور جو صرف صوبے کی سیاست کرتی ہیں۔ لیکن ۲۷ دسمبر کے دن پورے سندھ میں جو نعرے سنے گئے انہوں نے پھر جئے سندھ تحریک کی یاد تازہ کر دی۔ وہ اتنے خطرناک نعرے تھے کہ یہاں انہیں دہراتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ شکر ہے کہ اس وقت آصف زرداری کی سیاسی پختگی نے اس خطرے کو بھانپ لیا کہ انہوں نے اس قسم کے نعرے لگانے والوں کو ڈانٹ دیا۔ اعتزاز احسن جب پنجاب کو آگے بڑھنے کا احساس دلاتے ہیں تو ان کا بھی ہی مقصد ہے۔ بہر حال، اس وقت حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ میاں نواز شریف نے یہ چیلنج قبول کر لیا ہے۔ اور بے نظیر بھٹو کی شہادت کے فوراً بعد انہوں نے صرف بھٹو خاندان کو ہی نہیں پورے سندھ کو گلے لگانے کے لئے پیش قدمی کر دی ہے۔ اس وقت پوری قوم کو اسی کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں دو ہی بڑی سیاسی جماعتیں ہیں۔ ایک پیپلز پارٹی اور دوسری میاں صاحب کی مسلم لیگ۔ بے نظیر بھٹو نے شہید ہو کر اپنی پارٹی کی طاقت اور ساکھ اور بھی بڑھا دی ہے۔ اب الیکشن ایک ہفتے بعد ہوں یا اس کے بھی بعد اس پارٹی کو معقول اکثریت حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ البتہ موجودہ حالات کو یکسر بدلنے اور واقعی جمہوری نظام واپس لانے کے لئے اسے بھی میاں صاحب کی مسلم لیگ کی ضرورت ہوگی۔ ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ میاں نواز شریف جلاوطنی کی بھٹی سے کندن بن کر نکلے ہیں ان کا سیاسی تدبر ہی انہیں اس راستے پر گامزن کر رہا ہے۔ ظاہر ہے پیپلز پارٹی میں قیادت کا خلا آصف زرداری ہی پر کریں گے کہ اس پارٹی کو اکٹھا رکھنے کے لیے بھٹو خاندان کا نام بہت ضروری ہے اور آصف زرداری کی سیاسی بصیرت اسی وقت ظاہر ہو گئی تھی جب جیل سے رہائی کے بعد انہوں نے پنجاب سے سیاست کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس وقت ان حلقوں نے انہیں بددل کر دیا تھا جنہیں اپنی سیاست خطرے میں نظر آتی تھی ورنہ ان کا ہیڈ کوارٹر لاہور ہی رہتا۔ اب بھی وہ خوب جانتے ہیں کہ اس ملک کو طالع آزماؤں سے بچانے کے لیے پنجاب کے سہارے کی ضرورت ہے۔ اور اس کام میں میاں نواز شریف سے زیادہ ان کا مددگار اور کوئی نہیں

ہوسکتا۔ اور میاں نواز شریف اس کے لیے تیار ہیں۔ اس وقت یہ سوال نہیں ہے کہ الیکشن ہوتے ہیں یا نہیں۔ اور الیکشن ہوتے ہیں تو کب ہوتے ہیں اس وقت تو یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں جماعتیں مل جل کر ہی قوم کے لئے امید کی کرن بن سکتی ہیں۔

اب آخر میں روشن خیال اعتدال پسندوں سے کچھ اور سوال کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر اعتزاز حسن کو بے نظیر بھٹو کے جنازے میں شرکت کی اجازت دے دی جاتی تو کونسی قیامت آجاتی؟ چیف جسٹس اور چند اور جج صاحبان کے ساتھ طارق محمود اور علی احمد کو آخر کیوں نظر بند کر رکھا گیا ہے؟ وہ کونسا ایسا کام کردیں گے جو پوری قوم نہیں کر رہی ہے؟

ملک ریاض حسین
حقیقت

کیا ہم یہ افورڈ کر سکتے ہیں؟

یہ 29 دسمبر 2007ء ہفتے کا دن تھا، میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی وفات پر تعزیت کیلئے نوڈیرو گیا، وہاں ہزاروں لوگ جمع تھے اور سب یک زبان ہو کر پاکستان، پنجاب اور فوج کے خلاف نعرے لگا رہے تھے میں نے زندگی میں کبھی پاکستان کے خلاف اتنا بڑا مظاہرہ نہیں دیکھا اور پہلی مرتبہ ہی وہاں، پنجابیوں کو شرمندہ ہوتے بھی دیکھا۔ جب یہ لوگ نعرے لگا رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ غلط ہیں اور کیا ہم نے واقعی سندھ کے ساتھ زیادتی نہیں کی؟ مجھے اس کا اعتراف کرنا پڑا اور وہ لوگ سچے محسوس ہوئے۔ ہم نے 1951ء میں لیاقت علی خان کو راولپنڈی میں شہید کر دیا جن کو سندھی اپنا نمائندہ سمجھتے تھے، 1979ء میں ذوالفقار علی بھٹو کو راولپنڈی میں پھانسی دی اور 27 دسمبر کو محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی راولپنڈی میں ہی شہید کر دیا گیا جبکہ ہم نے اپنی پوری تاریخ میں سندھ کے کسی وزیر اعظم کو اس کا دور اقتدار پورا نہیں کرنے دیا لہٰذا سندھ کی یہ محرومی اور اعتراضات غلط نہیں تھے۔

میرا محترمہ بے نظیر اور آصف علی زرداری صاحب سے ذاتی تعلق تھا، پچھلے آٹھ برسوں میں ہر عید الاضحیٰ پر لندن، امریکہ یا دبئی جاتا جہاں محترمہ سے ملاقات ہوتی تھی۔ آصف علی زرداری رہا ہو کر بیرون ملک منتقل ہوئے تو ان سے بھی ملاقات ہوتی رہی۔ وہ مجھے مین ہٹن نیویارک میں ہوٹل میں ٹھہراتے جہاں دونوں سے گفتگو کا موقع ملتا۔ ان ملاقاتوں میں دونوں کو عمومی تاثر سے بالکل مختلف پایا۔ زرداری صاحب پر کرپشن کے الزام لگے لیکن جب ان کے قریب ہوا تو انہیں انتہائی منکسر المزاج، عاجز خدا خوف اور مہربان شخص پایا اور اسی طرح محترمہ بے نظیر بھٹو کو صاحب بصیرت سادہ اور مخلص شخصیت کا مالک پایا۔ میری جب بھی محترمہ بے نظیر بھٹو سے ملاقات ہوئی انہیں ورکروں اور پاکستان کے بارے میں متفکر دیکھا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی آصف زرداری جس جگہ رہتے تھے اس علاقے کے لوگ

پاکستانیوں سے بے تحاشا محبت کرتے تھے، آپ اس کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی لگا سکتے ہیں میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ بال کٹوانے باربر شاپ پر گیا تو گورے باربر نے بال کاٹتے ہوئے مجھ سے پوچھا، تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟ میں نے اسے بتایا ''میں پاکستانی ہوں'' اس نے کہا '' تم آصف زرداری کے ملک کے رہنے والے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں میں آصف علی کے پاکستان سے ہوں اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی اس نے مجھے گلے لگالیا۔ بال کاٹنے کی اجرت بھی نہیں لی۔ جس جگہ آصف علی زرداری رہتے تھے۔ اگر وہاں ہم کسی مارکیٹ سے خریداری کرنے جاتے اور دکاندار کو یہ علم ہو جاتا ہم آصف علی زرداری کے مہمان ہیں تو وہ ہم سے پیسے لینے سے انکار کر دیتا، اس سارے علاقے میں آصف علی زرداری کی بڑی اچھی شہرت تھی اور لوگ انہیں معزز اور محترم سمجھتے تھے۔ یہ آصف علی زرداری کی شخصیت کا ایک پہلو ہے جبکہ ان کا دوسرا پہلو اس سے بھی شاندار ہے کہ میں چند دن پہلے دبئی تھا، آصف علی زرداری نے مجھے رائل معراج ہوٹل پر چائے کی دعوت دی ہم فارغ ہوئے ہوٹل سے باہر آئے تو اس وقت تک میری گاڑی نہیں پہنچی تھی چنانچہ آصف علی زرداری کہنے لگے، میں ڈراپ کروا دیتا ہوں، میں نے کہا '' ٹیکسی سے چلا جاؤں گا آپ کو زحمت ہوگی، چنانچہ آصف علی زرداری نے ہاتھ بڑھا کر ایک ٹیکسی کو روکا اور میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور پاکستانی تھا لہٰذا میری اس سے گپ شپ شروع ہوگئی۔ میں نے اس سے پوچھا تم صرف ڈرائیونگ کرتے ہو یا اس کے ساتھ کوئی اور کام بھی کرتے ہو؟ وہ کہنے لگا'' میں ائیر کنڈیشنر کا ماہر ہوں اور ایک کمپنی میں کام کرتا ہوں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے ایک گردہ خراب ہو گیا جس کی وجہ سے اب میں صرف ٹیکسی چلاتا ہوں، میں نے اس سے کہا '' اگر تم ائیر کنڈیشنر کے ماہر ہو تو تم پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے بحریہ ٹاؤن میں ائر کنڈیشنر کے بہترین ماہرین کام کر رہے ہیں تم ان کے ساتھ جا کر کام شروع کر دو اس کا جواب حیران کر دینے والا تھا۔ اس نے کہا '' میں آصف علی زرداری کی وجہ سے پاکستان واپس نہیں جانا چاہتا۔ مجھے پتہ چلا ہے آصف علی زرداری بہت پیسے لیتا ہے۔ میں نے اس

سے پوچھا، تم نے خود اسے دیکھا ہے۔ اس کا کہنا تھا، میں بہت عرصہ پہلے ایک گھر میں اے سی لگا رہا تھا تو آصف زرداری نے اس اے سی میں سے بھی اپنا حصہ چارج کیا تھا، میں اس کی بات پر ہنس پڑا اور اس کے بعد اس سے پوچھا، کیا تم آصف علی زرداری کی شکل سے واقف ہو۔ اس نے ''نہیں'' میں سر ہلا دیا۔ میں اس کی سادگی پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا اور وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا میں نے اسے کہا تم جانتے ہو جس بندے نے مجھے ٹیکسی میں بٹھایا ہے وہ کون تھا۔ اس نے ایک بار پھر دائیں سے بائیں گردن کو جھٹکا دیا میں نے بتایا کہ یہ وہی آصف علی زرداری تھے، اس نے حیرت زدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا، میں آج تک آصف زرداری سے نہیں ملا لیکن ان کی شہرت بڑی خراب ہے۔ مجھے اس ڈرائیور کی گفتگو سے اندازا ہوا آصف علی زرداری کو خواہ مخواہ بدنام کیا گیا حالانکہ اگر ان سے کوئی شخص مل لے تو وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے، ان کی شخصیت اور ان کے خلاف پھیلائے گئے پروپیگنڈے میں بہت فرق ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ آصف علی زرداری نے میڈیا میں لابنگ نہیں کی، یہی مسئلہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ بھی تھا، لہٰذا ان دونوں کی شخصیت کی اصل خوبصورتی سامنے نہیں آسکی۔

آصف علی زرداری سے تعزیت کر کے واپس آرہا تھا تو میرا دل بہت دکھی تھا، میری آنکھوں کے سامنے ہزاروں کا مجمع تھا اور اس مجمعے سے پاکستان، پنجاب اور فوج کے خلاف نعرے بلند ہو رہے تھے مجھے پہلی بار محترمہ بے نظیر بھٹو کی اصل شخصیت کا ادراک ہو رہا تھا، میں سوچ رہا تھا محترمہ واقعی چاروں صوبوں کے درمیان ایک کڑی تھیں، وہ تسبیح کی اس گرہ کی مانند تھیں جس کی وجہ سے سارے موتی لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔ لیکن جب یہ گرہ ٹوٹی تو یہ موتی ایک ایک کر کے بکھرنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ مجھے پہلی بار ایسا لگا جیسے پاکستان کی سلامتی کے دشمن قیامت کی چال چل گئے ہوں اور ہم ابھی تک سو رہے ہوں۔ مجھے محسوس ہوا ہم بہت ظالم اور بے وفا لوگ ہیں کہ ہم نے بھٹو کے پورے خاندان کو مار ڈالا اور پاکستان کی سالمیت کو خطرے سے دوچار کر دیا۔ میں نوڈیرو سے گھر تک سارے راستے ہر

شہر، ہر قصبے اور ہر بستی کا مشاہدہ کرتا آیا، مجھے اس سارے سفر کے دوران کوئی ایسا شہر کوئی ایسی گلی، کوئی ایسا بازار اور کوئی ایسی سڑک نظر نہیں آئی جہاں سوگواریت نہ چھائی ہوئی ہو اور جہاں توڑ پھوڑ نہ کی گئی ہو۔ میں محترمہ کی شہادت پر لوگوں کا ''ردعمل'' دیکھ کر حیران رہ گیا اور مجھے محسوس ہوا بے نظیر واقعی ہر پاکستانی کے دل میں بستی تھیں۔ محترمہ سے لوگوں کی یہ محبت اور یہ پیار اپنی جگہ ایک بڑی حقیقت ہے لیکن اس دن کی صورتحال دیکھ کر میرا دل رو رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا اگر ہم اب بھی نہ سنبھلے اور اپنی اصلاح نہ کی تو حالات 1971ء کی صورتحال سے بھی بھیانک شکل اختیار کر سکتے ہیں سوال یہ ہے اگر خدانخواستہ پاکستان کو نقصان پہنچتا ہے تو کیا ہم سب اس کے متحمل ہو سکتے ہیں؟

منصور آفاق

کالم کہانی

موت کا معمہ

زندگی کی نوید دینے والی ساعت مرگئی ہے۔اس ٹہنی کو کاٹ دیا گیا ہے جس پر پھول کھلنے والے تھے۔درختوں کے ہاتھ پھر خالی ہوگئے ہیں۔رستے میں کسی نے بہار کو لوٹ لیا ہے۔گلابوں کی سرخ کلیوں سے لہو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔وہ جہاں ہنگامہ بہاراں بپا ہونے والا تھا وہاں نوحہء غم گونج رہا ہے۔آنسوؤں کے میلے لگے ہوئے ہیں۔آہوں کے آتش فشانوں کے دھانے کھل چکے ہیں۔گلی گلی میں درد کی انجمن آباد ہے۔دلوں کے شہروں سے بین کرنے کی آوازیں آرہی ہیں۔دسمبر کی یخ بستہ دھوپ ہمیں موت کی تلخی دے گئی ہے۔

یہ کہہ کے ہمیں چھوڑ گئی روشنی اک رات
تم اپنے چراغوں کی حفاظت نہیں کرتے

ہاں وہی ایک چراغ تھا جو بجھا دیا گیا۔ایک نور کی تنویر اندھیروں میں اتار دی گئی۔۔۔داغِ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی۔۔آخری شمع بھی خاموش ہوگئی۔وہ جو فیض فرما گئے ہیں۔

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے۔۔۔

کوئی ان سے پوچھے کہ ابھی اور کتنی قتل گاہیں آباد ہونی ہیں۔رات کو ابھی اور چراغوں کا کتنا خون چاہیے۔قربان گاہ کی پیاس کیوں نہیں بجھتی۔

قربان گاہ کی پیاس اپنی جگہ پر مگر اس سے پہلے یہ معلوم کرنا انتہائی ضروری ہے کہ یہ قربان گاہ آباد کس نے کر رکھی ہے کون ہے جو ہمیں لہو لتھڑے سروں کے تحفے بھیج رہا ہے۔یہ بات کسی معمہ سے کم نہیں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کا قاتل کون ہے۔بیت اللہ محسود نے انکار کر دیا ہے۔وہ اس جرم میں شریک نہیں ہے القاعدہ والے بھی انکار کر چکے ہیں تو پھر سوال پیدا

ہوتا ہے کہ بے نظیر بھٹو کا قتل کس نے کرایا ہے ایک بات یہ بھی اپنی سمجھ سے بالاتر ہے کہ وزارت داخلہ نے ان کی موت کے متعلق ایسے بیانات کیوں دیئے جنہیں ٹیلی ویژن کیمروں نے غلط ثابت کر دیا ہے اگر بیت اللہ محسود یا القاعدہ ہی محترمہ کی موت کے پیچھے ہیں تو انہیں انکار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر انہوں نے یہ کام کرنا ہے۔ تو پھر اتنی بڑی کامیابی کا سہرا اپنے سر سجانے سے منحرف کیوں ہیں۔ وہ تو کہتا ہے کہ عورتوں کو قتل کرنا ہماری روایات میں ہی نہیں ہے۔ کراچی میں محترمہ کی آمد کے موقع پر جو دھماکہ ہوا تھا بیت اللہ محسود نے اس کی ذمہ داری لینے سے بھی انکار کیا تھا اور محترمہ نے بھی اس سلسلے میں اس پر کبھی الزام عائد نہیں کیا تھا بلکہ محترمہ نے اپنے امکانی قاتلوں کی فہرست بھی دی تھی مگر میرا خیال ہے اس میں کچھ ایسے بھی نام شامل تھے جو سیاسی وجوہات کی بناء پر دیئے گئے تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محترمہ کی موت سے کسے فائدہ ہوسکتا ہے؟ سیاسی میدان میں قاف لیگ ہے انہیں فائدہ ہوسکتا ہے اس لئے ہوسکتا کہ وہ بے وقوف لوگ نہیں ہیں وہ جانتے ہیں کہ زندہ بے نظیر بھٹو سے کہیں زیادہ خطرناک مردہ بے نظیر بھٹو ہوگی اور اس وقت کی صورت حال سامنے ہے کہ پورے ملک میں جو بھی بے نظیر بھٹو کے نام پر الیکشن لڑیگا عوام اسی کو ووٹ دیں گے۔ صدر پرویز مشرف کو بھی محترمہ کی موت سے کوئی فائدہ نہیں تھا انہیں تو اپنی صدارت کا دورانیہ طویل کرنے کیلئے محترمہ کی اشد ضرورت تھی اس وقت محترمہ کے دنیا سے جانے کے بعد سب سے مشکل صورت حال میں وہ ہیں اور انہیں کافی عرصہ پہلے اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ اب وہ صرف قاف لیگ کے سہارے زیادہ دیر تک حکومت نہیں کر سکتے سو انہوں نے دبئی جا کر بے نظیر بھٹو سے ملاقات کی تھی مفاہمتی آرڈیننس جاری کیا تھا اور بے نظیر بھٹو کی خواہش پر نواز شریف کو بھی ملک میں واپس آنے دیا تھا۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ بات بھی طے تھی کہ آئندہ ملک کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے ہی ہونا تھا اور اس سلسلے میں تیسری بار وزیر اعظم نہ بننے کی پابندی کے خاتمے کیلئے آرڈیننس بھی تیار کیا جا چکا تھا۔ بے نظیر کے وزیر اعظم بننے سے قاف لیگ کو بھی کوئی خطرہ

نہیں تھا کیونکہ صدر مشرف کی موجودگی میں اگر حکومت ان کے پاس نہ بھی ہوتی تو وہ پھر بھی اقتدار میں ہوتے۔ پھر بے نظیر بھٹو کے متعلق سب لوگ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ انتقام لینے والی خاتون نہیں تھیں دو مرتبہ وزیر اعظم بننے کے باوجود انہوں نے کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ انکے باپ کے قاتل کون ہیں۔

اب ذرا یہ سوچتے ہیں کہ اگر بینظیر بھٹو وزیر اعظم بن جاتیں تو کیا کیا کرتیں۔ اقوام متحدہ کی تحقیقاتی ایجنسیوں کو ڈاکٹر قدیر خان تک رسائی دیتیں؟ تصور کر لیتے ہیں کہ رسائی دے دیتیں۔ تو ڈاکٹر قدیر خان کیا کہہ دیتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ کسی پردہ نشین کا نام بھی اس کیس میں لیا جانے لگتا۔ شمالی علاقہ جات میں جہاں دہشت گرد موجود ہیں وہاں امریکی اور برطانوی فوجیوں کو کارروائی کی اجازت دے دیتیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وزیر اعظم بننے کے بعد وہ دونوں کام نہ کرتیں۔ ہاں البتہ نواز شریف سے کیا ہوا یہ خفیہ وعدہ ضرور پورا کرنے کی کوشش کرتیں کہ معزول چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کو بحال کر دیا جائے۔ بے نظیر بھٹو کے اقتدار میں آنے سے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں حالات زیادہ بہتر ہوتے خاص طور پر مشرف کی جو سول سوسائٹی کے پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ بھی جنگ کی سی فضا بن گئی ہے وہ محترمہ کے آنے کے بعد ختم ہو جاتی۔ بگٹی اور بلوچستان کے دوسرے قبائل حکومت میں شریک ہوتے۔ یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ یہ کام غیر ملکی ایجنسیوں کا ہے جو پاکستان کو مستحکم ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتیں۔ لیکن ان تمام طاقتوں کا ''بابا'' صدر بش اس وقت بے نظیر بھٹو کے ساتھ تھا۔ جس طرح کا ماڈرن پاکستان اس کی ضرورت ہے اس میں بے نظیر بھٹو سے بہتر کوئی کارڈ اس کے پاس موجود نہیں تھا۔ ان تمام وجوہات میں کوئی ایسی وجہ ابھی تک سامنے نہیں آ رہی جس کی بنیاد پر کہا جا سکے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو اس وجہ سے شہید کیا گیا ہے۔

محترمہ کی موت پر پورے ملک میں جو بدامنی کی صورت حال پیدا ہوئی اہل اقتدار اس بات کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ وفاق کی علامت ہیں۔ وفاق کی

ایسی زنجیر ہیں جسے توڑنے پر ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے میرا خیال ہے کوئی پاکستانی اپنے لاکھ مفادات کے باوجود اس حد تک نہیں گر سکتا۔ یقیناً یہ ان لوگوں کا کام ہے جو ملک کی سالمیت کیخلاف ہیں۔ مگر اس وقت وہ کون ہیں؟ محترمہ بے نظیر بھٹو کی موت کا معمہ میرے خیال میں خاصہ الجھا ہوا ہے یہ اتنی آسانی سے سلجھتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ مستقبل میں اگر یہ معمہ حل ہوا تو اس کے پس منظر میں غیر ملکی طاقتیں ضروری دکھائی دیں گی ممکن ہے ہمارا ہمسایہ ملک بھی اس سازش میں شریک ہو۔

منو بھائی

ہاں یہ تو میں بھی جانتی ہوں

ہر سال نئے سال کی دہلیز پر غروب ہوتے ہوئے ہم سے کچھ نہ کچھ چھین کر لے جاتا ہے مگر اکیسویں صدی کا آٹھواں سال 2007ء جاتے جاتے ہمیں بہت زیادہ دکھی کر گیا۔ اس دکھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی عالمی شہرت رکھنے والی چیئر پرسن محترمہ بے نظیر بھٹو کے المناک قتل کا دکھ تھا جس نے قومی زندگی کے بہت سے المناک واقعات کی یاد تازہ کر دی۔ ان واقعات میں ملک کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی شہادت، ملک کے پہلے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی پر لٹکائے جانے کا دکھ۔ ملک کے ایک بڑے حصے کو ملک سے الگ کر دیئے جانے کا دکھ اور اکتوبر 2005ء کے پورے ملک کو دہلا دینے والے زلزلے میں ہلاک ہونے والوں کے دکھ شامل تھے۔ ایک اضافی دکھ یہ بھی ہوا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی زندگی کی صورت میں پوری دنیا میں پاکستان کا ایک اچھا، خوبصورت، متوازن اور روشن خیال امیج موجود تھا اور جس امیج یا تصور یا تشخص کی ہمیں بہت زیادہ ضرورت تھی وہ ہمارے پاس اب نہیں رہا اور ہمارے تیزی سے بگڑتے ہوئے تصور کی زد میں آ کر مارا گیا ہے یا پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ کمزور ہو گیا ہے۔

سال 2007ء ہمارے ثقافتی ماحول سے اسماعیل گل جی جیسے بے مثال مصور، اظہار قاضی اور شفیع محمد جیسے ٹیلی ویژن اور تایا الیاس کاشمیری کی صورت میں ایک قد آور فلمی اداکار بھی لے گیا ہے۔ ہمارے ادب کو اے۔ جی جوش اور راجہ رسالو جیسے لوگوں سے بھی محروم کر گیا ہے۔ اے۔ جی جوش، راجہ رسالو، شفیع محمد، تایا الیاس اور اسماعیل گل جی صاحب سے میری ذاتی جان پہچان، یاد اللہ اور راہ رسم دنیا بھی تھی اور ان کے علاوہ میرے ایک بہت ہی مہربان دوست چمپئن پینٹس کے مالک یعقوب صاحب بھی 2007ء کے دوران مجھے ذاتی طور پر صدمہ دیتے ہوئے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے مگر 27 دسمبر 2007ء کی سہ پہر کے بعد میرے ذاتی صدموں میں ایک بہت بڑا اضافہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کے

ساتھ ہو گیا اور وہ سب لوگ بہت شدت کے ساتھ یاد آئے جن کے ساتھ میں اس صدمے کی ساجھے داری کر سکتا تھا، مگر وہ اب دنیا میں موجود نہیں تھے۔

بے نظیر بھٹو کے لیاقت باغ راولپنڈی میں قتل سے تعلق رکھنے والے منظر ٹیلی ویژن کی سکرین پر دیکھتے ہوئے مجھے بائیں بازو کے سال رواں کے دوران وفات پا جانے والے لیڈر ٹیڈ گرانٹ بہت یاد آئے جنہوں نے سال 1997ء میں سپین کے شہر بارسلونا میں ایک ملاقات کے دوران محترمہ بے نظیر بھٹو کے مارے جانے کی پیش گوئی کی تھی اور میں نے یہ پیش گوئی محترمہ بے نظیر بھٹو کے گوش گزار بھی کر دی تھی۔ یہ بتانا میرے پڑھنے والوں کی دلچسپی کا باعث بن سکتا ہے، ستانوے سال کی عمر میں وفات پانے والے ٹیڈ گرانٹ کوئی ستارہ شناس، نجومی یا ''ہرڑ پوپو'' نہیں تھے، حالات و واقعات کے معروض اور ان کے عوامل کے تجزیئے کے ذریعے آنے والے ممکنہ تناظر پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے اس تناظر سے ان کے بہت سے خوشہ چینوں نے سٹاک ایکسچینج کی جوئے بازی میں لاکھوں کروڑوں ڈالر کمانے کا کاروبار بھی کیا جس کے پیچھے ٹیڈ گرانٹ کے بیان کردہ تناظر سے اخذ کردہ معلومات کام کر رہی ہوتی تھیں۔ یہ بیان کرنا بھی بہت سے لوگوں کیلئے دلچسپی کا باعث بن سکتا ہے کہ بائیں بازو کے جن دانشوروں نے سب سے پہلے سوویت یونین کے ٹوٹ کر بکھر جانے کی پیش گوئی کی تھی، ان میں ٹیڈ گرانٹ سرفہرست تھے اور جب انہوں نے یہ پیش گوئی کی تھی مغربی اور سامراجی دنیا کے بڑے بڑے نابغوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سوشلزم کا نام لینے والے سوشلزم کے سب سے بڑے مظہر سوویت یونین کے ساتھ کیا کچھ کر چکے ہیں اور کچھ ہونے والا ہے۔

بارسلونا کی ایک کانفرنس کے دوران ایک شام میں نے بابا ٹیڈ گرانٹ سے باتوں باتوں میں پوچھا کہ آپ کے خیال میں پاکستان کی سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو پاکستان کی قومی سیاست سے باہر ہو چکی ہیں؟ ٹیڈ گرانٹ نے جواب دیا ''نہیں ہرگز نہیں'' پوچھا کیا وہ پاکستان کی قومی سیاست میں کوئی کردار ادا کر سکیں گی؟ انہوں نے بتایا کہ ہو سکتا ہے کہ

پاکستان کے حکمران طبقے کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے کہ جن میں پاکستان کے 69-1968ء جیسے طبقاتی تصادم کے خدشات بہت زیادہ ابھر آئیں، ان حالات میں پاکستان کا حکمران طبقہ بے نظیر بھٹو کو ایک مرتبہ پھر استعمال کرنے کی عملی کوشش کرے گا اندیشہ ہے کہ بے نظیر بھٹو کا یہ استعمال ان کا آخری استعمال ہوگا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو ٹیڈ گرانٹ کو جانتی تھیں اور ان کی تحریروں کا مطالعہ بھی کر چکی تھیں چنانچہ میں نے جب اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر اپنے گھر میں بلایا تو بے نظیر بھٹو نے کہا کہ آپ کو ٹیڈ گرانٹ کے اصلی کہے ہوئے الفاظ جو آپ کو یاد ہوں سنائیں۔

میں نے ان کی اس خواہش کو پورا کیا مگر ٹیڈ گرانٹ کے ان الفاظ کو قدرے مختلف انداز میں دوہرایا کہ ''اندیشہ ہے کہ بے نظیر بھٹو کا یہ استعمال ان کا آخری استعمال ہوگا'' اس کے بجائے میں نے کہا کہ انہوں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ بے نظیر بھٹو کے دشمن انہیں سیاسی منظر سے غائب کرنے کی سازش کر سکتے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے کہا کہ ''ہاں یہ تو میں بھی جانتی ہوں''۔

نجم سیٹھی

بینظیر کے بعد

بے نظیر کی ناگہانی موت نے ان کے سیاسی قد کاٹھ میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ ان کے قتل کے بعد عالمی سطح پر سونے اور تیل کی قیمتوں میں اضافہ ہوا اور سٹاک مارکیٹ میں 700 پوائنٹس کی کمی ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں بینظیر کے قتل سے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کو ایک ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے کیونکہ نیوکلئیر پاکستان کا استحکام دنیا کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے اور انہیں بینظیر سے بڑی توقعات تھیں۔ سندھ میں مظاہرین نے اربوں روپے مالیت کی جائیدادیں اور املاک تباہ کر دیں، سندھیوں کے ردعمل نے کئی سوالوں کو جنم دیا ہے۔ وفاق کی علامت رہنماء کے قتل پر ان کا ردعمل وفاق سے ان کی دوری ظاہر کرتا ہے۔ پاکستان پہلے بھی دولخت ہوا اور اس وقت پی پی پی ہی وہ واحد پارٹی ہے جس کی جڑیں وفاقی سطح پر ہیں دوسری بڑی جماعت پی ایم ایل گروپ بندی کا شکار ہے۔ بینظیر کے قاتل کون ہیں؟ بینظیر نے مشرف حکومت میں شامل ضیاء باقیات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ حکومت دعویٰ کر رہی ہے کہ اب تک فوج، مشرف اور امریکہ نواز راہنماؤں پر کئے گئے خودکش حملے بیت اللہ محسود کی ہدایت پر ہوئے غالباً سچائی دونوں کے درمیان ہے۔ اگر حکومت میں ضیاء کی باقیات موجود ہے جو محترمہ کی جان کے درپے تھی تو پھر یقیناً ان کے القاعدہ نیٹ ورک اور طالبان کے ساتھ قریبی روابط ہوں گے جس کے پاس خودکش حملوں کی تمام اہلیت موجود ہے۔ ان میں زیادہ تر وہ جہادی تنظیمیں ہیں جو کشمیر میں کارروائیاں کرتی رہیں۔ بھارت کے ساتھ پرامن و دوستانہ تعلقات پر بات چیت کا جب آغاز ہوا، انٹیلی جنس اداروں نے ان کی سرپرستی نہ صرف بند کر دی بلکہ سرگرمیوں سے بھی روک دیا۔ اس وقت سے یہ تنظیمیں کافی سیخ پا ہیں۔ حکومت کی بدقسمتی ہے کہ پاکستانیوں کی اکثریت اسے کسی نہ کسی حد تک سانحہ کا ذمہ دار ٹھہرا رہی ہے۔ شکوک بے بنیاد نہیں تحقیقات میں سنگین کوتاہیاں کی گئیں، عجلت میں شواہد مٹائے گئے ان حالات میں شکوک پیدا ہونا قدرتی

امر ہے۔ تاہم اس کا سیاسی فائدہ صرف پی پی اور نقصان مشرف اور ق لیگ کے حصے میں آرہا ہے۔ سکاٹ لینڈ یارڈ سے تحقیقات کروانے کے فیصلے کے بعد بھی عوام کے شکوک و شبہات ختم نہیں ہوں گے۔ آصف زرداری کیسے رہنما ثابت ہوں گے؟ بلاول کو پارٹی کا چیئرمین نامزد کر کے انہوں نے اچھا فیصلہ کیا۔ تاہم پارٹی کمان ان کے ہی پاس رہے گی۔ پاکستان کے قبائلی معاشرے میں خونی رشتوں کو ہی اہمیت حاصل ہے اس وجہ سے سیاست خاندانی میراث بن گئی ہے۔ دادا سے پوتے کو وراثت منتقل ہو رہی ہے ایوب خان کے پوتے، ضیاء الحق کا بیٹا، فاروق لغاری اور ان کے بیٹے، نواز شریف خاندان اور سب سے اہم بھٹو خاندان سیاسی گدی کے وراث ان کی اولادیں ہی ہوں گی۔ محترمہ بینظیر بھٹو کی اصل میراث ان کے نظریات کی پاسداری ہے پارٹی اور عوام کی وفاداری پر وہ اندھا اعتماد کرتی تھیں۔ زرداری کو پارٹی اتحاد قائم رکھنے کے لئے محنت کرنا پڑے گی۔ اندرونی و بیرونی دباؤ کا انہیں سامنا رہے گا۔ ان کے لئے یہ بڑا چیلنج ہے۔ زرداری نے مشرف کی برطرفی کے لئے تحریک چلانے کی بجائے عام انتخابات میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ یہ ان کی حقیقت پسند سوچ کا مظہر ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ ایسے موقع پر محترمہ بینظیر بھٹو مشرف پر دباؤ بڑھا کر زیادہ سے زیادہ سیاسی فائدہ اٹھاتیں۔ زرداری اس کھیل میں نئے ہیں۔ اس لیے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پی پی کو موجودہ حالات کا فائدہ پہنچنے کا امکان ہے۔ ہمدردی کی لہر ان کے حق میں جائے گی۔ انتخابات میں تاخیر سے اس کی شدت میں کمی آسکتی ہے۔ اگر انتخابات میں دھاندلی نہ ہوئی تو پی پی ن لیگ کے ساتھ بڑی اکثریت حاصل کر لے گی۔ ق لیگ شاید تیسرے نمبر پر آئے مگر ایسا ہونے کا امکان کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ صدر مشرف کسی صورت اپنی سیاسی بقاء شفاف انتخابات پر نہیں چھوڑیں گے۔ پی پی کو اکثریت بھی ملی تو ایسے حالات پیدا کئے جائیں گے کہ وہ حکومت نہ بنا سکے۔ ن لیگ اور پی پی کا شراکت اقتدار، ان کو ضرور پریشان کرتا ہے۔ اس لیے خفیہ ہاتھوں کے عمل میں آنے کے

امکان کو آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ دھاندلی اگر بڑے پیمانے پر ہوئی تو سخت ردعمل ہوگا جو انتخابی عمل کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ اگر دھاندلی محدود پیمانے پر ہوئی تو انتخابات کے بعد کا منظر نامہ مشرف کے لئے خطرے کی گھنٹی ہوگا۔ دونوں صورتوں میں نقصان مشرف کا ہی ہوگا۔ ردعمل سے جو عدم استحکام اور انارکی پھیلے گی وہ دنیا بھر کے لیے خطرے کی گھنٹی ہوگی۔ اس صورت سے حال سے بچنے کے لئے بہتر ہوگا کہ مشرف شفاف انتخابات کا انعقاد کروائیں اور نئی آنے والی حکومت کے لیے مسائل کھڑے نہ کریں۔ اسے حکومت بنانے دیں اور خود اقتدار سے دستبردار ہو جائیں۔ ان کے خلاف پائی جانے والی ناپسندیدگی اس عمل سے نہ صرف کم ہوگی بلکہ ایک حقیقی قومی حکومت کا قیام بلکہ اگلے پانچ سالوں کے لئے ممکن ہو جائے گا۔ بینظیر کی جمہوری اقتدار کیلئے جدو جہد کو اس طرح ہی خراج تحسین پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کی قربانی نے سول سوسائٹی کو بیدار کر دیا ہے اور تمام سیاسی جماعتیں انٹیلی جنس اداروں اور فوج کی سیاست میں مداخلت کے خلاف متحد ہو گئی ہیں موقع پرستی تشدد، تفرقہ اور نفرت کی جس سیاست کو وہ فروغ دے رہی تھی اس سے وہ برگشتہ ہو گئی ہیں جو جمہوری روح، وفاق اور روشن خیالی کی ضد ہیں۔

نذیر ناجی

سویرے سویرے

کچھ سوکھے ہوئے آنسو

مجھے شعور کی آنکھ کھولے 55 سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے اس دوران کیسے کیسے سانحے نہیں ہوئے ہوں گے؟ مجھے نہیں یاد کہ پوری پاکستانی قوم اور عالمی برادری کسی بھی ایک سانحے پر اتنے گہرے صدمے سے دوچار ہوئی ہو۔ بینظیر بھٹو انسانی حیثیت سے بہت اوپر چلی گئی تھیں۔ سیاسی تقسیم کی دیواریں ان کے آگے ٹوٹ چکی تھیں۔ ملکوں کی سرحدیں ان کے سامنے سرنگوں ہو چکی تھیں اور قوموں کے فاصلے ان کی ذات کے لئے مٹ چکے تھے۔ تیسری دنیا میں اور کسی خاتون کو یہ سربلندی نصیب نہیں ہوئی۔ اندرا گاندھی ہم سے پانچ گنا بڑے ملک کی لیڈر اور وزیراعظم تھیں۔ انہیں بھی گولیوں کا شکار بنایا گیا تھا۔ ان کی موت بھی ایک بڑا سانحہ تھی۔ لیکن اس سانحہ پر بھارت تین دن کے لئے اس طرح سوگ میں نہیں ڈوبا جیسے بینظیر کیلئے، پاکستان اور نہ ہی عالمی میڈیا میں مسلسل کئی دنوں تک اس سانحہ کی خبر اس طرح چھائی رہی جیسے بی بی کی خبر...... یہ بینظیر کی عظمت کا ایک ایسا اعتراف تھا جو غیر معمولی شخصیتوں کے حصے میں آتا ہے پاکستان میں یہ سانحہ بجلی کی طرح گرا اور پورا ملک سکتے کی حالت میں آ گیا۔ کسی نے ہڑتال کی اپیل نہیں کی۔ کسی نے سوگ منانے کا اعلان نہیں کیا۔ کسی نے ماتمی تقریب نہیں کی لیکن گلی گلی صف ماتم تھی اور گھر گھر بین ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ہر شہر، ہر گلی اور ہر گھر میں کسی اپنے کی موت ہوئی ہو۔ شہادت بھٹو صاحب کو بھی نصیب ہوئی تھی لیکن بینظیر کی شہادت بینظیر تھی۔ بھٹو صاحب کی شخصیت میں تیزی اور طراری کے ساتھ ساتھ جارحانہ انداز بھی تھا اور وہ اپنی بے پناہ ذہانت کا اظہار ایسے انداز میں کرتے کہ دوسرے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔ اور بھٹو صاحب اس کیفیت سے خوب لطف اندوز ہوتے۔ انہیں دوسرے کا ذہن پڑھنے کا بھی کمال حاصل تھا۔ مخاطب ابھی ابتدائیہ بھی مکمل نہ کرتا کہ بھٹو صاحب خود بتا دیتے کہ وہ کیا کہنے آیا ہے اور ان کا قیافہ

عموماً درست ہوتا۔ یہی خوبیاں بینظیر میں بھی تھیں۔ انہیں اپنی ذہنی سبقت سے لطف اندوز ہونا اچھا لگتا۔ نوعمری میں وہ بھی اپنے عظیم والد کی طرح سب سے پہلے کوئی نیا نکتہ پیش کر کے فاتحانہ انداز میں لطف اندوز ہوا کرتیں۔

1977ء کا واقعہ ہے کہ بھٹو صاحب جیل میں تھے۔ بیگم نصرت بھٹو نے راولپنڈی میں سید اصغر علی شاہ کے گھر ایک پریس کانفرنس بلا رکھی تھی۔ وہ اپنے انداز میں ضیاء الحق پر تنقید کر رہی تھیں۔ بینظیر انہیں ٹوک کر اپنی بات کرنے لگیں۔ کبھی کہتیں یہ کشمیر کو بیچ دے گا اور کبھی الزام لگاتیں کہ یہ اپنے اقتدار کی خاطر پاکستان کا سودا کر دے گا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بیگم بھٹو کو یہ مداخلت اچھی نہیں لگ رہی تھی لیکن وہ بینظیر کے سامنے بزرگانہ برتری دکھانے سے گریز کیا کرتی تھیں۔ بھٹو صاحب بینظیر کو اپنا پہلا بیٹا کہتے تھے۔ یہ پہلا بیٹا بہت ہی لاڈلا اور سر چڑھا تھا۔ بھٹو صاحب کے مقدمے اور اس کے بعد اپنی قید کے دوران بینظیر کی شخصیت کا جارحانہ عنصر ہمیشہ نمایاں رہا۔ وہ حکومت اور ضیاء الحق پر سخت سے سخت تنقید کیا کرتیں۔ پارٹی کے سینئر لیڈر بینظیر کے اس انداز پر خوش نہیں تھے لیکن ان کے سامنے بولنا مہنگا کام ہوتا۔ جس کسی نے ان پر بزرگی جھاڑنے کی کوشش کی اسے گھر بیٹھنا پڑا۔ سیاسی مخالفین پر وہ عقاب کی طرح جھپٹتیں۔ 1988ء، 1990ء، 1993ء اور 1997ء کی انتخابی مہمات میں بینظیر نے اپنے سیاسی مخالفین پر جو حملے کئے ان کے بعض جملے سن کر بی بی کے اپنے حامی بھی حیرت میں ڈوب جاتے لیکن وہ اپنے اس جارحانہ انداز کو پسند کرتی تھیں۔

1986ء میں ایک پریس کانفرنس کے دوران وہ مجھ پر بھی برس پڑیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ بعد میں افسوس کا اظہار کریں گی لیکن کئی سال تک ایسا نہ ہوا اور جب ہوا تو یہ میرے لئے ہی نہیں پاکستان بھر سے آئے ہوئے صحافیوں اور دانشوروں کے لئے حیرت انگیز تھا۔ محترمہ پاکستان کی وزیر اعظم تھیں۔ ہم ان کے ڈنر پر مدعو تھے۔ جب وہ ہال میں داخل ہوئیں تو اپنی روایتی بلند آواز میں پوچھا، ناجی صاحب کہاں ہیں؟'' میں دور کی ایک میز پر بیٹھا تھا۔ حسین حقانی سیکرٹری اطلاعات تھے، انہوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے نشاندہی کی۔ تو بی

بی نے وہیں سے مخاطب ہو کر مجھے مرکزی میز پر بلایا۔ ان کے سامنے ایک کرسی خالی پڑی تھی۔ مجھے اس پر بیٹھنے کی دعوت دی اور پھر بتایا یہ کرسی آصف صاحب کیلئے رکھی تھی۔ جس پر آپ بیٹھے ہیں۔ یہ خصوصی عزت افزائی کا ایک ایسا انداز تھا جس کی اہمیت وہی سمجھ سکتا ہے جو بھٹو خاندان کے مزاج سے واقف ہو۔ اس کے بعد بی بی نے مجھے تقریر نویسی کی دعوت دی۔ یہ غیر معمولی مہربانی اس تلخ کلامی کی تلافی کے لئے تھی جس کا مجھے 1986ء میں ہدف بننا پڑا تھا لیکن تلافی کے اس انداز سے میری وہ عزت افزائی ہوئی جو میرے پیشے سے تعلق رکھنے والوں کو کم ملتی تھی۔

یہ ذاتی واقعہ بر سبیل تذکرہ آ گیا۔ درحقیقت میں اس طویل سفر کا چند جملوں میں احاطہ کرنا چاہتا ہوں جو بینظیر بھٹو نے پنکی سے بی بی بننے تک طے کیا۔ میرا خیال ہے کہ بی بی کے جارحانہ انداز میں نرمی اس وقت پیدا ہونا شروع ہوئی۔ جب انہیں ماں بننے کا اعزاز ملا۔ مامتا محض اولاد کیلئے نہیں ہوتی۔ یہ ایک جذبہ ہوتا ہے جو اپنے بچے سے شروع ہو کر جب پھیلنے لگتا ہے تو پوری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ جس بی بی کی شہادت پر بلا تفریق ہر خیال کے لوگ دکھ میں ڈوبے ہیں وہ قوم کے لئے ایک ماں اور بہن کی محبت کی علامت بن چکی تھیں۔ گزشتہ چند سال سے بینظیر کی جارحیت پر مامتا غالب آنے لگی تھی۔ اپنے سیاسی مخالفین پر جس طرح کی وہ تنقید ماضی میں کیا کرتی تھی وہ ماند پڑنے لگی تھی اور آپ نے دیکھا کہ ان کے بدترین سیاسی مخالفین بھی اب ان کے ساتھ کام کرنے کے امکان پر گھبرانا چھوڑ چکے تھے خصوصاً نواز شریف کے ساتھ باہمی تعاون کا جو رشتہ استوار ہوا وہ بینظیر کی اس تبدیلی کا سب سے بڑا ثبوت ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا۔ آخر میں لڑاکو پنکی کے اندر جنم لینے والی مامتا کا قصہ خود بینظیر کی زبانی سن لیجئے۔ 18 اکتوبر کے سانحے کے حوالے سے اپنا مشاہدہ بیان کر رہی تھیں۔ انہی کے الفاظ میں سنیئے میں نے ٹرک کے اوپر کھڑے ہوئے دیکھا کہ ایک شخص پارٹی کے پرچم میں لپٹے ہوئے بچے کو میری طرف بڑھا رہا ہے اور ہجوم میں وہ آگے نہیں نکل پا رہا تھا۔ میرے اندر کی مامتا جاگی اور میں

نے ہاتھ کے اشارے سے کارکنوں کو کہا کہ وہ اس بچے کو مجھ تک پہنچائیں۔ لیکن کارکن جوش وخروش کے عالم میں تھے۔ کسی نے اس بچے کی طرف توجہ نہیں دی اور مجھے افسوس رہا کہ میں بچے کو گود میں لے کر باپ کی خواہش پوری نہ کرسکی۔ جس بچے کو بینظیر گود میں لینے کے لئے بے تاب تھی وہ ایک بم تھا۔ جسے ایک بچے کے پتلے میں چھپا کر رکھا گیا تھا۔ تاکہ اسے بینظیر تک پہنچا کر اڑا دیا جائے۔ اس وقت بینظیر کو ممتا کے جذبے کا تقدس بچا گیا۔

ہارون الرشید

ناتمام

حادثہ

قوموں کو حادثے برباد نہیں کرتے۔ وہ اس وقت برباد ہوتی ہیں جب حادثوں سے سبق نہ سیکھا جائے۔ پورا ملک جل رہا ہے لیکن کوئی نیز و نہیں جو بانسری بجاتا ہو۔ جنرل مشرف ہیں۔ وہ دوسروں کی طرح غمزدہ ہیں اور انہوں نے تین روزہ قومی سوگ کا اعلان کیا۔

اوّلین سوال یہ ہے کہ المیہ کس طرح رونما ہوا اور اس کا ذمہ دار کون ہے۔ پہلی اطلاع یہ تھی کہ محترمہ کا انتقال ایک خودکش دھماکے میں ہوا، پھر خبر آئی کہ گردن میں گولی لگنے سے۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا کہ گردن اور سر میں گولیاں لگ جانے سے۔ جنرل ہسپتال کے ایک ذمہ دار ذریعے نے جو ہسپتال پہنچتے ہی معائنہ کرنے والوں میں شامل تھا۔ یہ کہا کہ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی مقبول لیڈر کا انتقال ہو چکا تھا۔ فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ نبض کی رفتار اور بلڈ پریشر صفر ہے۔ اس معالج کے مطابق محترمہ کا انتقال ماتھے پر لگنے والی گولی سے ہوا۔

قوم جاننا چاہے گی کہ حقیقت کیا ہے؟ ملک کے چاروں صوبوں میں جڑیں رکھنے والی دو قومی پارٹیوں میں سے ایک کی سربراہ کا المناک قتل کیسے ہوا؟ جسٹس افتخار چودھری اور ان کے ساتھی بروئے کار ہوتے تو امید کی جا سکتی تھی کہ وہ تفتیش کو باقاعدہ اور شفاف بنانے کی کوشش کرتے۔ اب انتظامیہ پر انحصار ہے۔ بدگمانی نہ کی جانی چاہئے لیکن کسی بھی معاشرے میں دراصل عدالت ہی ہوتی ہے۔ جس پر انصاف کیلئے انحصار کیا جاتا ہے کوئی بھی ملک آزاد پارلیمان اور آزاد پریس کے بغیر استحکام کا خواب نہیں دیکھ سکتا۔ یہی ادارے انتظامیہ کے نگران ہوتے اور اسے راہ راست پر رکھتے ہیں اور انہی کی پشت پناہی سے عدالتیں انصاف کی ضمانت دیتی ہیں۔ قومیں حادثات سے دوچار تو ہوتی ہیں۔ لیکن وہ ان سے سلامت گزر جاتی ہیں اور زخم بتدریج مندمل ہونے لگتے ہیں۔

ایک المیہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی اچانک رونما ہونے والی موت ہے۔ جس پر اہل خاندان

اور حامیوں کے دل فگار ہیں لیکن اتنا ہی المیہ یہ ہے کہ ملک بھر میں فسادات پھوٹ پڑے ہیں۔ ان گنت معصوم شہریوں کی گاڑیاں جلا دی گئیں۔ بہت سے سرکاری دفاتر نذر آتش کر دیئے گئے اور لاکھوں افراد کو اپنے گھروں تک پہنچنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اذیت اور خوف سے گزرے حالانکہ وہ قصوروار تھے اور نہ کسی کا ہدف۔ ملک کے متعدد شہروں اور قصبوں میں قاف لیگ کے دفاتر اور اس کے امیدواروں کی تصاویر کو آگ میں جھونکنے کا مطلب کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ پیپلز پارٹی کے کارکن حکومت سے ناراض ہیں اور اشتعال میں انہیں اپنے جذبات پر قابو نہیں۔ کل پشاور کے ارباب نیاز سٹیڈیم میں داخلے کی کوشش کرتے ایک 19 سالہ شخص رحم علی کو گرفتار کیا گیا جو بارودی بلیٹ باندھے ارباب نیاز سٹیڈیم میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگرچہ بعض اخبارات میں خبر چھپ گئی لیکن پولیس افسروں نے اسے خفیہ رکھنے کی کوشش کی۔ اب سوال اٹھنے لگا کہ آخر کیوں؟

جو جیمر محترمہ کیلئے حفاظتی گاڑیوں میں نصب کئے گئے وہ ناقص تھے۔ ان واقعات اور اندیشوں کے اس اظہار کے بعد کیا حفاظتی انتظامات زیادہ سے زیادہ سخت اور زیادہ مربوط نہ ہونے چاہئیں تھے۔ اس سے پہلے یہ خبر بھی آچکی تھی کہ کراچی میں جو انتظامات کئے گئے ان کو مربوط رکھنے کیلئے ایک مرکزی شخص کا تقرر نہ کیا گیا جو اس طرح کے معاملات میں ضروری ہوتا ہے۔ محترمہ خطرے کی بو سونگھ رہی تھیں اور دہائی دے رہی تھیں۔ حادثے کے فوراً بعد ان کے ایک ساتھی نے کہا کہ وہ سٹیج پر بھی اندیشے کا اظہار مسلسل کرتی رہیں۔ سامنے کا سوال یہ ہے کہ جب وہ جلسہ گاہ سے نکلیں تو قاعدے کے مطابق ان کے آگے اور پیچھے حفاظتی گاڑیاں کیوں نہ تھیں۔ قاتل کو یہ موقعہ کس طرح مل گیا کہ وہ بالکل سامنے کھڑا ہو کر، ماتھے کا نشانہ لے کر گولی چلائے۔ جلسہ گاہ سے باہر نکلتے ہی محترمہ کی گاڑی کو برق رفتاری سے روانہ ہو جانا چاہئے تھا، ایسا کیوں نہ ہوا؟ اس خطرناک فضا میں حکومت اپنی ذمہ داریوں کا ادراک کیوں نہ کر سکی؟ سیاست الگ لیکن وہ ایک اہم پارٹی کی لیڈر تھیں اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اگر انہیں حادثہ پیش آیا تو مضمرات کیا ہوں گے۔ یہ تجویز نہیں کیا جا

رہا کہ کسی طرح بھی جنرل پرویز مشرف کی حکومت یا قاف لیگ اس حادثے کی ذمہ دار ہے۔ جنرل نے کسی لیڈر کو قتل نہیں کرایا؟ اگرچہ بہت سوں کو انہوں نے اذیت بے حد دی۔ اسی طرح چودھری برادران کے بارے میں بھی ایسے کسی گمان کا بظاہر کوئی جواز نہیں لیکن اس ہولناک نااہلی کا کوئی تو ذمہ دار ہے۔ اور کیا اسے قصوروار نہ ٹھہرایا جائے گا؟ فطری طور پر بھٹو خاندان اور پارٹی کے لیڈران لوگوں کو شامل تفتیش کرنا چاہیں گے کراچی والے خودکش دھماکوں کے بعد محترمہ نے جن پر شبہ کا اظہار کیا تھا۔ خرابی در خرابی کشیدگی اور مزید کشیدگی، سیاسی مضمرات تباہ کن ہیں۔ اس اشتعال انگیز فضا میں الیکشن کا انعقاد آسان نہیں۔ نواز شریف پہلے ہی بائیکاٹ کا اعلان کر چکے ہوتے تو (ق) لیگ حرف غلط کی طرح مٹ جائے گی اور جیسا کہ ہماری قوم کا مزاج ہے ہمدردی کا ایک طوفان اٹھے گا، جس میں پیپلز پارٹی یقینی طور پر اکثریت حاصل کرے گی، ممکن ہے کہ دوتہائی اکثریت اور ظاہر ہے کہ حکمران اس کے متحمل نہیں۔ ملک عدم استحکام کے طوفان سے دوچار ہے تمام سیاسی قوتوں کو مل بیٹھنا ہو گا۔ اعتماد کے ماحول میں ایک قومی کانفرنس۔ تماشا نہیں، ایک حقیقی قومی کانفرنس، جس میں ماضی کو بھلا کر مستقبل کا لائحہ عمل طے کیا جائے۔ پیپلز پارٹی باقی رہے گی۔ اس کی قیادت نے ہوش مندی کا مظاہرہ کر کے متفقہ لیڈر چن لیا تو ممکن ہے کہ مزید طاقتور بن کر ابھرے لیکن وسیع تر مفاہمت کے لئے اسے اپنی ترجیحات کو ازسرنو مرتب کرنا ہوگا۔ انہی کو نہیں سبھی کو۔ طوفان اٹھتے ہیں تو رواداری اور اتحاد کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ بے شک یہ ایک بڑا المیہ ہے لیکن قوموں کو حادثے برباد نہیں کرتے۔ وہ تب برباد ہوتی ہیں، جب حادثوں سے سبق نہ سیکھا جائے۔ اب یہ آشکار ہے کہ ملک من مانی سے نہیں چل سکتا اور ایک قومی اتفاق رائے کی ضرورت ہے اگر کچھ لوگ اب بھی مصر ہوں تو قوم کو ان سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔

شہادت پر کہی گئی نظموں سے انتخاب

رخسانہ نور

وہ جی رہی ہے

خدائے برتر تجھے خبر ہے
کہ تیری دھرتی کے ناخداؤں نے
ایک روشن دیا جو ظلمت کی رہگزر پر دھرا ہوا تھا
بجھا دیا ہے
خدائے برتر تجھے خبر ہے
کہ روشنی کی جو لو بجھی ہے
اسی نے تیرہ و تار راتوں کو پاٹنے کی سبیل کی تھی
وہ روشنی تھی .... بصارتوں کی نوید چابک سے کھولتی تھی
گھٹن زدہ موسموں کی بن کے
وہ آخری سانس جی رہی تھی

خدائے برتر تجھے خبر ہے

تو جانتا ہے

وہ کتنی صدیوں سے جھیلتی تھی عذاب موسم

خزاں رتوں کے وہ ذائقوں کو بھی چکھ رہی تھی

شہادتوں پر یقین اس کا بہت تھا پختہ

یزیدیت کے خلاف اس نے علم اٹھایا

خدائے برتر تو جانتا ہے

تجھے خبر ہے

وہ ناسمجھ لوگ جو جسد خاکی کو دفن کر کے

یہ سوچتے ہیں

وہ اب نہیں ہے !!!

وہ بھولتے ہیں !!

وہ جسم کب تھی..........وہ جسم کب ہے

وہ سوچ ہے جو

ہزار صدیوں سے اک سفر پر رواں دواں ہے۔

ریاض الرحمٰن ساغر

عروس جمہور! تابوت کی ڈولی میں

جو کام ادھورے تھے کرنے کو چلی آئی
تو باپ کے وعدوں پہ مرنے کو چلی آئی
درکار تھا گلشن کو کیا صرف لہو تیرا
تو رنگِ وفا اس میں بھرنے کو چلی آئی
دکھ پہلے ہی کیا کم تھے 'بی بی' تیری جھولی میں
کیوں آج ہوئی رخصت تابوت کی ڈولی میں
تجھ کو تو غریبوں کا ہر روگ مٹانا تھا
قسمت میں مگر ان کی یہ سوگ منانا تھا
جمہور کو سلطانی اک بار تو دے جاتی

پھر باپ کے سایۂ شفقت میں جگہ پاتی
ڈھونڈیں گے کہاں بی بی ہم تجھ سی عظیم عورت
شائستہ، پڑھی لکھی، پُر عزم، فہیم، عورت
چھائی ہے فضاؤں پر ویرانی سی ویرانی
کیا نام دیں ہم اسکو یہ غم ہے کہ حیرانی
تاریخ سیاست میں کیا ہو گی نظیر ایسی ؟
کھینچی کس عورت نے جرأت کی لکیر ایسی ؟
چالیس دنوں میں کیا دکھ درد یہ کم ہو گا؟
جب تک ہمیں زخموں کا مرہم نہ بہم ہو گا
بی بی تیری قربانی اس قوم کو راس آئے
اس سے بڑا غم کوئی اب اور نہ پاس آئے
اے کاش سبق کوئی سب راہ نما سیکھیں
نفرت کو بھلا کر اب جمہوری ادا سیکھیں

شاہدہ حسن

یہ چراغ کس نے بجھا دیا......؟

سر شام کس نے ستم کیا کہ ایک دل کو رلا دیا
مری ارض پاک پہ یک بہ یک کوئی آسماں گرا دیا
کوئی فرد کب تھی وہ عہد تھی، اور اک عہد قتل ہوا یہاں
کوئی دشت ظلم شقی کا تھا کہ عجیب حشر اٹھا دیا
ابھی رات ہی کا اندھیرا ہے، ابھی صبح ہونے میں دیر ہے
میری ارض جاں تری خیر ہو، یہ چراغ کس نے بجھا دیا
وہ جو علم و فن کا جمال تھی جو نسائیت کا کمال تھی
کوئی شاہکار وجود تھی، جسے آج ہم نے گنوا دیا
یہ اجل کو کیسی تھیں عجلتیں کہ خزاں کے آنے سے قبل ہی

وہ جو خود پیام بہار تھی، اسے جام مرگ پلا دیا
یہ جو راستوں میں ہجوم ہے، یہ عقیدتوں کی جو دھوم ہے
یہ اسی ذات کا سحر ہے، تہہ خاک جس کو سلا دیا
کوئی روشنی کی لکیر تھی کہ اسی پہ اس نے سفر کیا
کسی روح سے کسی روح نے کہیں جا کے ملا دیا
یہ عقیدتوں کی جو راہ ہے، تو اسی میں عزم ثبات ہے
یہ موت اسی کا نصیب تھی اسے رب نے اجر وفا دیا
نہ رہے صفوں میں یہ ابتری، تو اسی کا اس نے بھرم رکھا
کبھی سرد شعلۂ غم کیا، کبھی نفرتوں کو بجھا دیا

صفدر سلیم سیال

بے نظیر کی نذر

خود کو اس کی ہیبت میں اتارا کیوں ہے
اتنے گھبرائے ہوئے ہو اسے مارا کیوں ہے
لوگ آپہنچے ہیں ظالم تری شہ رگ کے قریب
وہ تو خاموش تھے تو نے انہیں مارا کیوں ہے
اس گھرانے کو سدا سولیاں کرتی ہیں سلام
آزمائش سے اسے تو نے گزارا کیوں ہے
تلملاتے ہیں ابھی تک بھری دنیا کے رئیس
یہ وطن دنیا کے نقشے پہ ابھارا کیوں ہے

حاکم شہر بتا رنج ہے کیا اس کے خلاف !

یہی ایک جرم غریبوں کا سہارا کیوں ہے

سوچتا رہتا ہوں اکثر شب تنہائی میں

بھٹو ہی مری آنکھ کا تارا کیوں ہے

ہم تو شرمندہ ہیں اب تک مرے قائد اے سلیم

تری فرقت میں ہمیں جینا گوارا کیوں ہے

عمرانہ مشتاق

وہ ماں تھی' بہن اور بیٹی تھی

ہم کس کے گریبان کو کھینچیں
ہم کس سے کیا فریاد کریں
یہ ظالم ہاتھ کٹیں گے کب
جو روز نئی بیداد کریں
ہر گھر میں ماتم برپا ہے
ہر جانب سوگ کا عالم ہے
اے میرے وطن' اے پیارے وطن
یہ کیسا روگ کا عالم ہے
وہ ماں تھی بہن اور بیٹی تھی
ہر رشتے میں تابندہ تھی
وہ قوم پہ ہی قربان ہوئی

وہ قوم کے نام پہ زندہ تھی
للکار تھی ہر آمر کیلئے
آواز تھی وہ مجبوروں کی
خود رنج والم سے گزری تھی
ہم درد تھی وہ رنجوروں کی
اے کالے ہاتھو! تم کب تک
ہر سورج کو کجلاؤ گے
ہے خونِ شہیداں پائندہ
بے موت ہی تم مر جاؤ گے

محمود شام

ایسے بہنوں کو تو رخصت نہیں کرتے بھائی

ایسے بہنوں کو تو رخصت نہیں کرتے بھائی
ایسے بیٹی کو تو میکے سے نہیں بھیجتے بھائی
ایسے تاریخ تو قومیں نہیں لکھتیں اپنی
ایسے تہذیب کا چہرہ نہیں جھلسا جاتا
اس طرح قیمتی میراث لٹاتے ہیں کہاں
یوں تدبر کو کہاں زہر دیا جاتا ہے
ایسے جرأت پہ کہاں وار کیئے جاتے ہیں
ایسے اقدار پہ تلوار کہاں اٹھتی ہے
ایسے افکار پہ نیزے نہیں پھینکے جاتے

ایسے تقدیر پہ شمشیر کہاں چلتی ہے
یوں عقیدوں سے ہلاکت نہیں بانٹی جاتی
ایسے امید کو کب قتل کیا جاتا ہے
اپنے آئندہ سے یوں خوف کہاں ہوتا ہے
چھوڑیں بچوں کیلئے آگ لہو کا ورثہ
ایسے ماں باپ تو دنیا میں نہیں ہوتے ہیں
ایسے بہنوں کو تو رخصت نہیں کرتے بھائی

نورین طلعت عروبہ

سانحہ

وطن سے آتی ہواؤں میں آنسوؤں کی نمی
بتا رہی ہے کس سانحے کے بارے میں
خسارہ ہے یہ سیاست کے گوشوارے میں
وہ بے نظیر حقیقت میں بے مثال ہوئی
جو اپنے عزم کی طاقت سے باکمال ہوئی
سیاستوں کی وسیع بحر کی شناور تھی
وہ دھان پان سی عورت بڑی بہادر تھی
جنہیں کچھ اس کی سیاست سے اختلاف بھی تھا
انہیں اسی کی ذہانت کا اعتراف بھی تھا
چلی تھی شان سے مقتل کو مسکراتے ہوئے
وہ اپنے گھر کی روایات کو نبھاتے ہوئے

نیلما ناہید درانی

ہم ایسے لوگ ہیں

ہم ایسے لوگ ہیں
جو محسنوں کو مار دیتے ہیں
حسیں خوابوں
حسیں ذہنوں
حسیں جذبوں
کی قیمت ایک گولی ہے
ہم آنکھیں بند رکھتے ہیں
مگر خوابوں کو آنے کی
اجازت ہم نہیں دیتے
ہم اک بدرنگ دنیا کے مکیں ہیں
اگر کوئی یہاں آئے

اور اپنی ممتا کی گود میں
خوشیوں کے رنگ لائے
سنہری خواب کا تھیلا
اٹھا کر ہم کو یہ کہہ دے
ذرا جاگو......ادھر دیکھو
کہ دنیا کے گلابوں پر
خوشی کے سارے خوابوں پر
تمہارا بھی کوئی حق ہے
تو ہم ذہنوں میں جسموں میں
کئی بارود بھر کر اس سے ملتے ہیں
خوشی کے سارے رنگوں کو
لہو سے تول دیتے ہیں
ہم اس کے سارے خوابوں کو
سبھی ہنستے گلابوں کو
زمیں میں رول دیتے ہیں

جو کام ادھورے تھے کرنے کو چلی آئی ۔۔۔۔ تو باپ کے وعدوں پہ مرنے کو چلی آئی

ماضی کے ناقابل فراموش لمحات ۔۔۔۔۔ طالبہ بے نظیر بھٹو، برصغیر کے دو عظیم رہنماؤں اندرا گاندھی اور ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ۔

شہید محترمہ بے نظیر بھٹو اوران کی والدہ بیگم نصرت بھٹو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ زندگی کی مسافت میں بہت سے دکھوں کا مقابلہ اکٹھے کیا۔

وہ بھی کیا دن تھے۔۔۔ بے نظیر بھٹو آکسفورڈ یونیورسٹی کے ڈیبیٹنگ کلب کی صدر کے طور پر

جیتا جاگتا مشرق۔۔۔
بے نظیر بھٹو کی رسم حنا

رشتے آسمانوں پر جوڑے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ زمین صرف منظر پیش کرتی ہے۔۔۔۔
بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری دلہا، دلہن کے روپ میں

زندگی میں خوشیوں کے دن بہت تھوڑے تھے۔۔۔۔ بے نظیر بھٹو کی شادی کی یادگار تصویر۔۔۔۔
بی بی سہیلیوں کے ساتھ

جاگتی ممتا۔۔۔۔وطن سے دور لندن کے ہائیڈ پارک میں محترمہ بے نظیر بھٹو
اپنے پیارے بچوں کے ساتھ۔۔۔۔گپ شپ کا ایک انداز

یاد کرتے ہیں تجھے شام وسحر میں اکثر۔۔۔۔

شہادت سے 48 گھنٹے قبل ملتان ائیر پورٹ پر بے نظیر اپنی پیروکار بشریٰ نقوی ایڈووکیٹ کو ہدایت دیتے ہوئے۔

روایت پسند جوڑا۔۔۔۔۔
وطن سے دور بھی روایات
کا امین رہا' صدر زرداری
اور محترمہ شہید، امریکی صدر
اور انکی بیگم کے ساتھ

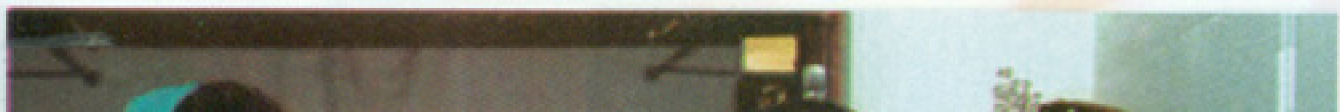

شہزادی اور ملکہ ایک ساتھ۔۔۔۔ محترمہ بے نظیر بھٹو، ملکہ برطانیہ سے مل رہی ہیں

اودیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یاران وطن ۔۔۔۔۔ جلاوطنی قریب کردیتی ہے ۔۔۔۔۔۔
لندن میں بیگم کلثوم نواز محترمہ بے نظیر بھٹو شہید میاں نواز شریف اور صدر آصف علی زرداری، وطن سے دور ۔۔۔
ایک دوسرے کے قریب تر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلیئے ۔۔۔
بے نظیر بھٹو تحریک آزادی فلسطین کے رہنما یاسر عرفات کے ساتھ

۔۔۔۔۔زندگی کا ایک انداز یہ بھی ہے

بی بی شہید جلاوطنی کے اختتام پر، وطن کی فضاؤں میں، قرآن کے سائے میں

اے میرے پیارے وطن۔۔۔۔۔
طویل ترین جلاوطنی کے بعد، وطن کی
فضاؤں میں پہلے لمحات، خوشی کے
آنسوؤں کے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔

لمحہ لمحہ مسافت، لمحہ لمحہ خوشی۔۔۔۔ ایئرپورٹ سے باہر کارکنوں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار

قائدعوام کی دختر۔۔۔۔
قائداعظم کے مزار پر

عوام کا جم غفیر۔۔۔۔۔۔ تاحد نظر انسانوں کے سر۔۔۔۔ٹرک پر بی بی کے ساتھ شاہ محمود قریشی، صفدر عباسی، یوسف رضا گیلانی، قائم علی شاہ، قاسم ضیاء، شیری رحمان اور نوید چوہدری

جمہوریت کی راہ میں ۔۔۔۔۔۔۔
خاردار تاروں کے سامنے ۔۔۔۔۔
محترمہ بے نظیر بھٹو خطاب فرما رہی ہیں
تصویر میں راجہ پرویز اشرف، ناہید خان
رخسانہ بنگش، رضا ربانی، سید خورشید شاہ
مہرین انور راجہ، شیری رحمان اور فرزانہ راجہ
نمایاں ہیں۔

اپنی قائد کے حکم پر۔۔۔۔احتجاج، احتجاج۔۔۔۔ فائزہ ملک، عظمیٰ بخاری
اور فرزانہ راجہ لاہور کی مال روڈ پر دیگر ساتھیوں کے ساتھ

بے نظیر بھٹو میر پور خاص عوامی جلسے کے دوران

قافلہ جمہوریت کے نمایاں چہرے رہنمائے جمہوریت کے ساتھ ساتھ

روبرو جب وہ آئینے کے ہوئے۔۔۔روشنی روشنی سے ٹکرائی

پخیر راغلے۔۔۔۔۔چاروں صوبوں کی زنجیر۔۔۔پخیر راغلے

تجھے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا

پریس کانفرنس سے پیشتر ----- سالگرہ کا کیک محترمہ بے نظیر بھٹو کاٹ رہی ہیں -----
فرزانہ راجہ، راجہ پرویز اشرف، شیری رحمان اور زمرد خان اپنی قائد کی مسکراہٹوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے۔

دختر مشرق پشاور میں گفتگو کے دوران عاصمہ ارباب عالمگیر پس منظر میں نظر آ رہی ہیں

آنکھوں میں روشنی لیے -------- ملک بھر کے غریبوں کی آس --------

اپنے دیس کی غریب بیبیوں کے ساتھ

تاریخ سیاست میں کیا ہوگی نظیر ایسی؟
نرگس فیض ملک اور مہرین انور راجہ، اپنی قائد بے نظیر بھٹو کے ہمراہ

وطن کی مٹی گواہ رہنا۔۔۔۔ دو رہنما قوم کے بارے میں گفت وشنید کرتے ہوئے

بی بی شہید اور میاں شہباز شریف

میرا بچپن، جوانی تیرے نام ہے۔۔۔

ڈاکٹر مہرین بھٹو اپنی شہید قائد سے حصول رہنمائی کے دوران

آخری لمحات۔۔۔۔ جنہیں کیمرے کی آنکھ نے نظر بند کر دیا

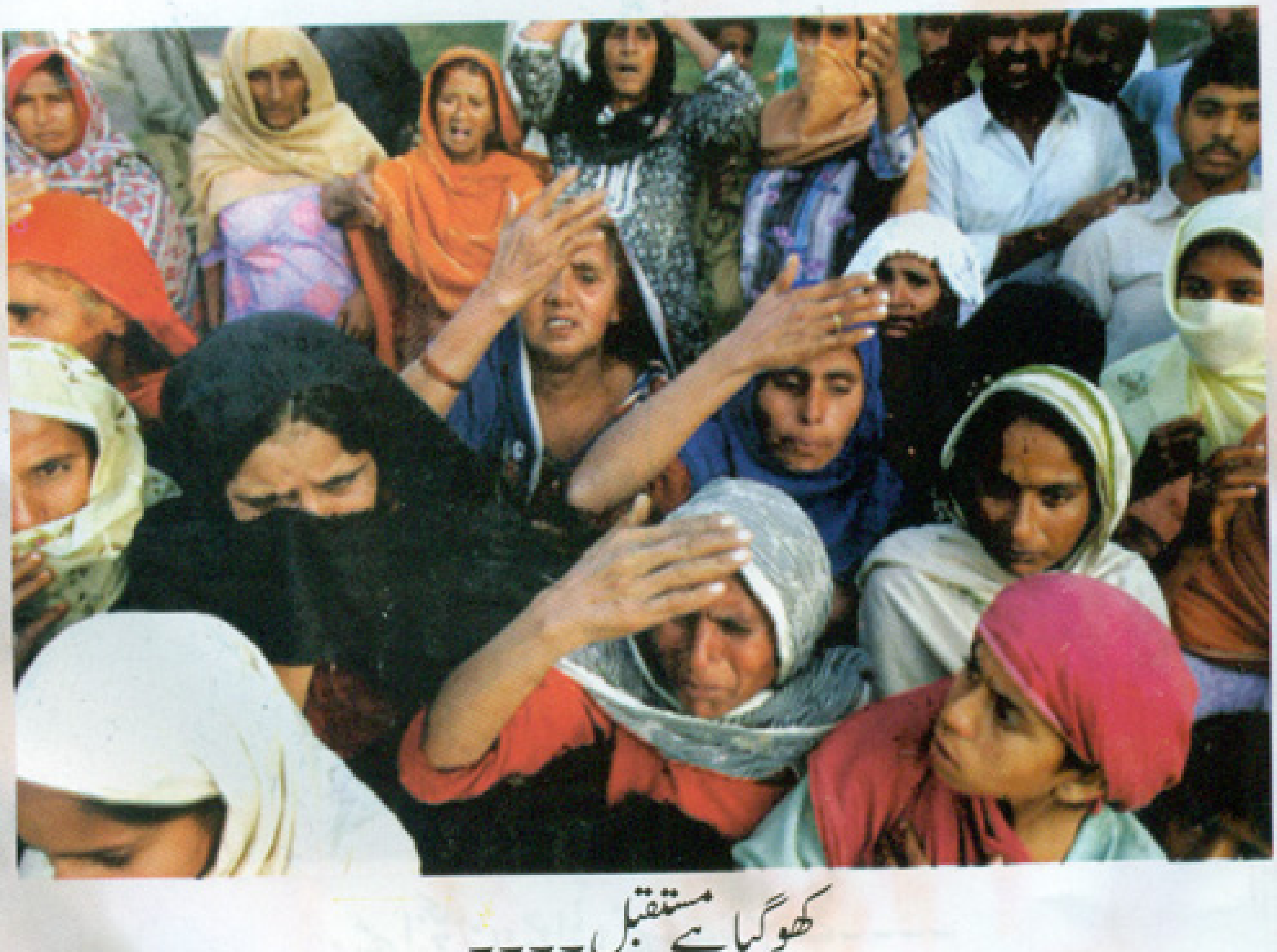

کھو گیا ہے مستقبل۔۔۔۔
بی بی کی شہادت پر وطن کی غریب عورتیں نوحہ کناں ہیں

ہائے تیرے چاہنے والے۔۔۔۔

سفرِ آخرت کا ایک منظر، دُکھ کی گھڑیوں میں انسانوں کا سمندر

تیرے حضور تیرے غمگسار بیٹھے ہیں۔۔۔۔بختاور، آصفہ، بلاول بھٹو زرداری،
صنم بھٹو، شیری رحمٰن اور ڈاکٹر فہمیدہ مرزا۔۔۔بی بی شہید کی قبر پر، سوگوار فضا میں، دستِ دعا بلند کیے ہوئے۔

تجھ کو گلاب جیسا کفن کون دے گیا؟ ۔۔۔۔۔ بی بی شہید کی قبر پر آصف علی زرداری اور بلاول بھٹو زرداری کی گلابوں سمیت حاضری

ہم تیرے ماننے والے، ہم تیرے ساتھ سدا ۔۔۔۔ سید یوسف رضا گیلانی بی بی شہید کی لحد پر پھول بکھیر رہے ہیں ساتھ سید قائم علی شاہ، اسلام دین شیخ، ڈاکٹر بابر اعوان اور دیگر

خوشی کے لمحات کی بولتی ہوئی ایک تصویر، صاحب کتاب مظہر برلاس دختر مشرق کے ساتھ

دو روایت پسند آدمی ------ دونوں محبتوں کے سفیر

تحریک بحالی جمہوریت کے ایام۔۔۔۔۔یوسف رضا گیلانی پیرول پر رہائی کے بعد اسلام آباد کلب میں
مظہر برلاس، سید ظفر علی شاہ، اقبال ظفر جھگڑا اور راجہ پرویز اشرف کے ساتھ

محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کا آخری
مگر یادگار دورہ پارلیمنٹ ہاؤس
استقبال سے قبل ڈاکٹر عذرا افضل پیچوہو
مظہر برلاس اور ڈاکٹر فہمیدہ مرزا
محترمہ بے نظیر بھٹو کی آمد کے انتظار میں
بعد میں ڈاکٹر فہمیدہ مرزا قومی اسمبلی
کی سپیکر بنیں۔

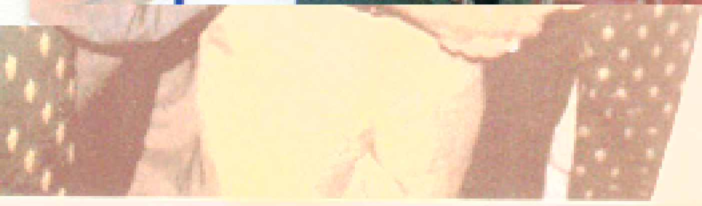

صاحبِ کتاب مظہر برلاس فرحان حسن قریشی کو صدر آصف علی زرداری
سے متعارف کرواتے ہوئے

میرا وسدا رہے لاہور ----

یاسمین رحمان، مظہر برلاس اور ساجدہ میر ایک تقریب میں، ایک ساتھ

ڈھونڈیں گے کہاں بی بی ہم تم سی عظیم عورت ---- بے نظیر بھٹو ایوارڈ کے موقع پر نرگس فیض ملک
بیلم حسنین اور فوزیہ حبیب -- خراج عقیدت کا ایک انداز

بی بی کے مشن کا سفر۔۔۔ پہلے قدم پر کاغذاتِ نامزدگی جمع کرواتے ہوئے ڈاکٹر عذرا فضل پیچوہو، امتیاز صفدر وڑائچ، سید خورشید شاہ، ڈاکٹر فہمیدہ مرزا، راجہ پرویز اشرف اور فرزانہ راجہ مسلم لیگی ایم این اے سردار ایاز بھی نمایاں نظر آرہے ہیں۔

خوشیوں کی مسافت میں ایک ساتھ ہیں سب سارے۔۔۔۔ پروگریسو ویمن کی طرف سے محترمہ بے نظیر بھٹو کی سالگرہ کے کیک کاٹنے کی تقریب میں نرگس فیض ملک، صائمہ کھر، رخسانہ بنگش اور دیگر خواتین

سرگوشی اور تبادلہ خیال میں تھوڑا سا فرق۔۔۔۔۔ نیویارک کے روز ویلٹ ہوٹل میں شیری رحمان اور مظہر برلاس خوشگوار موڈ میں تبادلہ خیال کر رہے ہیں۔

بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کی چیئرپرسن وفاقی وزیر فرزانہ راجہ پی ٹی وی آمد کے موقع پر مصنف کے ساتھ

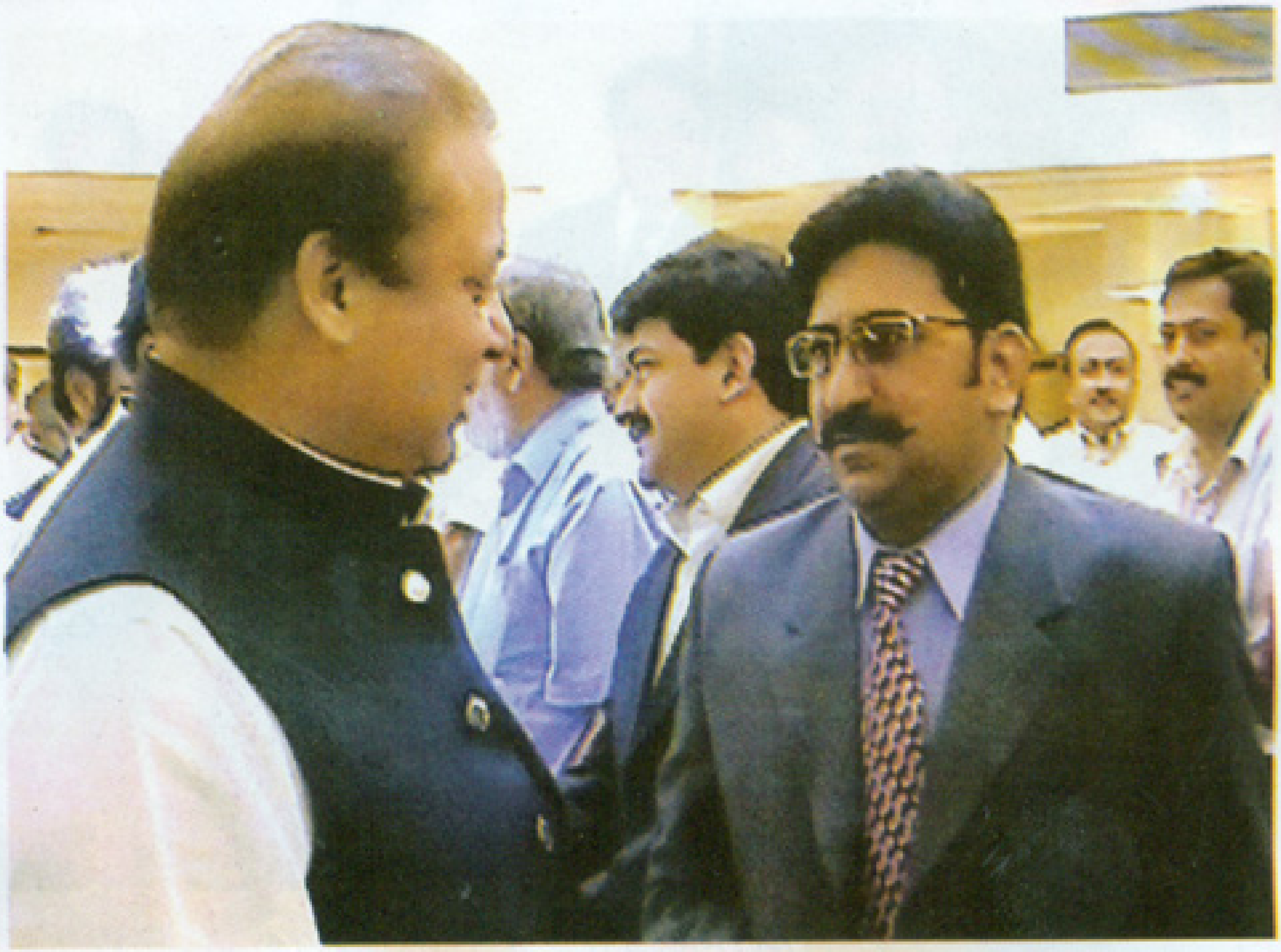

راہ جمہوریت پر ہم ایک ساتھ تھے' آمریت کے خلاف ایک ساتھ ۔۔۔۔
مظہر برلاس اور میاں نواز شریف پنجاب ہاؤس میں ایک ساتھ

پیرول پر رہائی اور انٹرویو کا یہ انداز ۔۔۔۔ یوسف رضا گیلانی اور مظہر برلاس ۔۔۔۔
ایک سیاستدان دوسرا صحافی مگر دونوں دوست

سالوں کی مسافت میں ایک مشن جمہوری ہے۔۔۔۔۔

ایک تقریب میں پلوشہ بہرام، چوہدری یاسین، جہانگیر بدر، ملک حاکمین خان اور صاحب کتاب

ایسے تقدیر پہ شمشیر کہاں چلتی ہے؟ دو پرانے دوست ایک تقریب میں مگراب فوزیہ وہاب پیپلز پارٹی کی مرکزی سیکرٹری اطلاعات بن چکی ہیں۔

لاہور میں شہید بی بی کی پہلی برسی پر خصوصی تقریب سے شبینہ ریاض شیخ خطاب کر رہی ہیں

بے نظیر بھٹو شہید کی برسی پر ہونے والی تقریب میں چوہدری غلام عباس، راجہ ریاض اور نرگس اعوان

ایک مشن، ایک جذبہ، سفر جمہوریت کے مسافر۔۔۔
بے نظیر بھٹو پیروکار جہانگیر بدر، نرگس اعوان اور شبینہ ریاض شیخ ایک تقریب میں

سانجھی اپنی خوشیاں اور غم ایک ہیں ہم ایک ہیں شہباز بھٹی اور صاحب کتاب ایک تقریب میں

چاروں صوبوں کی زنجیر۔۔۔۔۔۔۔ بے نظیر بھٹو کے عوامی انداز کی ایک تصویر

بے نظیر بھٹو شہید کی یادگار تصویر